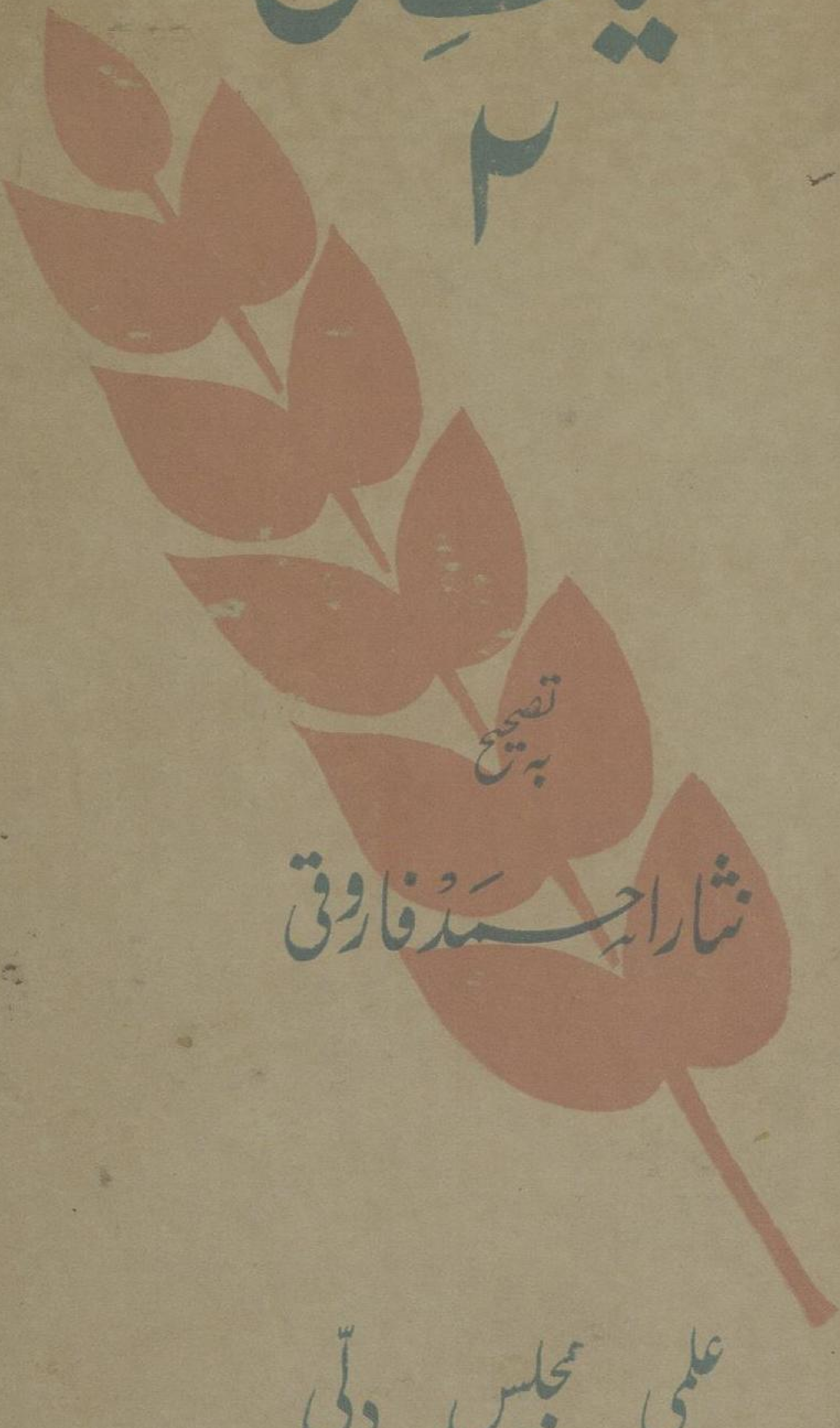
کلیاتِ مصحفی

۲



بہ تصحیح

نثار احمد فاروقی

علمی مجلسِ دلّی

کلیاتِ مصحفی

جلد دوم

علمی مجلس۔ دلّی

سلسلۂ مطبوعات : ۴

کلیاتِ مصحفی

جلد دوم

مشتمل بر

دیوانِ دوم

غلام ہمدانی مصحفی امروہوی [متوفی ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۵ء]

بہ تصحیح

نثار احمد فاروقی
استاد شعبۂ عربی، دلی کالج، دلی ۶

علمی
مجلس
دلی

مصنّف

نام : غلام ہمدانی مصحفی ابن ولی محمد ابن درویش محمد

وطن : امروہہ (ضلع مرادآباد) اترپردیش

ولادت : تقریباً سنہ ۱۱۶۱ھ مطابق سنہ ۱۷۴۳ء (موضع اکبرپور، پرگنہ امروہہ)

وفات : سنہ ۱۲۴۰ھ مطابق سنہ ۱۸۲۵ء (لکھنؤ)

تصنیف :

کلّیاتِ مصحفی (جلد دوم)

ترتیب و تصحیح : نثار احمد فاروقی

سال اشاعت : ۱۹۶۷ء

تعداد : پانچ سو

مطبع : کوہِ نور پرنٹنگ پریس دلّی

کاتب نثر : خلیق ٹونکی

کاتب نظم : دیوان چند مونگا

ناشر : ظلّ عباس عباسی

قیمت :

چھ روپے پچھتّر پیسے

غیر مجلّد چھ روپے

پیش لفظ

غلام ہمدانی مصحفی ہمارے ان بدقسمت اساتذہ میں سے ہیں، جن کا پورا کلام آج تک شائع نہیں ہوا، حال آنکہ ان کا اپنے زمانے میں ڈنکا بجتا تھا؛ ان کے سینکڑوں شاگرد تھے؛ انھوں نے علم و ادب کی بیش قیمت اور پایدار خدمات انجام دیں۔ اس وقت بھی ان کے نو دیوان ملتے ہیں، جن میں کم و بیش ۳۵ ہزار اشعار ہونگے۔ زمانے کی غلط بخشی اور ہماری حق ناشناسی کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی کہ ہم آج تک اتنے بڑے شاعر اور خادمِ ادب کو اس کا جائز مقام پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

علمی مجلس کے منصوبے میں پرانے متون کی اشاعت بھی شامل ہے۔ اس سے پہلے ہم حیدری کا تذکرہ گلشنِ ہند شائع کر چکے ہیں۔ یہ کتاب آج تک منظرِ عام پر نہیں آئی تھی اور دنیا بھر میں اس کے صرف دو خطی نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ اس کے بعد ہم کلیاتِ میر کی پہلی جلد بھی پیش کر چکے ہیں جس میں اس کے چھئوں دیوانوں کی غزلیں دی گئی ہیں؛ دوسری جلد بقیہ اصنافِ کلام پر مشتمل زیرِ ترتیب ہے۔

اب ہم مصحفی کا دوسرا دیوان پیش کر رہے ہیں۔ اسے جناب نثار احمد فاروقی نے مرتب کیا ہے۔ انھوں نے برسوں کی محنت کے بعد مختلف کتابخانوں کے خطی نسخوں کے مقابلے سے مصحفی کے جملہ کلام نظم و نثر کا صحیح نسخہ تیار کیا ہے۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے یہ تمام ذخیرہ بغرضِ اشاعت علمی مجلس کی نذر کر دیا۔ حتی المقدور ہم بتدریج یہ سب جلدیں یکے بعد دیگرے شائع کرینگے۔ اس سلسلے کا آغاز دیوانِ ثانی سے ہو رہا ہے۔ دیوانِ اوّل جس کے ساتھ مصحفی کی مفصل سوانح عمری اور اس کے کلام کا تفصیلی جائزہ ہوگا، بعد کو شائع کیا جائیگا۔ آخری جلد میں مفصل حواشی، فرہنگ اور اشاریہ شامل ہوگا

جب تک کسی زبان کے بنیادی متون شائع نہ ہو جائیں، اس کی تاریخ ادب مرتب نہیں کی جا سکتی۔ اگر آپ متون کے بغیر تاریخ لکھنا چاہتے ہیں، تو مشہور انگریزی ضرب المثل کے الفاظ میں گھوڑے کو گاڑی کے آگے جوتنے کی بجائے گاڑی کو گھوڑے سے آگے چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شکر کا مقام ہے کہ پچھلے ۲۰ - ۲۵ برس میں اردو کے کئی اہم متن شائع ہوئے ہیں اور ان سے زبان کی بعض گمشدہ کڑیاں منظرِ عام پر آ گئی ہیں۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے؛ امید کی جا سکتی ہے کہ رفتہ رفتہ ان گنجہائے گرانمایہ سے زبان کا دامن مالا مال ہو گا اور ہم دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے سامنے سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو جائینگے۔

اس سلسلے میں دو باتیں قابلِ ذکر ہیں۔ اگر ہمارے محققین انھیں مدِنظر رکھینگے، تو اس سے کام کے جلدی پایۂ تکمیل تک پہنچ جانے کا امکان ہے، اور بہتر طریقے پر بھی۔

اول یہ کہ کسی متن کو ترتیب کے لیے ہاتھ میں لینے سے پہلے اس کی اہمیت کا اندازہ کرنا چاہیے۔ ہر زبان میں اچھے برے دونوں طرح کے مصنف ہوتے ہیں؛ اردو بھی اس سے مستثنٰی نہیں۔ لیکن جب ہم زبان کی تاریخ لکھینگے، تو لامحالہ صرف اچھے ادیبوں اور ان کی نگارشات ہی سے اعتنا کرینگے؛ مثالیں بھی انھیں کے کلام سے مہیا کی جائینگی۔ ہم درجہ دوم کے لکھنے والوں کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے، ان کا کلامِ نظم و نثر بھی ضرور چھپنا چاہیے، کیونکہ وہ بھی ہمارے ادب کا حصّہ ہے۔ لیکن جو صورتِ حال اس وقت ہے کہ اردو کے بیشمار اہم اور مشہور اور صفِ اول کے مصنفین کا کلام ہنوز حلیۂ طبع سے آراستہ نہیں ہوا، ہمارا اس مرحلے پر دوسرے درجے کے مصنفین پر اپنا وقت ضائع کرنا بہت کوتاہ اندیشی ہو گی۔ پس یہ کام فی الحال ملتوی کر دیا جائے؛ سب سے پہلے ضروری متون شائع کیے جائیں۔

دوسری بات اس سے اہم تر ہے۔ متون کی ترتیب بجائے خود علم کی ایک شاخ بن گئی ہے۔ اس کے مقررہ اصول و قوانین ہیں۔ اگر ان کی پیروی نہ کی گئی، تو نتیجہ یہ ہو گا کہ جو متن شائع ہو گا، وہ اپنا مقصد پورا نہیں کر سکیگا؛ اور مرتب اور ناشر کی محنت رائیگاں جائیگی۔ پس ضروری ہے کہ حتی الوسع متن کے تمام خطی نسخے اور ماخذ جمع کیے جائیں؛ ان کے اختلافات کی نشاندہی کی جائے؛ اس کی لسانی، ادبی اور تاریخی اہمیت کا پورا جائزہ لیا جائے۔ جس حد تک بھی ان تمام باتوں پر توجہ نہیں کی جاتی، اسی درجے میں وہ متن ناقص ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کام ہر ایک کے بس کا نہیں۔ لیکن ادھر ہو یہ رہا ہے کہ ہر کہ و مہ مختلف کتابیں شائع

کر رہا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ لوگ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں، بلکہ جو لوگ واقعی اس کام کے اہل ہیں، ان کے رستے میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ ہم میں سے ہر ایک اسی کام کا بیڑا اٹھائے، جسے وہ بحسن و خوبی سر انجام کرنے کے لائق ہے۔

مصحفی کے ان دواوین کی ترتیب میں ان ضروری باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمام خطی نسخے جمع نہیں ہو سکے؛ لیکن تمام اہم اور بنیادی نسخے جمع کر کے متن متعین کیا گیا ہے۔ جن نسخوں تک رسائی نہیں ہو سکی، یہ اطمینان کر لیا گیا ہے، کہ اس سے متن کی تصحیح و تعیین پر کوئی اثر نہیں پڑا۔
ہمیں یقین ہے کہ اہلِ نظر اسے پسند کریں گے۔

مالک رام

نئی دلی
۲۰ ر اکتوبر ۱۹۶۷

حرفِ اوّل

دیوانِ دوم کے متن کی تیاری میں چار قلمی نسخوں سے مدد لی گئی ہے۔

متن کی بنیاد جس قلمی نسخے پر ہے وہ مرتب کے ذخیرۂ ذاتی میں ہے، یہ سب سے پہلے مرزا محمود بیگ شور لکھنوی کے کتب خانے میں رہا ہے، اُن کی مہر ۱۲۶۹ھ کی اس پر ثبت ہے پھر یہ نسخہ حضرت اثر لکھنوی مرحوم کے ذخیرے میں رہا اور اُن کی نوازش سے مرتّب کو پہنچا۔

اس نسخے کا، اور دیوانِ دوم کے مخطوطۂ رام پور کا نسخہ منقول عنہ باعتبار قرائن ایک ہی ہے۔ اس لیے ہم نے اسے متن کی بنیاد بنایا ہے۔ اور اسے حواشی میں نسخہ الف قرار دیا گیا ہے۔

اس کا مقابلہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن کے نسخۂ قلمی سے اور رضا لائبریری (رام پور) کے دو مخطوطات سے کیا گیا ہے۔

حواشی میں ن ا سے رام پور کا نسخہ مکتوبہ ۱۲۴۳ھ مراد ہے۔ دوسرے نسخے کو ن ۲ لکھا گیا ہے۔

ان سب قلمی نسخوں کا املا وہی ہے جو انیسویں صدی میں رائج تھا، مگر ہم نے موجودہ معیاری املا اختیار کیا ہے۔ بعض اشعار کی تصحیح قیاسی بھی کی گئی ہے۔

○

خدا کا شکر ہے کہ کلّیاتِ مصحفی کا حصّہ دوم منظرِ عام پر آرہا ہے یہ پورا منصوبہ بارہ جلدوں میں مکمل ہوگا۔ مصحفی کی زندگی یا شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھنا تھا وہ کلّیاتِ مصحفی جلد اوّل کے آغاز میں لکھا گیا ہے۔

اس کلیات کی اشاعت کا سہرا برادرِ محترم جناب ظلّ عباس عباسی کے سر ہے، اس میں جو کوئی خوبی ہو اس کا کریڈٹ واقعی انھیں کو ملنا چاہیئے اور خامیوں کے لئے مجھے ذمّہ دار سمجھا جائے۔

محبِ مکرم ڈاکٹر عابد رضا بیدار (انڈین اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز۔ نئی دلّی) نے بعض اشعار کا مقابلہ رام پور کے نسخوں سے کرنے میں ہماری مدد کی، وہ دلی شکریے کے مستحق ہیں۔

مخدومی مالک رام صاحب نے اس دیوان کا پیش لفظ لکھ کر کتاب کی وقعت میں اضافہ کیا ہے۔ میں اُن کا بھی ممنون ہوں۔

نثار احمد فاروقی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الف

ا

خورشید کو سائے میں زلفوں کے چھپا رکھا	چتون کی دکھا خوبی، سرمے کو لگا رکھا
سویا تو لپیٹ کر میں، اس ساتھ، وے اس نے	پہلو سے مرے پہلو تا صبح جدا رکھا
معمار نے قدرت کے، طاق خم ابرو کو	موقع سے بنایا تو، ٹک لیک جھکا رکھا
کس منہ سے اجل کو اب منہ اپنا دکھا دیں گے	ہم ہیں تری الفت نے، کہہ تو ہی، کہ کیا رکھا
قاصد جو گیا میرا لے نامہ تو ظالم نے	نامے کے کیے پرزے، قاصد کو بٹھا رکھا
بے یار و دیار اپنے جیتا تو رہا میں پر	رکنے نے مرے جی کے دم میرا خفا[لہ] رکھا
کس لب کے تبسم نے چھڑکا تھا نمک ان پر	زخموں کے الم نے شب تا صبح مزا رکھا
کیا جانیے کب کا تھا میرا یہ فلک دشمن	جو اس مہ تاباں کو نت مجھ سے جدا رکھا
میں اپنے ہنر کا بھی بندہ ہوں کہ کل میں نے	پہلو میں دل اپنے کو پیکاں سے بچا رکھا
دیکھ اس کی ادا یارو بس مر ہی گیا میں تو	جوں ہاتھ کو قاتل نے قبضے پہ ذرا رکھا

اے مصحفیؔ میں کس کی رفتار کا کشتہ تھا
ہر شعر میں جو میں نے انداز نیا رکھا

لہ نسخہ الف: چُرا

۲

پیغام وسلام اس نے ذرا بھی نہیں لکھا   نامے میں تو اک حرف دعا بھی نہیں لکھا
تقدیر میں اپنی، غم خوباں ہی ہیں مرنا   لکھا ہے جو حق نے تو بُرا بھی نہیں لکھا
تا پاوے نہ مطلب کو کوئی نامے میں میرے   گر شکر نہیں ہے تو گلا بھی نہیں لکھا
بدنامی کے ڈر سے سر مکتوب پر اس نے   نام اپنا تو کیا، نام مرا بھی نہیں لکھا
اس شوخ نے دشمن کو مرے قتل کا ایما   بے جا نہیں لکھا تو بجا بھی نہیں لکھا
اے مصحفی قاصد کو کہاں بھیجوں کہ خط میں
گھر اپنے کا اُس نے تو پتا بھی نہیں لکھا

۳

ترا خدنگِ نگہ جس کے دل سے پار ہوا   نشانِ تیر تغافل وہ دل فگار ہوا
فلک نہ دیکھ سکا، دیکھوں اپنے یار کو میں   کہ دیکھنا بھی مرا اس کو ناگوار ہوا
زمانہ سازی نہ کی ہم نے یوں ہیں[1]، خاطر خواہ   کبھی کے ساتھ ہمارا نہ روزگار ہوا
جہاں کہ بیٹھ کے زلفوں کو تو نے شانہ کیا   سب اس زمین کا تختہ بنفشہ زار ہوا
دریغ غمزۂ کافر نے کج ادائی کی   نگاہوں میں جو کبھی وصل کا قرار ہوا
تمام عمر ہمیں گذری آشنائی میں   پر آشنا نہ کوئی اب تلک دوچار ہوا
غبار اس کا نہ بیٹھا کسی کے دامن پر   مری طرح جو کوئی خاک کوے یار ہوا
قفس سے چھوڑ دے تو اب تو ہم کو اے صیاد   چمن میں کہتے ہیں پھر موسمِ بہار ہوا
صبا جو پوچھے خبر مصحفی کی تجھ سے وہ شوخ
تو کہیو ہنس کے "میں صدقے، ترے نثار ہوا"

۴

لطف کیا جب لب سر راہ عیاں ہو جانا   دیکھ کر دور سے عاشق کو، رواں ہو جانا
تو ملے یا نہ ملے، اس سے تو کچھ کام نہیں   ہم کو کوچے میں ترے روز میاں ہو جانا

---

[1] آصفیہ: زمانہ سازی سے کی ہم نے یوں ہیں الخ

میں دل آزردہ پھر اک نالہ کیا چاہوں ہوں / ٹک پرے مجھ سے تم اے ہم نفساں ہو جانا
کیا بُری خو ہے تمھاری کہ مہِ عید کی طرح / منھ دکھانا بھی تو پھر وو ہیں نہاں ہو جانا
اس میں جو ہووے سو ہو، ہم کو رہِ عشق کے بیچ / جستجو میں تری بے نام و نشاں ہو جانا
سی رکھے کیا کوئی منھ اپنا؟ عجب مشکل ہے / بات کہنے میں وو ہیں دشمن جاں ہو جانا
ہے تماشا کدۂ خلق مری خاکِ مزار / جی میں آوے تو کبھی آپ بھی یاں ہو جانا
دل کی اپنے بھی عجب خو ہے کہ بیٹھے بیٹھے / خود بخود ناوک مژگاں کا نشاں ہو جانا
کوچۂ عشق میں پرسش نہیں کچھ اے یارو / سہل سی بات ہے یاں جی کا زیاں ہو جانا
طُرفہ عالم ہے ہمارا بھی کہ با ایں ہمہ ضبط / دیکھتے ہی تجھے سرگرم فغاں ہو جانا

مصحفی تیری[1] یہ کیا خو ہے کہ روے خوش کو
دیکھنا اور وو ہیں[2] اودھر نگراں ہو جانا

۵

مرض عشق سے گر اب کی سنبھل جاؤں گا / تو میں دو چار برس کو کہیں ٹل جاؤں گا
مجھ کو قاصد کے تغافل نے تو مارا ہے ہے / روز ظالم یہی کہتا ہے کہ کل جاؤں گا
تو کھلے بالوں مرے سامنے آیا مت کر / ورنہ سر پیٹ ابھی گھر سے نکل جاؤں گا
دل فریبی کا ہے اس چشم کو دعوی لیکن / غمزہ کہتا ہے کہ میں اس کو بھی چھل جاؤں گا
روغن نفت کی حاجت مجھے کیا ہے اے عشق / میں تو پروانہ ہوں، پل مارتے جل جاؤں گا
پاس سے اس کے، نہ کہہ مجھ کو تو ہر دم "جا جا / تجھ کو کیا کام مرے جانے سے" چل جاؤں گا
گو کہ خورشید قیامت میں بٹھاویں مجھ کو / کیا بنا موم کا ہوں میں جو پگھل جاؤں گا
اس کے کوچے میں پکارے گا اگر مجھ کو رقیب / میں بھی عیار ہوں، آواز بدل جاؤں گا
لے چلا ہے مجھے، یہ کہہ کے، دل اس کی کو میں / تو اٹھانے مجھے لگیو، میں مچل جاؤں گا
رُل گئے خاک میں لاکھوں تو اچنبھا کیا ہے' / میں بھی اک روز اسی خاک میں رل جاؤں گا
لے چلو باغ میں مجھ کو بھی،[3] بیادِ رخِ دوست / ہوں دل آزردہ، وہاں گل سے بہل جاؤں گا

مصحفی جو مرے منکر ہیں، بقول سودا
"ان کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤں گا"

---

[1] آصفیہ : یہ تیری   [2] نسخہ الف : اور وو ہیں پھر   [3] آصفیہ : مجھ کو کہ بیادِ رخ دوست

٦

بچا گر ناز سے تو اُس کو پھر انداز سے مارا — کوئی انداز سے مارا، تو کوئی ناز سے مارا
کسی کو گرمیٔ تقریر سے اپنی لگا رکھا — کسی کو منھ چھپا کر نرمیٔ آواز سے مارا
ہمارا مرغِ دل چھوڑا نہ آخر اس شکاری نے — کبھی شاہین پھینکے اس پہ، گاہے باز سے مارا
غزل پڑھتے ہی میری، یہ مغنی کی ہوئی حالت — کہ اس نے ساز مارا سر سے اور سر ساز سے مارا
نکالی رسم تیغ و طشت دتی میں، جزاک اللہ — کہ مارا تو ہمیں تو نے، پر اک اعزاز سے مارا
نہ اڑتا مرغِ دل تو چنگلِ شاہیں میں کیوں پھنستا — گیا یہ خستہ اپنی خوبیٔ پرواز سے مارا
جہاں تک سازواری ہے لکھی دشمن کے طالع میں — ہمیں بدنام کر کے طالعِ ناساز سے مارا

ہزاروں رنگ اس کے خون نے یاروں کو دکھلائے
جب اس نے مصحفی کو اپنی تیغِ ناز سے مارا

٧

صانع نے جو خم ابروے دلدار میں رکھا — سالح نے بھلا کون سی تلوار میں رکھا
وہ رنگ نزاکت نہ دیا عارضِ گل کو — جو رنگ نزاکت ترے رخسار میں رکھا
پروا نہ اٹھایا کبھی رخسار سے اس نے — تا زیست مجھے حسرتِ دیدار میں رکھا
خورشید خجل ہو گیا دیکھ اس کی پھبن کو — طرہ کو جب اس شوخ نے دستار میں رکھا
خوں روؤں کہاں سے میں، کہ اس رونے نے یارو — کیا خاک مرے دیدۂ خوں بار میں رکھا
صیّاد یہ شکوہ ہے کہ بلبل کے قفس کو — لے جا کے کبھی تو نے نہ گلزار میں رکھا
قاصد نے دیا نامہ مرا اس کو تو اس نے — کر چاک وہیں رخنۂ دیوار میں رکھا
دکّان پہ یوسف کی نہ کوئی نظر آیا — جب اس نے قدم مصر کے بازار میں رکھا

اے مصحفی میں وہ ہوں الم دوست کہ جس نے
برسوں دمِ خنجر دلِ افگار میں رکھا

٨

جس دم کہ وہ کمر میں رکھ کر کٹار نکلا — جس رہ گزر سے نکلا، عالم کو مار نکلا

خاک سیہ میں ہم نے اپنے تئیں ملایا — تو بھی نہ تیرے دل کا ظالم غبار نکلا
آئی زباں جو اپنی جنبش میں نزع کے دم — تیرا ہی نام منھ سے بے اختیار نکلا
باریک ہو گیا ہوں عشق کمر میں لیکن — اس رنج کا کسی سے ہرگز نہ تار نکلا
اس خانگی سے ازبس اک مجھ کو رفتگی تھی[1] — جب میں اودھر سے نکلا، کھانس و پکار نکلا
ہاتھ اپنے دل پہ میں نے مارا جو وقت شیون — سینے کی بغل سے بھی سوزاں شرار نکلا
کم بخت دل نے ہرگز میرا[2] کہا نہ مانا — آخر گلی سے اُس کی ہو بے قرار نکلا
فرقت میں رات اس کی، میں زار زار رویا — یاں تک کہ خوب میرے دل کا بخار نکلا
میں ضبط تو کیا تھا اپنے تئیں بہت سا — آنکھوں سے خون دل کا پر جوش مار نکلا
مژگاں کی اس کی سوئیاں مڑ مڑ گئیں ولیکن — تو بھی ہمارے دل کا ان سے نہ خار نکلا

تہمت ہے مصحفی پر، سیرِ چمن کی یارو
کب گھر سے اپنے باہر وہ سوگوار نکلا

۹

ہوا شعلہ جو میری آہ آتش ناک سے پیدا — تو ہو ویں گے شرارے خرمن افلاک سے پیدا
نہیں پیوند پایا بسکہ زخموں نے مرے اب تک — ہوا ہوتی ہے اکثر سینۂ صد چاک سے پیدا
کیا ہے خوں جنھوں کا اس کی دستار گلابی نے — گلابی لالہ ہوتا ہے انھوں کی خاک سے پیدا
گریباں کیوں نہ پھاڑیں میرزایانِ چمن اپنا — کہ وضع میرزائی ہے تری پوشاک سے پیدا
نہیں معلوم کس کے سر کو تو نے اس سے باندھا ہے — ہزاروں داغ خوں ہیں دامنِ فتراک سے پیدا
قدم رکھتا ہوں میں گر موسم گل اس کے سائے میں — جنوں ہوتا ہے مجھ کو او دست تاک سے پیدا
پہنچ سکتا ہے کب سرو رواں اس کی روانی کو — کہ ہے اور ہی روش اس قامت چالاک سے پیدا
گرا ہو جس زمیں پر خوں تری پلکوں کے زخمی کا — عجب کیا لالہ ہووے اس خس و خاشاک سے پیدا

نہیں اے مصحفی تہمت زدہ میں فسق کا[3] ہرگز
صفائی دل کی ہے میرے اِس عشقِ پاک سے پیدا[4]

۱۰

رونے نے میرے ہوش تو طوفاں کا کھو دیا — ٹک آنکھیں ڈبڈبائیں کہ عالم ڈبو دیا

---

[1] آصفیہ: رفتگی ہے [2] آصفیہ: میرا ہرگز [3] آصفیہ: عشق [4] آصفیہ: صفائے دل ہے میری تیرے عشق پاک سے پیدا
رامپور ن ۱: صفای دلکی ہی میری عشق الخ رامپور ن ۲: صفائے دل ہے میری عشق الخ

اب جوہری کہاں ہے کہ اک طشت آب نے — کافر کے بال بال میں موتی پرو دیا
جانی نہ قدر لختِ جگر آہ کیا کہیں — اک طرفہ لعل بیش بہا ہم نے کھو دیا
رسم حنا نہیں ہے کہ یوں پشت و رو لگے — یہ ہاتھ کس کے خون میں تو نے ڈبو دیا؟
دامن جھٹک[۱] کے چلتے ہو تم، پاس ہے ضرور — تربت کا میری دیکھیو ٹھنڈا نہ ہو دیا

ہاتھوں سے درد و غم کے دل آزار مصحفی
اتنا ہوا بتنگ کہ بس اس نے رو دیا

۱۱

شعلۂ آتش پہ جب میں اپنا داماں رکھ دیا — پرزے پرزے کر کے دل نے بھی گریباں رکھ دیا
ہیں ابھی لاکھوں مسلماں خیل میں تیری اسیر — ہاتھ سے خنجر کو کیوں اے نامسلماں رکھ دیا
اڑتے اڑتے اس کے کوچے میں جو جا نکلے کہیں — حالوں نے دوش سے تخت سلیماں رکھ دیا
دوست داروں کو خبر پہنچے کہ شب مقتل میں جا — ہم نے سر اپنا تہ شمشیر براں رکھ دیا
جب قسم کھانے لگا میں اختلاط غیر کی — دوڑ کر کافر نے میرے سر پہ قرآں رکھ دیا
چشم تر کو دی بہار اس آہِ آتش بار نے — جوئباروں پر میں کیا سرو چراغاں رکھ دیا
جب حکایت ہائے رنگیں اس نے عاشق کی سنیں — پڑھتے پڑھتے ہاتھ سے جزو گلستاں رکھ دیا
مہربانی دیکھیو کانِ ملاحت کی مرے — زخم عاشق پر نگوں کر کے نمک داں رکھ دیا
چاک در سے بھی نہیں کر سکتے ہم اس پر نگاہ — کس نے دروازے پہ یہ اس کے نگہباں رکھ دیا
کیا نظر آیا مجھے اس میں، کہ میں نے روزِ وصل — لب تلک لے جا کے جامِ آبِ حیواں رکھ دیا
عشق کے ہاتھوں سے جلتا ہوں کہ سینے پر مرے — گرم گرم آتے ہی اس نے، داغِ ہجراں رکھ دیا
سودۂ الماس چاہے تھا مرا زخم اے طبیب — تو نے کیوں مرہم کا پھاہا اس پہ ناداں رکھ دیا
اس نے سینے سے مرے پیکاں کو کھینچا تو ولے — جب یہ دیکھا دل بھی ہے اس میں، تو پیکاں رکھ دیا
جیسے گل ڈالی پہ پھوٹے، یوں نظر آیا وہ[۲] رخ — یک بیک ہاتھ اس نے جب زیرِ زنخداں رکھ دیا
سیم سی سینے کی تختی سب نظر آنے لگی — کس نے وا اتنا ترا چاک گریباں رکھ دیا

مصحفی بارِ امانت کا نہ تھا حامل کوئی
اس لیے اس بوجھ کو بر فرقِ انساں رکھ دیا

۱؎ آصفیہ: جھپک   ۲؎ آصفیہ: وہ شوخ

۱۲

دل کب متحمل ہو، جدائی کے الم کا
اس حرف کے لکھنے سے جگر شق ہے قلم کا

ہووے نہ عذاب اس پہ کبھی، جس کے پس مرگ
چھاتی پہ ہو تعویذ ترے نقش قدم کا

آیا ہے عدم سے، سو عدم ہی کو سدھارا
ہستی میں کوئی رہ نہ گیا ملک عدم کا

ہوتا ہے مسافر کو دوراہے میں توقّف
رہ ایک ہے، اٹھ جائے جو شک دیر و حرم کا

اے مصحفی دنیا ہے سرا، اس میں مری جان
جو ہووے، غنیمت ہے گذارا کوئی دم کا

۱۳

نالۂ مرغ سحر دل میں اثر کر ہی گیا
سنتے ہی اس کے، میں دنیا سے سفر کر ہی گیا

جس کی جس طرح کٹی غم کدۂ دنیا میں
عمر اپنی کی وہ اوقات بسر کر ہی گیا

چشمۂ آب حیات اس کے دم تیغ میں تھا
خضر بھی اپنے لب خشک کو تر کر ہی گیا

دم شمشیر پہ تھی راہ مری، اس کو، میں
کر کے بند آنکھیں، میں آخر کو گذر کر ہی گیا

بزم خوباں میں جو شب لے گئے مجھ کو احباب
میں بھی ہر ایک کی صورت پہ نظر کر ہی گیا

مل گیا تھا وہ، تپنچوں کو کمر پیچ سجے
بانکپن دیکھ کے میں اس کا، حذر کر ہی گیا

کیا کہوں اس کی ادا، وقت پکڑنے کے وہ شوخ
رات مجھ سے بھی اگر اور مگر کر ہی گیا

مصحفی کون سی ہے اب مرے بچنے کی امید
ناوک غمزہ تو سوراخ جگر کر ہی گیا

۱۴

یک چند اس طرف جو میں جانے سے رہ گیا
رک رک کے وہ بھی کچھ ادھر آنے سے رہ گیا

کیوں کر کہوں نہ اس کو ترازو، کہ تیر عشق
وہ تیر ہے جو لگ کے نشانے سے، رہ گیا

گردش کی آسماں کی وہی چال ڈھال ہے
کس دن یہ لے کسوں کو ستانے سے رہ گیا

کسی کی نگاہ مست نے تجھ کو چھکا دیا
ساقی تو کیوں شراب پلانے سے رہ گیا

وہ نورِ دیدہ اٹھ جو گیا سامنے سے رات
مجھ کو اُسی گھڑی نظر آنے سے رہ گیا

قاصد کو اس نے جاتے ہی رخصت کیا تھا لیک
یہ رات، ماندگی کے بہانے سے، رہ گیا

بسمل کی تیرے، کچھ نہ گئی پیش جستجو،
آخر وہ ہاتھ پانو ہلانے سے رہ گیا

وہ لالہ رُو نہ مجھ سے ملا مصحفیؔ، دریغ
یہ داغ میرے دل پہ زمانے سے رہ گیا

۱۵

مجھ تک یہ نہ آوے تمھیں منظور یہی تھا
میں بیٹھ رہا، میرا بھی مقدور یہی تھا

دیکھا، کہ نہ دیکھا، اسے جاتے ہوئے تم نے
اے کج کلہاں، ہاں بتِ مغرور یہی تھا

کیا اپنی خرابی میں کہوں، سنگ جفا سے
جس نے کہ کیا شیشۂ دل چور، یہی تھا

مدّت ہوئی ویراں ہے مرا کلبۂ احزاں
کیا کہیے، کبھی جلوہ گہِ طور[1] یہی تھا

سینے میں مجھے اپنے تجلّی نظر آئی
میں عشق میں موسیٰ تھا، مرا طور یہی تھا

ہو جاتے تھے معشوق یوہیں دشمن عاشق؟
کیا اگلے زمانے میں بھی دستور یہی تھا

اِک صانع قدرت کی جُدی بات ہے، لیکن
یوسف میں بھی ہاں حسن یہی، نور یہی تھا

بولا وہ صنم دل پہ مرے تیر لگا کر:
کیا سچ ہے، ترے زخم کا انگور یہی تھا؟

مجھ سے نہ گیا مرتے تلک عشق کا لپکا
سینے میں مرے مصحفیؔ ناسور یہی تھا

۱۶

جاتے جاتے راہ میں اُس نے، مُنھ سے اُٹھایا جوں ہی پردا
راہ کے جانے والوں نے بھی، مُنھ اُس کا پھر پھر کے دیکھا

قیس ملے تو اس سے پوچھوں، کیا ترے جی میں آئی دوانے
شہر کو تو نے کس لیے چھوڑا، کیوں کے خوش آیا تجھ کو صحرا

صبح سے لے کر شام تلک یاں، یہ وہ گلی ہے جس میں پھریں ہیں
چاک گریباں، موے پریشاں، ہم سے ہزاروں عاشق رسوا

[1] آصفیہ: جلوہ گہِ طور

اس نے مزا کیا پایا ہوگا، دو چلّو مے پینے کا یاں
جس میکش کے ہاتھ نہ آیا، غبغبِ ساغر، ساعدِ مینا

سوختگی نے غم کی اثر جو دل میں کیا ہے، ہونے لگا ہے
تھوڑا تھوڑا، رنگ دھوئیں گے، سبزہ ہماری خاک سے پیدا

اک ٹھوکر میں مردے ہزار دل، اٹھ بیٹھیں ہیں گور سے وہ ہیں
لیتا ہے وہ وقتِ خرامش، پانو سے اپنے، کارِ مسیحا

آنکھ لڑانا، سامنے آنا، مُنھ دکھلانا، اور چھپ جانا
یہ بھی ادا ہے کوئی ظالم، ہاں خدا کو، مت دے ایذا

مصحفی اس دل چسپ زمیں میں، طبع کرے گر تیری رسائی
خامہ ترا کچھ کند نہیں ہے، ایک غزل تو اور بھی لکھ جا

١٧

دیکھ کر اک جلوے کو تیرے، گر ہی پڑا، بے خود ہو مسیحا
ان آنکھوں کے صدقے جاؤں، جو ہیں ہر دم محوِ تماشا

زہد و ورع پر بھول نہ زاہد، حسن کا منکر ہو نہ دوانے
صنعاں سے کو، لے گیا غافل، ایک ادا میں عشوۂ ترسا

دیکھ تجلّی حسن کی تیرے، کوہ ہے جب ہو کر پانی
دیوانا سا بھاگا وو ہیں، چاک گریباں کر کے دریا

کیوں نہ گریباں پھاڑوں اپنا، ہاتھ اور میرا اس کا دامن
طالع ہیں، آ کر کے ہوا ہے[1]، دامنِ یوسف دستِ زلیخا

روز کے وعدے، روز بہانے، روز یہ کہنا ان کا، کل کل
فائدہ کیا ان باتوں کا ہے، ہم نے میاں بس تم کو دیکھا

زلفِ معنبر جو اس نے کھولی تو یوں محفل ساری مہکی
آوے چمن سے، موسمِ گل میں، بادِ صبا کا جیسے جھونکا

---

[1] آصفیہ: طالع ہیں مل کر کے ہوا ہے الخ

مدھ میں بھرا ہے جوبن کے وہ، حسن سے اس کے ٹپکے ہے مستی
چاہِ ذقن ہے جامِ بلوریں، اور غبغب ہے شیشۂ صہبا
نیم نگہ پر دیتے ہیں دل کو، جانو تو کچھ لے لو صاحب
پھر نہ ملے گا ورنہ تم کو، ہرگز ایسا سستا سودا
کیوں نہ چھلکے دل دیکھ کے اس کو، جس ساقی کا ہووے یارو
دستِ نگاریں پنجۂ مرجاں، ساعد سیمیں گردنِ مینا

مصحفی کر کے چاک گریباں، چل جنگل کو اے دیوانے
دیکھ تو کیا پھولا ہے لالہ، سرخ ہے کیسا دامنِ صحرا[1]

۱۸

آیا یہاں، سو وہیں بہانے سے اُٹھ گیا　　آسودگی کا حرف زمانے سے اُٹھ گیا
گو اب ہزار شکل سے جلوہ کرے کوئی　　اپنا تو دل اس آئینہ خانے سے اُٹھ گیا
دیوانۂ بہار جو تھا، اس بہار میں　　صحرا کو، نو بہار کے آنے سے، اُٹھ گیا
بیٹھا تھا آ کے قیس تو لیلیٰ کے در پہ، لیک　　دیوانہ، کودکوں کے ستانے سے، اُٹھ گیا

ہرگز نہ مصحفی کا رہا خاک بھی نشاں
نقشِ قدم کی طرح زمانے سے اُٹھ گیا

۱۹

کچھ آرزو نہ تھی بت و بت خانہ دیکھنا　　منظور تھا ہمیں رخِ جانانہ دیکھنا
اُلجھا ہے کس کی زلف پریشاں میں دل مرا　　اے شانہ ہیں، برائے خدا، شانہ دیکھنا
نکلیں ہیں اس میں گردشِ چشمِ پری کے ڈھنگ　　ساقی، ادائے گردشِ پیمانہ دیکھنا
گھورے ہیں ہم، بتوں کو رقیبوں کے ساتھ دیکھ　　کوئی سیکھ لیوے ہم سے حریفانہ دیکھنا
اے دل بس آنکھیں مونہ لے، اب کیا ضرور ہے　　نت اٹھ کے روئے محرم و بیگانہ دیکھنا
کیا سہل کی طرح سے جلا دے ہے آپ کو　　اے شمع، جاں فشانئ پروانہ دیکھنا

۱۔ آصفیہ: دامنِ غبراء (غبراء بہ معنی دشتِ پُر غبار) ۱۸

کرتا ہے نت تو زلف کا مذکور مصحفی
اک دن کھنچے گا طول یہ افسانہ دیکھنا

۲۰

سخت مشکل ہے اب اُس کوچے میں جانا اپنا
کہ وہاں جان کا دشمن ہے زمانہ اپنا

اس فریبی کا میں کشتہ ہوں کہ مجھ سے سرِ راہ
مل بھی جانا تو کبھی گھر نہ بتانا اپنا

آنکھ لڑ جائے کسی سے جو تری تو لڑ جائے
لیک اے جانِ مری، دل نہ لڑانا اپنا

سینہ غربال ہی اُس کا نظر آیا آخر
تیرِ مژگاں نے کیا جس کو نشانہ اپنا

ہو کے پروانہ جو اس بزم میں ہم جاتے ہیں
ہم کو منظور ہے آتش میں جلانا اپنا

اگر اس شوخ کی مجلس میں ہوئی راہ ہمیں
ایک دن ہم بھی سنا دیں گے فسانہ اپنا

چاک ہو جاویں گے لاکھوں ہی گریباں ظالم
چاک پردہ سے[1] نہ یوں ہاتھ دکھانا اپنا

بولی وہ زلف سیہ کر کے گرفتار مجھے:
"پھر تو دل عشق کے پھندے میں پھنسانا اپنا!"

کر کے میں چاک گریباں جو کہا، یوں بولا:
"حال دکھلائے ہے کس کو یہ دِوانہ اپنا"

مصحفی گو تری منت کرے ناصح آکر
فصلِ گل میں تو گریباں نہ سلانا اپنا

۲۱

تیرِ کرشمہ دل سے مرے پار ہو گیا
آنکھیں لڑیں تو پھر جگر افگار ہو گیا

صیاد نے نہ ذبح کیا مرغِ دل کو ہائے
یہ تو قفس کے بیچ ہی مردار ہو گیا

ہے ہے ستم کے نام سے جو آشنا نہ ہو
یہ کیا ستم ہوا کہ ستم گار ہو گیا

ظالم، خدا کے واسطے، اب تو بھی درگزر
سینہ جراحتوں سے تو گلزار ہو گیا

برگشتگی کا بخت کی کس سے بیاں کروں
دلدار تھا جو، اپنا دل آزار ہو گیا

کس کی بلا سے زلف مری جاں پر پڑی
یارب میں کس بلا میں گرفتار ہو گیا

دل سے خبر نہیں ہے مجھے اس کے مصحفی[2]
آنکھوں میں تو اشارہ کئی بار ہو گیا

---

[1] آصفیہ: چاک پردے سے   [2] آصفیہ: ویسے خبر نہیں ہے مجھے اس کی اے

۲۲

کیا کہیئے یار تھا سو وہ اغیار ہو گیا
اس غم سے جل کے داغ، دل زار ہو گیا

آنکھ اس کی سوئے در ہی رہی رات دن لگی
نظروں[1] میں جس سے وعدۂ دیدار ہو گیا

سینہ جو چاک چاک ہوا، اس کی تیغ سے،
یہ مرغ دل قفس میں گرفتار ہو گیا

آیا اگر غبار کبھی، میرے، یار کے
وہ بھی تو درمیاں میں دیوار ہو گیا

سفّاک ابتدا سے وہ بے رحم ہے، غلط
کہیئے گر اس کو، آج جفا کار ہو گیا

اتنی تو مجھ کو سیر چمن کی ہوس نہ تھی
پر دل کی بے کلی سے میں لاچار ہو گیا

تعریف مجھ سے سنتے ہی اس گل عذار کی
بس پھول تو گلے کا مرے ہار ہو گیا[2]

اب ڈھونڈتا ہے تیر کو ظالم کہاں کہ وہ
سینے میں غرق تا لب سوفار ہو گیا

یوسف بھی اپنے عہد میں، کچھ تجھ سے کم نہ تھا، ق
اُس کا بھی حسن، رونقِ بازار ہو گیا

پر تو وہ جنسِ نغز ہے، بازار دہر میں،
سودے میں محو جس کے خریدار ہو گیا

بے وجہ مصحفیؔ کے نہیں ہے یہ اشک و آہ
ظاہر ہے یہ کہ اس کو کچھ آزار ہو گیا

۲۳

باغباں، دیکھ کے گل، ضبطِ نفس بُلبُل کا
لے گیا سامنے ہی گُل کے قفس بُلبُل کا

کام ان کا ہے یہ، جو لوگ کہ ہیں عاشق دوست،
شوق کرتے ہیں عبث اہل ہوس، بُلبُل کا

کر چلا کوچ مگر، قافلۂ فصلِ بہار
دل ہے فریاد سے مانند جرس بُلبل کا

عشق وہ چیز ہے کیا، کچھ جسے جو کھوں ہووے
کبھی خواہاں نہ سنا ہم نے عس بُلبل کا

کون جانے تھا کہ اس طفل کے ہاتھوں میں ابھی
جی نکل جائے گا مانند مگس بُلبل کا

آشیانے کے بنانے میں یہ دلسوزی کی
جلنے لاکھو[3] نہ ہوا ایک بھی خس بُلبل کا

مصحفیؔ دام ہے گل چہرہ بتوں کی خاطر
تو بھی گر شوق کرے اب کی برس بلبل کا

---

[1] آصفیہ: آنکھوں میں [2] یہاں سے مقطع تک پانچ اشعار نسخۂ الف سے غیر حاضر ہیں [3] آصفیہ: چلنے لاکھو نیز رامپور ن ۲

۲۴

خوبی کو تری کس نے مری جاں نہ سراہا
صدقے میں ترے، تجھ کو صنم کس نے نہ چاہا

پونچھے نہ کبھی تو نے مرے دیدۂ گریاں،
رکھا نہ کبھی تو نے مرے زخم پہ پھاہا

جو راہ پسند آوے تری، اس میں قدم رکھ
مشہور ہے یاں مذہب و مشرب کا دوراہا

گر اس کی یہ صورت ہے، تو اس چاہ کے اوپر
کس طرح سے گذرے گی مری، بار الٰہا

خال و خط و زلف اس میں ترے سب ہیں قلم بند
ہے نامۂ اعمال کا اپنے جو سیاہا

جب پردہ اٹھاوے ہے کبھی منھ سے وہ اپنے
اس وقت مرے منھ سے یہی نکلے ہے "آہا"[1]

زخمی وہ ترا کون ہے جو خوں میں نہ لوٹا
بیمار ترا کون ہے وہ جو نہ کراہا

ٹھوکر جو لگاتا ہے مرے دل کو تو ہر دم
راہ و روش ناز یہ ہے، جلوہ پناہا!

ہے کون سے مذہب میں روا، کس نے بتا دے
مسجد کے تئیں، واسطے بت خانے کے، ڈھاہا

کہتا تھا تو اے مصحفی عاشق میں نہ ہوں گا
قول اپنے کے تئیں تو نے غرض زور نباہا

۲۵

ہے کسوں[2] پر جو ذرا وہ بت بے باک چڑھا
ہر گھڑی آئے ہے پنڈے کے تئیں خاک چڑھا

قد کو یوں اس کے دھواں آہ کا میری لپٹا
جوں کسی نخل پہ ہووے شجر تاک چڑھا

جامۂ صبر کیا ماہ فلک نے ٹکڑے
شب جو کوٹھے پہ وہ مہ، پہن کے پوشاک چڑھا

کون جھک جھوٹے[3] سہے، ہم سے ضعیفوں کے تئیں
نہ ہنڈولے پہ تو اے گردش افلاک چڑھا

طلب بوسۂ رخسار عبث ہے اس سے
دور سے دیکھ کے عاشق کو، جو لے ناک چڑھا

اس قدر تو ہے اسے اپنی نزاکت کا گھمنڈ
گل بھی ہاتھ اس کے میں دیجے، تو وہ لے ناک چڑھا

جب کبھی جاتے ہیں تربت پہ ترے کشتے کی
جائے گل دیتے ہیں واں ہم جگر چاک چڑھا

دل ہے نازک مرا، ہاتھوں سے ترے ٹوٹ نہ جائے،
اس نگینے کو نہ تو چرخ پہ حکاک چڑھا

اس طرح باغ میں نرگس کی جھکی ہیں آنکھیں
کسی کیفی کو ہو جوں نشۂ تریاک چڑھا

---

۱ نسخۂ الف: اس وقت مرے منھ سے بھی نکلے ہے اہاہا ۲ ن ۱: کون ن ۲: گیوں
۳ آصفیہ: جھک جھوٹے

مصحفی کشتہ ہے آگو ہی ترا، تو اس پر
آستیں کو نہ عبث او بتِ سفّاک چڑھا

۲۶

اس نے جس وقت کہ خال اپنے زنخداں پہ رکھا
داغ اک اور مرے سینۂ سوزاں پہ رکھا

آگیا یار کا دامن جو مرے ہاتھ کبھی
میں نے رومال سمجھ، دیدۂ گریاں پہ رکھا

تو خراماں جو ہوا، باغ میں کل نرگس نے
اپنی آنکھوں کو ترے گوشۂ داماں پہ رکھا

رات آنکھوں میں کٹی مجھ کو، جدائی کی تری
میں نے اک پل بھی تو مژگاں کو نہ مژگاں پہ رکھا

دھجّیاں ہو کے اڑا میرا گریباں، میں نے
ہاتھ جس وقت کہ سودے میں، گریباں پہ رکھا

مژدۂ قتل نہ پہنچا جو مجھے زنداں میں،
رُک کے، میں اپنا گلا خنجرِ بُرّاں پہ رکھا

مصحفی، لعل لب اس کی، میں کروں کیا تعریف
جس نے سو بار، سخن لعل بدخشاں پہ رکھا

۲۷

جس سنگ پہ خونِ کوہ کن تھا
وہ سنگ بھی تختۂ چمن تھا

اُس گل کو، میں اس ادا سے دیکھا،
شبنم کا گلے میں پیرہن تھا

دیکھا میں، ترے شہید کا رنگ
جامہ جو گلے میں تھا، کفن تھا

باندھا تھا وہ چیرہ اس نے سر پر
ہر پیچ میں جس کے بانکپن تھا

ہم اس سے جو کھنچ رہے تھے زیں پیش،
یہ بھی ایک عاشقوں کا فن تھا

اے شمع تو خوب سا نہ روئی
آگے ترے صبح تک لگن تھا

میں نالہ بلند کیوں کے کرتا
سر پر مرے گنبد کہن تھا

زلف اپنی جو رات اس نے کھولی
ہر چین میں اس کے، اک ختن تھا

جاتے اس کے، میں رہ گیا چپ،
نالہ ہی تو اپنا ہم سخن تھا

اک بجلی کی کوندہ ہم نے دیکھی
اور لوگ کہیں ہیں، وہ دہن تھا

اے مصحفی، کیا گیا تھا تو رات؟
اس کوچے میں شورِ مرد و زن تھا

۲۸

رات پردے سے ذرا مُنھ جو کسو کا نکلا
شعلہ سمجھا تھا اسے میں، پہ بھبھوکا نکلا

مہر و مہ اس کی پھبن دیکھ کے حیران رہے[1]
جب ورق یار کی تصویر دو رُو کا نکلا

یہ ادا دیکھ کے، کتنوں کا ہوا کام تمام،
نیمچہ کل جو ٹک اس عربدہ جو کا نکلا

مر گئی سرو پہ جب ہو کے تصدّق، قمری
اُس سے اُس دم بھی نہ طوق اپنے گلو کا نکلا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

۲۹

شب ترے کوچے میں کوئی کہتے ہیں مر کر رہ گیا
تو نہ آیا اور وہ مسکیں آہ بھر کر رہ گیا

قافلہ بادِ بہاری کا، یہ اس کو کیا ہوا،
باغ سے جاتا تھا، کیوں عزمِ سفر کر رہ گیا

تو گیا پیارے سفر کو، چھوڑ کر میرے تئیں
رفتہ رفتہ، میں ترے جی سے بِسَر کر رہ گیا

ہے گذشت ایسی مزاج اپنے میں، دیکھا بارہا،
اس نے دی گالی مجھے، میں درگزر کر رہ گیا

اب جو بھولے سے اودھر آتا نہیں اس کا خیال
ہائے کیا وہ بھی کسی کے جی میں گھر کر، رہ گیا

مُنھ پھرا کر جب چلا وہ مجھ سے، ہنگامِ وداع،
اس کے چہرے پر میں حسرت کی نظر کر رہ گیا

میں وہ بُلبل ہوں کہ جو بعد از رہائی کے دو دِن
سامنے صیّاد کے پرواز کر کر رہ گیا

وصل کی شب آتے ہی مجھ سے جو وہ لڑنے لگا
کام اپنا کچھ جو سنورا تھا بگڑ کر رہ گیا

کیا کہوں حالت وداعِ یار کی اے مصحفی!
مُنھ لیا اُس نے پھرا، میں چشم تر کر رہ گیا

۳۰

آتا ہے یوں محال تو اک شب بہ خواب آ
مجھ تک خدا کے واسطے ظالم شتاب آ

دیتا ہوں نامہ میں تجھے اس شرط پر، ابھی
قاصد تو اس کے پاس سے لے کر جواب آ

ایسا ہی عزم ہے تجھے گر کوے یار کا
چلتا ہوں میں بھی، اے دلِ پر اضطراب، آ

[1] ن ۱: مہر و مہ اس کی وہ دیکھ بیتابی حیران رہے   ن ۲: مہر و مہ اس کے تئیں دیکھ کے حیران رہے

یہ خستہ چشم وا ہے، ترے انتظار میں
اے صبح مُنھ دکھا کہیں، اے آفتاب آ

تا یہ شبِ فراق کی دیجور دور ہو
اے رشکِ ماہ گھر میں مرے بے نقاب آ

آبِ رواں و سبزہ و ردے نگار ہے
ساقی شتاب ایسے میں لے کر شراب آ

روئیں گلے سے لگ کے بہم، خوب کوئی دم
کیا دیکھتا ہے اے دلِ بے صبر و تاب، آ

بحرِ جہاں میں دیر شد آمد روا نہیں
مانندِ قطرہ جا، تو برنگِ حباب آ

قربانی آج در پہ ترے کرنی ہے مجھے
لے کر کے تیغ تو بھی برائے ثواب آ

شاید وہ تجھ کو دیکھ کے غم کھائے مصحفی
تو اُس کے سامنے تو بہ چشمِ پُر آب آ

۳۱

کہوں کیا، ہجر میں صبر و شکیبائی پہ کیا گزرا
گئی طاقت کدھر تن کی، توانائی پہ کیا گزرا

گیا، میں در سے تیرے، اور نہ پوچھا تو نے اتنا بھی
خدا جانے کہ اس کم بخت سودائی پہ کیا گزرا

تری زلفوں کی رعنائی جو دیکھی رات گلشن میں
کہوں کیا، طرّۂ سنبل کی رعنائی پہ کیا گزرا

ہوئی وہ شہر بندِ خیمۂ شرم و حیا، اُس بن
خبر لیلیٰ کو کیا ہے، اُس کے صحرائی پہ کیا گزرا

مری آنکھوں کا جوہر جل گیا کل اک نظّارے سے
نہ پوچھو حسن کے شعلے سے بینائی پہ کیا گزرا

غرض دل نے تو سو صدمے اُٹھائے، پر خدا جانے
فغاں شب سے میری، چرخِ مینائی پہ کیا گزرا

نہ پوچھا تفقّر میں مصحفی اتنا بھی کافر نے
کہ اس عزلت نشینِ کنجِ تنہائی پہ کیا گزرا

۳۲

جہاں آمد شُدِ اغیار کا دن رات ہے کھٹکا
کروں تدبیر کیا اس کی، مرا دل بے جگہ اٹکا

نہ ترشی، اس کا جوں چاہے تھا جی، تصویرِ شیریں کی
بہت سا تیشۂ فرہاد نے پتھر سے سر پٹکا

اُسے گرمی جو پہنچی آہ آتش ناک سے میری[1]
رقیب روسیہ شب کوئلے کی سی طرح چٹکا[2]

غبارِ ناتواں تھا میں تو، کیا جانے وہ کیا سمجھا
کہ میرے ہاتھ سے دامن کو اس انداز سے جھٹکا

---

[1] ن ۱: پیدا، ن ۲: آہ آتش ناک کی میری

[2] ن ۱: چھٹکا

دفینہ گھر میں کیا تھا اور تو ہم بادہ نوشوں کے — کھُدا جب شہر سارا واں سے نکلا ہے کا اک مٹکا
خدا کے واسطے کوئی اس کو راہ نجد بتلا دو — کہاں تک ناقۂ لیلیٰ پھرے ایدھر اُدھر بھٹکا
ادا تو دیکھیو اے مصحفی اس کی کہ وہ مجھ پر
لگاتا ہے بنا کر تازیانہ زلف کی لٹ کا

۳۳

پردہ اُٹھا کے اس نے جو سینہ اٹھا دیا — میں چاک کر کے اپنا گریباں اُڑا دیا
اک پل میں روزِ عیش مرا کر دیا سیاہ — آنکھوں میں اس کی کس نے یہ کاجل لگا دیا
جب تک کہ مے نہ پی تھی، کہاں تھا ترا یہ حسن — اِک جام نے تو تجھ کو بھبھوکا بنا دیا
اس حسنِ پردہ سوز کی تعریف کیا کروں — پردے میں مہر و ماہ کو جس نے بٹھا دیا
اے وائے آ گیا مرے آرام میں خلل — خوابِ عدم سے کس نے یہ مجھ کو جگا دیا
کل دیکھتے ہی ہم اُنھیں بے ہوش ہو گئے — آنکھوں نے ان کی ہم کو دھتورا کھلا دیا
ظالم ہے یہ بھی چال کوئی، ٹک خدا سے ڈر — اس چال نے تو خاک میں ہم کو ملا دیا
کیا جی میں اس کے آئی کہ شعلے پہ شمع کے — اپنے تئیں پتنگ نے کیسا جلا دیا
بس عاشقی کرے کوئی کیا اور بے شعور — تیرے تو غم میں جی بھی میں اپنا کھپا دیا
رکھتا ہے مصحفی سے جو ناحق تو اتنی لاگ
اے چرخ سفلہ، اس نے ترا کچھ لیا دیا؟

۳۴

کیا تعجب ہے اگر پھر کے ہو احیا میرا — کہ مری قبر پہ آیا ہے مسیحا میرا
گر یہی حال ہے اس کا، تو انھیں گلیوں میں — مجھ کو بدنام کرے گا، دل شیدا میرا
مرغ بسمل کی طرح خاک پہ تڑپوں ہوں پڑا — قاتل اس وقت تو آ دیکھ تماشا میرا
مجلس شادی و ماتم کا میں آئیں ہوں، ولیک[1] — قابل داغ ہے جوں شمع سراپا میرا
جوں جوں کرتا ہے خط و خال کی وہ آرائش — دن بدن اور فزوں ہوتے ہے سودا میرا
ہیں اگر نیک و گر بد ہوں، تو پھر ان کو کیا — ذکر کرتے ہیں عبث مردم دنیا میرا

---

[1] ن ۲: و لے

مصحفیؔ جب سے میں گلیوں میں پھرا خاک بسر
نام لڑکوں نے رکھا شہر کے، رسوا میرا

۳۵

کاٹ کر سر میں تری راہ میں دھر جاؤں گا — جاں فشانی ہے میرا کام، سو کر جاؤں گا
دل کے دھڑکے سے مجھے[1] نیند نہ آئی شبِ وصل — سوتے سوتے جو کہا اس نے: میں گھر جاؤں گا
اپنے کوچے سے تو مجھ کو نہ نکال[2] اوبے رحم — یاں سے اُٹھ کر کے میں کس اُجڑے نگر جاؤں گا
یہی اندیشہ رہے ہے مرے دل میں دن رات — کہیں اس در سے اُٹھا بھی تو کدھر جاؤں گا
ہوں مشوش، مجھے اس دم نہ لگا ہاتھ صبا — ورنہ زلفوں کی طرح میں تو بکھر[3] جاؤں گا
جس طرح جائے ہے گذرا ہوا عالم سارا — میں بھی اک روز اسی طرح گذر جاؤں گا
مصحفیؔ یہ ہی ادائیں ہیں گر اُس کی تو میاں
میں تو جینے کا نہیں، دیکھیو مر جاؤں گا

۳۶

میں زلف مُنہ میں لی، تو کہا: مار کھائے گا؟ — چومی جو بھوں،[4] تو بولا کہ تلوار کھائے گا
خنجر زنی کا صرفہ نہ کر ورنہ جان من — لوہے کو اس کی تیغ کے زنگار کھائے گا
جب تک صبا نہ باغ سے لادے گی برگ گل — کب آب و دانہ مرغ گرفتار کھائے گا
رو کش ہوا جو تجھ سے، تو دستِ نسیم سے، — ہر برگ گل، طپانچہ بہ رخسار کھائے گا
دامن ترا، بنے گا گریبانِ عاشقاں، — گر یوں ہی ٹھوکریں دم رفتار کھائے گا
چن چن رکھا ہے خار مغیلاں کو قیس نے — لیلی کا ناقہ یعنی کہ یہ خار کھائے گا
زہرہ ہے کس کا، کھاوے اس ابرو کی تیغ کو — گر کھائے گا تو ہم سا جگر وار کھائے گا
عصمت میں اس کی شک نہیں، ہاں روز باز پرس — اس بات پر[5] قسم یہ گنہ گار کھائے گا
ہم قافلے میں عشق کے ہیں، ہم کو کیا ہے غم، — غم قافلے کا، قافلہ سالار کھائے گا
ہے طرفہ مخمصے میں کئی دن سے مصحفیؔ
پوچھو تو کوئی کچھ بھی یہ بیمار کھائے گا

---

[1] نسخۂ الف: دل کے دھڑکے سے مرے ا لخ [2] آصفیہ: اے [3] آصفیہ: میں بھی [4] آصفیہ: اس بات کی

۳۷

عاشق تو ملیں گے تجھے، انساں نہ ملے گا
مجھ سا تو کوئی بندۂ فرماں نہ ملے گا

ہوں منتظر لطف کھڑا کب سے ادھر دیکھ
کیا مجھ کو دل اسے طرۂ جاناں نہ ملے گا

کہنے کو مسلماں ہیں سبھی کعبے میں، لیکن
ڈھونڈو گے اگر، ایک مسلماں نہ ملے گا

ناصح اسے سینا ہے تو اب سی لے، وگرنہ
پھر فصل گل آئی، یہ گریباں نہ ملے گا

رہنے کے لیے ہم سے گنہ گاروں کے یارب
کیا شہر عدم میں کوئی زنداں نہ ملے گا

ہونے کی نہیں تیری خوشی، سرو چراغاں
تا خاک ہیں یہ بے سروساماں نہ ملے گا

دل اس سے تو مانگے ہے عبث مصحفی ہر دم
کیا فائدہ اصرار کا ناداں، نہ ملے گا

۳۸

محنت کے لیے، یہ ہوئے آرام کو پیدا
خالق نے کیا ہے ہمیں کس کام کو پیدا

نام آوری چاہے ہے تو ٹک سر کو جھکا چل
خم ہوتے ہی کرتا ہے نگیں نام کو پیدا

داغ جگر سوختگاں، مثل کواکب
گر صبح کیے گم تو ہوئے شام کو پیدا

چل باغ میں اے گل، تری مے نوشی کی خاطر
غنچے نے صراحی سے کیا جام کو پیدا

پھر فصل گرفتارئ بلبل ہوئی، صیاد
کر جلد کہیں سے قفس و دام کو پیدا

مت زلف سیہ فام کو عارض سے جدا کر
جب تک وہ کرے خط سیہ فام کو پیدا

اے مصحفی، چاہے ہے اگر شوکت ظاہر
کر تو بھی زمانے میں سرانجام کو پیدا

۳۹

حسن و خوبی میں تجھے یوسف ثانی سمجھا
مرتبہ خوب ترے حسن کا مانی سمجھا

جس کے آگے میں کہا، عشق کا اپنے قصّہ
قصّہ عشق زلیخا کو کہانی سمجھا

کیوں رکھی اس نے مرے ساتھ بنا کینے کی
خصم گر مجھ کو فن شعر کا بانی سمجھا

اس کی فہمید کے صدقے ہوں، کہ اس چاہت پر — دوست، دشمن کو مرا دشمنِ جانی سمجھا
اس نے گالی مجھے دی، ہو کے عتاب آلودہ — اور میں سادہ اسے لطفِ زبانی سمجھا
اس کی چتون کی ادا جس نے بھی دیکھی گا ہے — وہی ہمدم تو مرا دردِ نہانی سمجھا

مصحفی نے کوئی مطلع جو لکھا درد آمیز
خصمِ بے درد اسے شعرِ فغانی سمجھا

۴۰

میں تو دیکھا نہیں اس جلوہ گری کا سونا — اُس کے سونے میں تو نکلے ہے پری کا سونا
اک ذرا دیکھیو اس رشکِ پری کا سونا — میں تو دیکھا نہیں اس بے خبری کا سونا
کس کی ٹھوکر یہ لگی کنجِ قفس کو یا رب — جس نے برباد کیا کبک دری کا سونا
لے گئی سایۂ دیوار میں یوں ہم کو اجل — بر سرِ راہ ہو جوں رہ گذری کا سونا
گل کے رخسار پہ منھ رکھ کے سوئی ہے نرگس[1] — اک ذرا دیکھیو اس چاؤ بھری کا سونا
رات کو سیر کرے مجلسِ معشوقاں کی — جس نے دیکھا ہو نہ ہم[2] حور و پری کا سونا
پہنچے منزل کو تو غفلت نے ہمیں آن لیا — تعبِ راہ سے ہو جوں سفری کا سونا

مصحفی، اب تو مری جان کہیں آنکھیں کھول
صبحِ محشر ہوئی، اس بے خبری کا سونا

۴۱

شب کہ نظروں میں خیالِ رخِ دلدار رہا — دل کی بیداری سے تا صبح میں بیدار رہا
نالے بہنے سے تھمے، چلنے سے دریا ٹھٹھکے — اشک باری سے نہ یہ دیدۂ خوں بار رہا
بات کرتا ہوں تو کرتے ہو زباں میری بند — بات کہنے سے بھی کیا اب یہ گنہ گار رہا
دل جو[3] شیدا ہے مرا اس پہ، وہ جانے گو ہو — مجھ کو کیا اس دلِ شیدا سے سروکار رہا
جب نہ تب روئے نکو ہی پہ پڑیں یہ آنکھیں — حیف صد حیف کہ ان کو یہی آزار رہا
مصحفی نے نہ خیال اس کی گلی کا چھوڑا — ق — جب ہوئی رات، یہ جا کر پسِ دیوار رہا
نہ سنا پر نہ سنا اس نے مرے کہنے کو — دوستو میں تو بہت اپنا سا سر مار رہا

---

[1] آصفیہ: گل کے رخسار پہ منھ رکھ کے جی ہے کیا نرگس [2] اصل: بہم، نسخۂ آصفیہ میں بھی اسی طرح ہے۔
[3] آصفیہ: خود پسند ہے۔

۴۲

کون سے روز ترا وعدۂ دیدار نہ تھا
کون سی شب میں ترے واسطے بیدار نہ تھا

تو نے ناداں مجھے جرم وفا پر مارا
گو گنہ گار تھا، اتنا تو گنہ گار نہ تھا

رکھ دیا زخم جگر پر میں نمک کا پھاہا
شب کہ بالیں پہ مری مرہم زنگار نہ تھا

اس کے در تک ہی نہ پہنچا کہ ہوئی جان ہوا
بسکہ قسمت میں مری سایۂ دیوار نہ تھا

سچ ہے اب کیوں نہ میاں اس کی طرف کو لوگے
وعدے سب غیر سے تھے[1] ہم سے کچھ اقرار نہ تھا

تو نے اوروں کو دیے، کیا کوئی گل، اے صیاد
حق چاک قفس مرغ گرفتار نہ تھا

باغ جنت میں دل اپنا نہ لگا، ہاں سچ ہے
باغ جنت ترے کوچے سے ہوادار نہ تھا

ماہ کنعاں جو گیا مصر میں، بکنے کے لیے
کوئی کنعاں میں مگر اس کا خریدار نہ تھا؟

دل کے آ جانے کی ہے بات جدی اے قمری
ورنہ کچھ سرو سہی اتنا طرحدار نہ تھا

مصحفی کی جو میں بالیں پہ گیا وقت اخیر
آنکھیں کھولیں تو ذرا اس نے، پر[2] ہشیار نہ تھا

۴۳

شب ہجراں تھی، میں تھا اور تنہائی کا عالم تھا
غرض اس شب عجب ہی[3] بے سروپائی کا عالم تھا

گریباں غنچۂ گل نے کیا گلشن میں سو ٹکڑے
کہ ہر خندے پہ اس کے طرفہ رعنائی کا عالم تھا

نہال خشک ہوں میں اب، تو یارو کیا ہوا، یعنی
کبھی اس بید مجنوں پر بھی شیدائی کا عالم تھا

لکھے گر جا و بے جا شعر میں نے، ڈر نہیں اس کا[4]
کہیں یاں تھا سفر میں، مجھ پہ بے جائی کا عالم تھا

حنا بھی تو لگا دیکھی پہ وہ عالم کہاں ہے اب
ہمارے خوں سے جو ہاتھوں پہ زیبائی کا عالم تھا

چلا جب شہر سے مجنوں طرف صحرا کی یوں بولا
نصیب اپنے تو اس عالم میں رسوائی کا عالم تھا

یہ عالم ہم نے دیکھا مصحفی ہاں اپنی آنکھوں سے
کہ پیدا جیسے اس معشوق ہرجائی کا عالم تھا

---

[1] نسخۂ الف: وعدہ سب غیر سے تھا   [2] آصفیہ: پہ ہشیار   [3] آصفیہ: عجب کچھ
[4] آصفیہ: لکھے گو جا و بے جا اشعار میں نے ڈر نہیں اس کا۔

۴۴

کیوں کھینچ کے تیغا مجھے اک بار لگایا
کب تجھ کو گلے سے میں ستم گار لگایا

رکھتے ہی نہ تھے نقدہ کو کچھ، ہم نے سر اپنا
سودے میں تری تیغ کے ناچار لگایا

کاغذ جو شکایت کا تری ہم نے لکھا تھا
کوچے میں ترے جا، سرِ بازار لگایا

آیا جو اسے بوسۂ عاشق کا تصوّر
مُنہاں سے حقّے کی نہ رخسار لگایا

کی اس نے علم اپنی جو تیغ خم ابرو
گذری کا تماشا سرِ بازار لگایا

جو زخم کہ آئے تھے ترے حسن سے اُن پر
سبزے نے ترے مرہم زنگار لگایا

گذرا وہ مری خاک سے سو بار ولیکن
دامن نہ زمیں کو گہِ رفتار لگایا

آیا جو کبھی گھر وہ مرے تو وہیں چھپ کر
ساتھ اس کے، طرح سائے کی، اغیار لگ آیا

ہیں تیغ دو جانب سے علم، ہائے یہ کس نے
سُرمہ تری آنکھوں میں جفاکار لگایا

کل دیکھ کے رونے جو لگا لختِ جگر کا
پھولوں کی طرح اس نے اک انبار لگایا

صیاد نے کیوں رخنۂ دیوارِ چمن سے
روے قفسِ مرغِ گرفتار لگایا

اے مصحفیؔ ہیں مرد وہی یار جنھوں نے
دل قحبۂ دنیا سے نہ زنہار لگایا

۴۵

تو ایسا غیر کے حصّے میں آیا
کہ میں نے تجھ کو جب ڈھونڈا نہ پایا

ٹک اپنے جی میں تو انصاف تو کر
مجھے کس کس طرح تو نے ستایا

تری تقصیر کیا، میرا ہی ہے جرم
جو میں نے تجھ سے کافر! دل لگایا

طریقِ عاشقی میں ہوں میں ثابت
مجھے سو بار تو نے آزمایا

نہ کرنا تھا بہاراں میں تو یہ کام
گریباں کن دنوں ہم نے سلایا

پکڑ کر ہاتھ میں، اس کا لیا چُوم[1]
طپانچہ[2] اُس نے جب مجھ پر اُٹھایا

وہ غافل تھا مزے داری سے یعنی ق مزا یوں چاہ کا اس کو چکھایا[3]

---

[1] آصفیہ: پکڑ کے ہاتھ اس کا میں الخ [2] آصفیہ: طمانچہ [3] آصفیہ: جتایا۔

کبھی کپڑے رنگے میں اس کے اوپر   کبھی پھر بھیس جوگی کا بنایا
کبھی آپ ہی گیا بن کر کے قاصد   کبھی خط ہاتھ قاصد کے بھجایا
کبھی کی جا کے ہمدم کی خوشامد   کبھی محرم کو دردِ دل سنایا
غرض سو سو طرح کے فن میں کاٹی
تب اُس کو مصحفی قابو میں لایا

۴۶

غم کی شدت میں کروں فکر میں شیدائی کیا   جان بھی لیوے گی تو اے شب تنہائی کیا
سن کے آواز مری گھر میں یہ بولا کافر   دیکھیو در پہ کھڑا ہے وہی سودائی کیا
باندھ نکلا تھا جو وہ اپنی کمر سے، اس کو   چشم بد دُور کبھی ہے اُسے اک لاٹی کیا
کر کے گلشن میں خرام اس گل رعنا نے کہا   خاک میں مل گئی اے گل تری رعنائی کیا
گو زن و مرد کریں عشق کا اس کے چرچا   مرد عاشق کو ہے اندیشۂ رسوائی کیا
خون عشاق سے گلگوں ہے تری فندق دست   تجھ کو درکار ہے اب زینت و زیبائی کیا
مصحفی تو جو کرے عشق کا اس کے دعوی
کتنا مقدور ترا اور توانائی کیا!

۴۷

مجھ سے مطلب ہے ترا اے شب تنہائی کیا   جا کہیں بھی تو، مرے در پہ یہ رسوائی کیا
جس کو کہتے ہیں شب ہجر، خبر لیجیو کوئی   جی دھڑکتا ہے مرا، پھر وہی شب آئی کیا
جب سے عاشق ہوا میں اس کا، سمجھتا ہی نہیں   صبر کیا چیز ہے، ہوتی ہے شکیبائی کیا
اُس کے آنے کی خبر سن کے خیابانوں میں   دیکھیو باد صبا پھرتی ہے گھبرائی کیا
خاک سے اٹھ نہیں سکتا ہوں میں جوں نقش قدم   نہیں معلوم ہوئی میری توانائی کیا
حال دل کہنے لگوں ہوں تو مری صورت دیکھ   ہنس کے کہتا ہے وہ: بکتا ہے یہ سودائی کیا؟
مصحفی کے تئیں میں عشق میں پڑا دیکھا کل
تیری تصویر کسی نے اُسے دکھلائی کیا

۴۸

غم ترا دل میں مرے پھر آگ سلگانے لگا   پھر دھواں سا اس سے کچھ اٹھتا نظر آنے لگا
عشق کے صدمے اٹھائے تھے بہت، پر کیا کریں   اب تو ان صدموں سے کچھ جی اپنا گھبرانے لگا
میں ہی کچھ بے صبر و طاقت عشق میں اس کے نہیں   دل بھی اب بے طاقتی سے کام فرمانے لگا
دیکھتے ہی اُس کے، کچھ اس کی یہ حالت ہو گئی   جو مجھے سمجھائے تھا، میں اسے سمجھانے لگا
رقص میں، اس کے سنجافِ سرخ کے عالم کو دیکھ   شعلۂ جوّالہ دامن سے لپٹ جانے لگا
ہو چکی فصلِ گریباں چاکی، اب دستِ جنوں   دھجّیاں کر کے مجھے دامن کی دکھلانے لگا
مُنھ سے نکلا تھا مرے اتنا ہی "کیا اچھی ہے زلف"   سنتے ہی اس بات کے کچھ وہ تو بل کھانے لگا
کیوں نہ پھاڑوں میں گریباں، میرے ہوتے بزم میں   غیر سے بندِ قبا وہ اپنے کھلوانے لگا
مصحفی میں تو نہ لکھتا تھا ولے شوقِ فضول
اس زمیں میں پھر غزل اک مجھ سے لکھوانے لگا

۴۹

حسن اُس کا اب سماں کچھ اور دکھلانے لگا   چاند سا پردے سے وہ مکھڑا نکل آنے لگا[1]
ہاتھ پر دھر ہاتھ، اس کا بیٹھنا ہے کیا[2] غضب   اس ادا سے تو بس اپنا جی ہی پس جانے لگا
لاگ ہے کیا ساتھ عاشق کے، ٹک اس کو دیکھیو   یاں جو جی اُلجھا تو واں وہ زلف سلجھانے لگا
یا وہ عالم تھا کہ کوئی اس سے واقف بھی[3] نہ تھا   یا یہ عالم ہے کہ عالم اُس پہ مر جانے لگا
عشق سے میرے جو گھبرایا تو پھر ناچار ہو   آ کے گھر میرے وہ مجھ کو آپ سمجھانے لگا
اٹھتے اٹھتے اس کے، کل میری یہ حالت ہو گئی   جی جو گھبرایا تو بس پھر میں بھی گھبرانے لگا
دل جو رہتا ہے گریزاں مجھ سے اتنا، کیا سبب   ظاہرا اب کچھ مرے پہلو سے دکھ پانے لگا
کان میں قاصد نے کچھ ایسا ہی آکر کہہ دیا   جس کو سن کر سر میں دیواروں سے ٹکرانے لگا
مجھ کو ساقی کی یہ مجلس میں بہت بھائی ادا
مصحفی کو جام خالی سے جو دھمکانے لگا

---

[1] آصفیہ: نظر آنے لگا [2] نسخۂ الف: کیا ہے غضب [3] آصفیہ: واقف ہی

۵۰

ہاتھ میرے نہ کبھی دامن دلدار لگا — پھر رہے ہے کیونکہ گریباں میں بھلا تار لگا

خاک رہ ہیں جو تری، رحم کر اُن پر ظالم — یوں تو دامن کو نہ ٹھوکرِ رفتار لگا

ہائے عارض پہ ترے جلد نکل آیا خط — بے طرح آیئنۂ حسن کو زنگار لگا

خوں کو تا گوشۂ داماں بھی پہنچنے نہ دیا — بل بے چالاکی، الگ ہو گئے تلوار لگا

جس جگہ بیٹھ گیا کھول کے زلفیں وہ صنم — سودے والوں کا دو رستہ وہیں بازار لگا

جنس حسن اس کی پہ جس دن سے پڑا ہے پردہ — ساتھ دلّال کے پھرتا ہے خریدار لگا

شکوہ کرتا ہوں جو اس کا تو رہے ہے یہی ڈر — کہ کہیں ہووے نہ دشمن پسِ دیوار لگا

ابر تر کو ہے اگر رونے پر اپنے دعویٰ — تو بھی ساون کی جھڑی دیدۂ خوں بار لگا

مصحفیؔ عشق کی ہے گرمیٔ ہنگامہ وہی
کشورِ حسن میں نت رہتا ہے بازار لگا

۵۱

پاس تیرے وہ مرا پیار سے آنا نہ رہا — وہ محبت نہ رہی اور وہ زمانہ نہ رہا

ہے یہ قاروں کے دفینے سے کنایت کہ کبھی — دہر میں پاس بخیلوں کے خزانہ نہ رہا

ہوش کا اس کے میں کشتہ ہوں کہ وہ مایۂ ناز — شب رہا گھر مرے اور غیر نے جانا نہ رہا

کب شبِ وصل وہ آیا کہ مرے اور اس کے[1] — درمیاں میں شبِ ہجراں کا فسانہ نہ رہا

ہو کے ناچار کہا، "میں نہیں جاتا" اس کو — پاس سے جب مرے اُٹھنے کا بہانہ نہ رہا

پایا میں زلف بنانے ہی کا مائل تجھ کو — ہائے کب دو دو گھڑی ہاتھ میں شانہ نہ رہا

مصحفیؔ کا نہ نشاں پوچھ، کہ مدّت ہوئی میاں
پائنتی گھس گئی تربت کی، سرہانہ نہ رہا

۵۲

کوچے سے ترے دل مجھے جانے نہیں دیتا — اسبابِ سفر یاں سے اُٹھانے نہیں دیتا

---

[1] ۳ مصحفیہ : مرنے اس کے بانے

ہے رشک فلک کو مری اوقات سے یاں تک — غم کھاؤں تو غم بھی مجھے کھانے نہیں دیتا
شانے نے زبس اس کو اجارے میں لیا ہے — زلفوں کو تری ہاتھ لگانے نہیں دیتا
یارب کہ شتاب اس کے اجل سامنے آوے — جو مجھ کو ترے سامنے آنے نہیں دیتا
کہتے ہیں کہ پھر فصلِ گُل آئی ہے چمن میں — کیوں دستِ جنوں دھوم مچانے نہیں دیتا
دشمن ہے وہ یاں تک کہ نسیم اور صبا کو — تربت پہ مری پھول چڑھانے نہیں دیتا
اے مصحفی سمجھائے تو اس دستِ جنوں کو
مجھ سے یہ گریبان سلانے نہیں دیتا

۵۳

قصد کرتا ہوں جو اُس در سے کہیں جانے کا — دل یہ کہتا ہے کہ "تو جا، میں نہیں جانے کا"[1]
آبرو تک بھی جو ہو عشق بتاں میں حاضر — اس کو اندیشہ ہے پھر کیا دل و دیں جانے کا
رات اندھیری ہے، نشانے کا مرے قصد نہ کر — یہ کوئی وقت ہے اے زہرہ جبیں جانے کا
چین میں زلف کے ہم کو تو نظر آئی شام — چین کو جائے جسے شوق ہو چیں جانے کا
بے اثر واں سے کئی بار پھری، سوئے فلک — تو تو اب قصد نہ کر آہِ حزیں جانے کا
کیا رہے[2] چین سے ہم خاک کہ دنیا میں ہمیں — غم رہا تا نفسِ بازپسیں، جانے کا
رہ گیا نالہ مرا کیوں فلکِ اوّل پر — تھا گھمنڈ اس کو تو تا عرشِ بریں جانے کا
تجھ سے ناچار ہیں اے مرگ وگرنہ ہم تو — قصد کرتے نہ کبھی زیرِ زمیں جانے کا
مصحفی آئے تھے ہستی میں عدم سے جو یار
پھر ارادہ کیے بیٹھے ہیں وہیں جانے کا

۵۴

دمِ آخر ہے یہ، تجھ کو ہے روا مل جانا — بر سرِ راہ ہیں ہم، ہم سے ذرا مل جانا
سر کو رکھ زانو پہ روتا ہوں میں، جب آئے ہے یاد — چوری چوری وہ ترا چھپکے سے[3] آ، مل جانا
ہم اسیرانِ قفس سے بھی ذرا بہرِ خدا — باغ کو جائے تو اے بادِ صبا، مل جانا

---

[1] آصفیہ: دل یہ کہتا ہے: تو جا، میں تو نہیں جانے کا۔ [2] آصفیہ: کیا رہیں [3] آصفیہ: وہ ترا پیار سے الخ

کیا گلہ تجھ سے کریں ہائے ہم اس چاہت پر[1] — ساتھ غیروں کے مناسب ہے ترا مل جانا ؟
نہیں کچھ دور گیا قافلہ یاروں کا ابھی — جا کے اے دل لبِ ہر راہِ فنا[2] مل جانا
تھی گلے لگنے کی تیرے جنھیں حسرت ان کو — تیرے خنجر کا میسّر نہ ہوا مل جانا
اس کی لذّت کہوں کیا ہائے وہ اک نسل کے تئیں — ہجر کے بعد جو دیتا ہے مزا مل جانا
ہم بھی مشتاق ہیں مُدّت سے تمھارے صاحب — اس طرف آؤ تو ہم سے بھی بھلا مل جانا
مصحفی عالمِ رنجش کا مزا رکھتا ہے
روٹھنا اس کا مرا ہو کے خفا مل جانا

۵۵

جاؤ اُس کو، میں، تو اک اک سے جدا مل جانا — یارو تم ہم سے بھی از بہرِ خدا مل جانا
ہم نے باندھا ہے سرِ راہ پہ تیری تکیہ — جی میں آوے تو فقیروں سے ذرا مل جانا
کیا بُرا کام کیا تو نے یہ ظالم، تجھ کو — میرے دشمن سے مناسب تو نہ تھا مل جانا
قسمت اس کوچے میں پامال کرے ہے تو کرے — خاک میں ہم کو ہے اے بادِ صبا مل جانا
ہاتھ قاتل کا مرے خون سے بھر جائے تو پھر — رنگ سے اس کے تو اے رنگِ حنا مل جانا
اپنی قسمت کی قسم کھائیے، ہم کو اس کا — عید کے دن بھی میسّر نہ ہوا مل جانا
سچ تو یہ ہے، نہیں قسمت میں ہر اک بسمل کی — زخمِ شمشیر سے قاتل کے مزا مل جانا
خواہشِ وصل میں خلق اس کی پڑی پھرتی ہے
مصحفی اس سے کچھ آسان ہے کیا مل جانا ؟

۵۶

نہ مرے دل کو گرفتار کرو تم اپنا — جاؤ جی اور کوئی یار کرو تم اپنا
ہر گھڑی پاس بلاؤ نہ مجھے جانے دو — کہیں موقوف بھی یہ پیار کرو تم اپنا
یوں جو چاہو تو چھپا لو کبھی مکھڑا ہم سے — اک نہ زلف نہ رخسار[3] کرو تم اپنا
پاس اس کے جو میں جاتا ہوں تو کہتا ہے یہی — مدعا بھی تو کچھ اظہار کرو تم اپنا

---

[1] نسخہ الف و رامپور ۱ : ہم اس جانب پر [2] نسخہ الف : بہ سرِ راہ ذرا
[3] نسخہ الف : ...دل جو چاہو تو چھپاؤ کبھی مکھڑا اپنا لیک زلفوں میں نہ رخسار کرو تم اپنا

دل صد چاک مرا گل سے تو کچھ کم بھی نہیں — زیب دے، گر گلِ دستار کرو تم اپنا
مجھ کو رونا ہے تمھارا، مجھے کیا روتے ہو — فکر اے دیدۂ خوں بار، کرو تم اپنا

یوں ہی اک روز میاں مصحفی گھل جاؤ گے
کچھ علاجِ دلِ بیمار کرو تم اپنا

۵۷

رہتا ہوں تجھے دیکھ کے میں ہاتھ ہی ملتا — اے وائے کروں کیا، مرا بس کچھ نہیں چلتا
اُچھلا نہ یہ دل چاہ زنخداں سے صد افسوس — ڈوبا ہوا دریا کا جو ہوتا تو اُچھلتا
لایا در قاضی سے میں شب دخترِ رز کو — مستی میں غضب تھا جو مرا پانو پھسلتا
انداز سے خالی نہیں یہ بات کہ گھر کو — میں تجھ سے کہوں چل، تو کہے: میں نہیں چلتا

شب مصحفی بیٹھا تھا بھرا، ہم نے نہ چھیڑا
اس ڈر سے، کہ کیا جانے وہ کیا زہر اُگلتا

۵۸

تو جاتے سر رہ میں جس کو کہ نظر آیا — وہ رفتہ دل اے ظالم پھر اپنے نہ گھر آیا
پھر آنکھوں کے آگے کچھ پردہ سا نظر آیا — کوئی لختِ جگر شاید نوک مژہ پر آیا
کیا جانے کرے گی کیا، یہ کم نگہی تیری — جوں شیشۂ مے ساقی، دل اپنا تو بھر آیا
اس گرمی سے روئے ہم، یعنی کہ شب آنکھوں میں — پرکالۂ آتش تھا جو لختِ جگر آیا
خوں ریزی و جلّادی، بے دردی و بیرحمی — سب کام کیے تو نے، پر لطف نہ کر آیا
بے وجہ نہیں تیرا ایدھر سے گذر کرنا — کہیں رہ نہیں بھولا ہو، تو آج کدھر آیا
تکلیف نہیں دیتا میں آپ ہی اسے ورنہ — نالے کو مرے اکثر پیغام اثر آیا
واں بسکہ عزیزوں پہ تلوار برستی تھی — اس کُوچے سے جو آیا وہ خون میں تر آیا

اے مصحفی پیری[1] میں گھر بیٹھے نہیں بنتی
اُٹھ صبح ہوئی روشن اور وقت سفر آیا

---

[1] نسخۂ الف و رامپور ن ۱ : پردے میں یوں بیٹھے نہیں رہتے۔

۵۹

دنیا میں جب تلک کہ میں اندوہ گیں رہا
دل غم سے اور دل سے مرے غم قریں رہا

آئینہ بن کے گرمیں گیا اس کے روبرو
تو بھی تو میری شکل سے چیں بر جبیں رہا

چلتا، تو چاہے دیتا گریبان کو کر رفو
اب ہاتھ اپنے کام سے اے ہم نشیں رہا

گو گردش فلک نے ہے آوارہ کر دیا
مت جانو تم کہ اُس کا تعشّق نہیں رہا

اک بار پھر بھی یار کے کوچے میں مصحفی
آوے گا قصد کر کے، جو جیتا کہیں رہا

۶۰

رونے سے کام بسکہ شب اے ہم نشیں رہا
آنکھوں پہ کھینچتا میں سر آستیں رہا

مت میرے رنگ زرد کا چرچا کرو کہ یاں
رنگ ایک سا ہمیشہ کسی کا نہیں رہا

چین کمند زلف ہوئی وا نہ ایک دن
بھر عمر اس کے شوق میں آہوے چیں رہا

ہم دم، جو دیکھتا ہوں تو پہلو میں دل نہیں
بیٹھا تھا اس کے پاس، مرا دل وہیں رہا

نازک مزاج تھا میں بہت، اس چمن کے بیچ
جب تک رہا تو خندۂ گل سے حزیں رہا

آخر کو ہو کے لالہ اُگا نو بہار میں
خونِ شہید عشق نہ زیر زمیں رہا

ہرگز ہوا نہ کام مرا ایک دن تمام
میں نیم کشتۂ نگہ شرمگیں رہا

دی جاں میں ایسے ہوش سے اپنی کہ خلق کو
جینے کا میرے تا دم آخر یقیں رہا

یاران گرم رو تو سب آگے نکل گئے
اُن سے میں تنگ قافلہ پیچھے کہیں رہا

رکھوں میں روک کیوں کے، دل اپنے کو مصحفی
کہنے میں میرے[1] اب تو مرا دل نہیں رہا

۶۱

ہے یہ دل دیوانہ تو پروانہ پری کا
کہتے ہیں اسے اس لیے دیوانہ پری کا

نکلے ہے نزاکت دل صد چاک سے میرے
از بسکہ کبھی روز دل یہ تھا شانہ پری کا

---

[1] آصفیہ: میرے کہے میں الخ

کیا لے کے کرے حورِ بہشتی کو وہ، زاہد
طالع نے کیا ہو جسے ہم خانہ پری کا

دیکھ آیا ہوں اک طفل پری زاد کو یارو
اس شب تو سناؤ کوئی افسانہ پری کا

اے چشم نہ دوں گا میں تجھے اشک کو اپنے
تعویذ ہے یہ گوہرِ یک دانہ، پری کا

مستی سے تری چشم کے ہوتی ہے مقابل
معمور ہوا چاہے ہے پیمانہ پری کا

بد بھی تو نہیں، کیجیے گر وقفہ جہاں میں
عالم تو رکھے ہے یہ صنم خانہ پری کا

دیکھے جو کوئی مصحفی دیوان کو تیرے[1]
ہم حور کا قصّہ ہے ہم افسانہ پری کا

۶۲

ہر دم ہے تیرے حسن کا حیران دوسرا
زلفوں کا بھی کھڑا ہے پریشان دوسرا

ٹوٹے تھے اس کے تیر جو سینے میں، اب تلک
پیکاں کے بعد نکلے ہے پیکان دوسرا

اک جیب تھا، سو نذر کیا تیری، اے جنوں
لاؤں کہاں سے اب میں گریبان دوسرا

گریہ کو میرے دیکھ کے کہتی ہے ایک خلق
آیا ہے یہ زمین پہ طوفان دوسرا

تو ہے وہ بے بدل کہ تری شکل کا صنم،
پیدا کیا خدا نے نہ انسان دوسرا

عاشق تو یوں ہزار ترے ہوویں گے ولے
مجھ سا ملے گا تجھ کو نہ اے جان دوسرا

اشک آیا چشم خانہ میں یوں لختِ دل لیے
مہمان کے ساتھ جیسے ہو مہمان دوسرا

اک بوسہ لے کے لب کا ترے، کب ٹلوں ہوں میں
جب تک کہ لوں نہ تجھ سے مری جان دوسرا

مدّت ہوئی کہ ایک تو دیوان میں کہہ چکا
اے مصحفی ہوا ہے یہ دیوان دوسرا

۶۳

تم بھی آؤ گے مرے گھر جو صنم کیا ہوگا
مجھ پر اک رات کروگے جو کرم کیا ہوگا

ایک عالم نے کیا ہے سفر ملک عدم
ہم بھی جاویں گے اگر سوئے عدم کیا ہوگا

دم رخصت ہے مرا، آج مری بالیں پر
تم اگر وقفہ کروگے کوئی دم کیا ہوگا

دیکھ اس چاک گریباں کو تو یہ کہتی ہے صبح
جس کا سینہ ہے یہ کچھ، اس کا شکم کیا ہوگا

[1] آصفیہ: میرے

چین ہو جائے گا دل کو مرے، از رہِ کرم — میری آنکھوں پہ رکھو گے جو قدم کیا ہوگا
صحبتِ غیر کا انکار تو کرتے ہو و لے — کھاؤ گے تم جو مرے سر کی قسم کیا ہوگا
شانہ اک عمر سے کرتا ہے دو وقتی خدمت — زلف بھی اس سے اگر ہووے گی خم کیا ہوگا
ابھی آغازِ محبت ہے، کچھ اس کا انجام — تجھ کو معلوم ہے اے دیدۂ نم کیا ہوگا

مصحفیؔ وصل میں اس کے جو موا جاتا ہو
اُس پہ ایّامِ جُدائی میں ستم کیا ہوگا

۶۴

کرتا تھا کہیں وصف میں اس غنچہ دہن کا — بلبل نے اڑایا وو ہیں اندازِ سخن کا
ایسا نہ خلل کیجو کہیں اے دلِ بے تاب — پھاہا نہ سرک جائے مرے داغِ کہن کا
دریا میں یہ لہروں کا تلاطم نہیں دیکھا — رخسار پہ عالم ہے جو زلفوں کی شکن کا
مہندی کو لگا کر وہ بتِ شوخ گیا تھا — کیا جانیے پیدا ہوئے گا کیا رنگ چمن کا
ہر موج دکھاوے شبِ مہتاب کا عالم — دریا میں پڑے عکس جو[1] اس گورے بدن کا
کس زلفِ سیہ فام کے آئی ہے مقابل — ہے شمع کے چہرے پہ اثر چاند گہن کا
اُس ساعتِ بد نکلے وطن سے کہ پلٹ کر — منھ ہم نے نہ دیکھا کبھی پھر صبحِ وطن کا
اے شمع خبردار ہو، یہ مجلسِ مے ہے — ڈرتا ہوں کہ رپٹے نہ کہیں پانو لگن کا

اے مصحفیؔ سنتے ہیں وہاں قدرِ سخن ہے
بہتر تو ہے گر تو بھی کرے قصدِ دکن کا

۶۵

کسی جنگل کے گل بوٹے سے جی میرا[2] بہل جاتا — ترے ہاتھوں سے عاجز ہوں نہیں تو میں نکل جاتا
نہ پائی دسترس قاتل نے اتنی ورنہ وہ اک دن — ہماری خاک پہ آ کر کفِ افسوس مل جاتا
لگی اے شمع، آتش جس طرح تیرے گریباں کو — مزا ہوتا اگر فانوس کا دامن بھی جل جاتا
نہ پگھلا دل ترا گرمی سے میری آہ کی ظالم — گر اس دل کی جگہ پتھر بھی ہوتا، تو پگھل جاتا
مزاج اُس کا سیہ پوشی پہ گر آتا محرم میں — تو میرا ذکر کیا ہے، رنگ عالم کا بدل جاتا

---

[1] آصفیہ: گر اس
[2] آصفیہ: میرا جی

نہ آئی موت بھی ہم کو تو[1] ایام جدائی ہیں — جو آئے روز کے یہ مرنے جینے کا خلل جاتا
صف مژگاں کے سنمکھ میں ثبات دل کا بندہ ہوں — اگر اس معرکے میں کوہ بھی ہوتا تو ٹل جاتا
نہ پوچھا یار نے مستی میں میرا حال دل ورنہ — مرے منھ سے خدا جانے کہ اس دم کیا نکل جاتا
فراق اس کی گلی کا مصحفی کو زار رکھتا ہے
جو واں یہ خستہ جاں رہتا تو بارے ٹک سنبھل جاتا

۶۶

چاہنا یوں نہ دل نشیں ہوگا — جان جاوے گی تب یقیں ہوگا
میرے پہلو میں اے دل بے تاب — تجھ کو آرام بھی کہیں ہوگا
سنگ دل کا مرے بھی دل کبھی نرم — تجھ سے اے آہ آتشیں ہوگا
جب کہ ہم بزم سے اٹھ آویں گے — غیر واں کیوں نہ ہم نشیں ہوگا
کیونکہ دیکھیں گے ہم ان آنکھوں سے — کہ تو غیروں پہ خشمگیں ہوگا
سوچ رہتا ہے اب یہی دن رات — مہرباں کب وہ مہ جبیں ہوگا
جس زمیں سے یہ لالہ اگتا ہے — خوں کسی کا تہ زمیں ہوگا
پاک نظروں سے تجھ کو دیکھے گا — کوئی مجھ سا جو پاک بیں ہوگا
تیغ رکھ دی نہ، کیا کسی کا کام — تجھ سے اے طفل نازنیں ہوگا
ایک دن اشک خوں کے ہاتھوں سے — سرخ ہر تار آستیں ہوگا
مار سمجھا میں جس کو، سر پہ مرے — سایۂ زلف عنبریں ہوگا
اے جرس مجھ کو نالہ یاد نہ دے — ورنہ تو اور بھی حزیں ہوگا
مصحفی گر یہ دل ہے تو ہم سے
کارِ دنیا نہ کارِ دیں ہوگا

۶۷

ہائے اس کا ٹھمک کے اٹھ جانا — جیسے بجلی چمک کے اٹھ جانا
قہر ہے یہ کہ میرے پہلو سے — اندک اندک سرک کے اٹھ جانا

---
[1] آصفیہ: کیا کہیے ایام جدائی ہیں

بیٹھنا خاک پر مری، دو ہیں
اس سے دامن جھٹک کے اُٹھ جانا

یہی اک بات تم کو آتی ہے
رُوٹھنا اور بک کے اُٹھ جانا

مصحفی در پہ اس کے جانا رات
صبح کو سر پٹک کے اٹھ جانا

۶۸

اس دمِ سرد سے خطرہ نہ اگر کیجیے گا
نالۂ گرم سے للہ حذر کیجیے گا

اب کی آئے جو شبِ وصل تو اس شب کے تئیں
شمع کی طرح سے رو رو کے سحر کیجیے گا

کیا شتابی ہے، ٹھہر، ہم بھی تو چلتے ہیں نسیم
رہ کے اس کوچے میں کیا خاک بسر کیجیے گا

کون کہتا ہے کہ تم زلف کو شانہ نہ کرو
پر مرے حالِ پریشاں پہ نظر کیجیے گا

کیوں نہ آگو ہی سب اسباب بہم کر رکھیں
آخر اک روز تو دنیا سے سفر کیجیے گا

ہیں تو گذرا ہی، پر اتنی سی وصیت ہے مری
گاہ گاہے مری تربت پہ گذر کیجیے گا

مصحفی منزلِ ہستی نہیں رہنے کی جگہ
اس خرابے میں مری جاں نہ گھر کیجیے گا

۶۹

ابنِ مریم آسماں کا، میں زمیں کا ہو رہا
جو کوئی ٹھہرا کہیں، بس وہ وہیں کا ہو رہا

بسکہ میں رکھا کیا شب دیدۂ خوں بار پر
خوں کا ساغر، حلقہ میری آستیں کا ہو رہا

تھی دنی جس کی طبیعت اس نے کی دنیا کی میل
اہلِ تقویٰ جو کہ تھا سو اہلِ دیں کا ہو رہا

جب تلک آوے ہی آوے محملِ لیلیٰ اُدھر
کام اتنے ہی میں اس صحرا نشیں کا ہو رہا

مصحفی کی پھر نہ آئی اُس کے کوچے سے خبر
جا کے بندہ اس کی زلفِ عنبریں کا ہو رہا

۷۰

جفا و جور نت کی، اب تو یہ دل سہہ نہیں سکتا
و گر چاہے کہ تجھ بن رہ سکے تو رہ نہیں سکتا

کرے ہے غیر سے باتیں وہ میرے روبرو لیکن
مروت کے سبب اک بات بھی میں کہہ نہیں سکتا

پھپھولا سا مرا دل پک رہا ہے تیرے ہاتھوں سے
جو یہ چاہے کہ پھوٹے اور بھی تو بہہ نہیں سکتا

عبث ہر بار تو آئینہ میرے مُنھ پہ رکھتا ہے
میں ہوں حیران تیرا، رشک مجھ کو رہ نہیں سکتا

ہزار احسنت تیری طبع کو اے مصحفی، سچ ہے
غزل ان قافیوں میں تجھ سوا کوئی کہہ نہیں سکتا

۷۱

جو تو اے مصحفی راتوں کو اس شدت سے رووے گا
تو میری جان پھر کیونکے[۱] کوئی ہمسایہ سووے گا

مرے رونے کا عالم دیکھ کے کہتے ہیں یوں ہر دم
سرک کر رو یہاں سے، کیا کسی کا گھر ڈبووے گا

جو ناگہ میان سے نکلی وہ تیغ آب دار اس کی
تو میں کیا، خضر اپنی زندگی سے ہاتھ دھووے گا

تو اے قاصد مرے دل کو بھی اپنے ساتھ لیتا جا
نہیں تو مفت میں رو رو یہ اپنی جان کھووے گا

خیال زلف میں اس کے نہ قصد گریہ کر اے دل
اندھیری رات میں تو کس طرح موتی پرووے گا

نہ جاوے گا یہ تیرا داغ احساں روز محشر تک
مری تربت پہ تو اے باغباں گر لالہ بووے گا

نہ مرنے پر مرا اتنا مصحفی وہ دن بھی آتا ہے
کہ سب ہوویں گے عالم میں اور اک دن تو نہ ہووے گا

۷۲

ہوا ہے دشمن جاں بسکہ باغباں میرا
چمن میں رہنے نہیں دیتا آشیاں میرا

سبب ملال کا اپنے میں کیا بتاؤں تمھیں
گیا ہے رُوٹھ کئی دن سے مہرباں میرا

گلہ یہ تم سے ہے مجھ کو کہ اس محبت میں
یہ رنگ تم سے ہوا چشم خوں فشاں میرا

جو لے چلے ہو مرے دل کو تم، تو رکھیو عزیز
کہ شکل قبلہ نما ہے یہ عطرداں میرا

تمام عمر رکھا اس نے مجھ کو چکر میں
کہاں کا دشمن جاں تھا یہ آسماں میرا

چمن میں ہوں میں ولیکن خموش بیٹھا ہوں
کہ اس چمن میں نہیں کوئی ہم زباں میرا

ہوئے ہو کاہے کو تم اپنی جان کے دشمن
نہ اس کے آگے کرو ذکر دوستاں میرا

پکڑ کے گوشۂ داماں کو اس کے کھینچ رکھوں
میں خاکِ رہ ہوں، یہ مقدور ہے کہاں میرا

۱؎ آصفیہ: تو میری جان پھر کیوں کر الخ۔

عجب نہیں جو غزل دوسری میں لکھ جاؤں
کہ مصحفی ہے قلم اس گھڑی رواں میرا

۷۳

کسو بھی[1] طرح گذارا نہیں جہاں میرا — ذرا تو دیکھیو اٹکا ہے دل کہاں میرا
میں حسرتیں لیے ازبس جہاں سے جاتا تھا — جنازہ دوش پہ یاروں کے تھا گراں میرا
لپیٹ منھ کو[2] پڑا گھر میں گریہ کرتا ہوں — کہ آشکار نہ ہووے غم نہاں میرا
جگہ سے ہل نہیں سکتا ہے، کیا علاج کروں — برنگ نقش قدم، جسم ناتواں میرا
جو کچھ کہوں بھی میں تجھ کو تو تو برا مت مان — کہ میں تو صاف ہوں، پر دل ہے بدگماں میرا
لگی تھی آگ گلستاں کو، اور مرغ چمن — کہے تھا یہ کہ جلا آج آشیاں میرا
فراقِ موکمراں سے گھٹا ہوں میں یاں تک — کہ شکلِ نالِ قلم ہے ہر استخواں میرا
تری گلی میں مجھے قتل اگر کریں دشمن — عجب نہیں جو نہ ہو واں سے خوں رواں میرا
ترے کہے سے چلا میں تو، پھر تو ڈھب پاکر — سلام تو اُسے کہہ دیجیو پاسباں میرا
کل اس کی بزم میں مذکور شعر ہوتا تھا ق — کچھ اس میں آ جو گیا ذکر درمیاں میرا
لگا یہ کہنے کہ ہاں مصحفی کو لاؤ شتاب
کہ ایک عمر سے ہے وہ تو مدح خواں میرا

۷۴

زلفیں دکھا کے اُس نے عالم کو مار ڈالا — کس روز تیغ کھینچی، کب نیمچہ سنبھالا
ہیں کیا مناسب اعضا، گویا کہ اپنے ہاتھوں — صنعت گر ازل نے سانچے میں اس کو ڈھالا
زلفوں کے حلقے خالی کیوں کر نہ ہوں کہ اب ہے — گرداوری میں دل کی کانوں کا اس کے بالا
دیکھا ہے میں نے کس کو مہندی کے ہاتھ دھوتے — جو چشم سے بہے ہے میری لہو کا نالا
واللہ گل فروشی وہ اپنی بھول جاوے — سینے کے داغ میرے جو دیکھے پھول والا
میرا مزار تھا واں، تم یاد رکھیو اس نے — رستے میں چلتے چلتے دامن جہاں سنبھالا

---

[1] ن ۲ : کسو ہی طرح   [2] آصفیہ : لپیٹے منھ کو آخ

ہر اک ورق پہ اس کے تصویر حسن کی ہے
دیوان مصحفی بھی گویا ہے راگ مالا

۷۵

بلبل خوش صفیر ہوں گلشن روزگار کا
کچھ میں نشید خواں نہیں، زمزمۂ بہار کا

وعدہ کیا جو تو نے شب، ملنے کا اپنے وقت صبح
وعدے پہ تیرے دل چلا صبح تک انتظار کا

سلسلہ اک نظر پڑا موج ہوا کے پاؤں میں
پیچ جو کھل گیا کبھی، سنبل تابدار کا

ہوں تو غبار راہ میں، لیک بہ وقت سرکشی
اوج ہوا پہ پھیلنا دیکھ مرے غبار کا

لالہ کا تختہ ایک جا، دیویں گے ہم تجھے دکھا
پردہ اگر الٹ گیا سینۂ داغ دار کا

ہوں وہ بخوں تپیدہ صید، جس کی زباں سے وقت ذبح
شکر ادا نہ ہو سکا خنجر آب دار کا

اب تو پیالہ ہاتھ سے رکھ کہیں اے گل ایک دم
رنگ معصفری ہوا نرگسِ پُر خمار کا

دیتا ہے بوسہ تو میاں دے بھی، وگرنہ میں کہاں
آج لبوں سے وعدہ ہے جان امیدوار کا

لالہ ہوا برنگ خاک، رنگِ شفق بر آسماں
خون کہاں کہاں گرا، زخمِ دل فگار کا[۱]

سر قدوں کے پاؤں کی یوہیں لگیں جو ٹھوکریں
خاک رہے گا مجتمع ڈھیر مرے مزار کا

تیغ لیے کھڑے ہو کیوں ہاتھ میں اب میاں علم
کام تو ہو چکا تمام مصحفی نزار کا

۷۶

ٹھکانا اک جگہ ہوتا نہیں اس غم کے مارے کا
یہ گردش طالعوں کی پھیر ہے گویا ستارے کا

خدا جانے پڑی ہے آنکھ واں کس بے محابا کی
کئی دن سے جو روزن بند ہے اُس کے نظارے کا

دل اپنا اک نگاہ ناز پر ہم تم کو دیتے ہیں
نہ جو کو لے چلو اس کو کہ یہ سودا ہے وارے کا

کہو ہو یک نگہ تم قیمت جان و دل و دیدہ
نہیں میں نے سنا ایسا کہیں سودا اجارے کا

شبِ مہتاب میں جمنا کی لہروں کا سماں یوں تھا
کہ جیسے موج زن پیشِ نظر دریا ہو پارے کا

فراقِ دہلی سے روتا ہوں میں جب یاد آتا ہے
وہ پھرنا آب جو کا اور وہ عالم ہزارے کا

---

[۱] نسخہ الف : زخم جگر فگار

غلط ہے عاشقی سے مصحفی کو متہم کرنا
نہیں مذکور ان باتوں میں ہرگز اس بچارے کا

۷۷

دامن اس شوخ نے کھینچا جو جھٹک کر اپنا
پھاڑ ڈالا میں گریباں سراسر اپنا

جو کوئی آوے ہے ملنے کو وہ پھر جاتا ہے
سچ تو یہ ہے کہ نہیں وقت مقرر اپنا

آرزو میں ترے آنے کی ہم اے وعدہ خلاف
صبح تک بند نہیں کرتے کبھو در اپنا

مثل سائے کے ہیں پیچھے پھرا اس کے، جس نے[1]
اپنے سائے کو دکھایا نہ کبھی گھر اپنا

باغ میں دیکھ خرامش کی ترے رنگینی
فرش کرتا ہے میاں مور بھی شہپر اپنا

خون بسمل سے ہے اس ساعد نازک کی بہار
تم نے کیوں پھینک دیا ہاتھ سے خنجر اپنا

تیرے کوچے میں اسے ہم تو نہ جانے دیویں
زور چلتا نہیں افسوس کہ دل پر اپنا

دوست رکھتی ہے جریدہ کے تئیں راہ عدم
چھوڑ جاتے ہیں شہاں تب تو یہ لشکر اپنا

مصحفی گرچہ خفا ہم سے وہ رہتا ہے ولے
ذکر آ جائے ہے اس بزم میں اکثر اپنا

۷۸

ہے آنسوؤں سے غوغا ان پر کبوتروں کا
مژگاں ہیں یہ کہ یارب ٹھاٹھر کبوتروں کا

صیاد کی گلی ہے وہ کوچہ کیا کہ جس میں
سر خاک پر پڑا ہے اکثر کبوتروں کا

جو ہیں فرشتہ طینت، عالی مقام ہیں وہ
بام حرم پر دیکھا میں گھر کبوتروں کا

اہل دول کی خاطر یہ مشغلے ہیں سارے
کرتے ہیں شوق ناحق، بے زر کبوتروں کا

اک غول ہے ادھر کو بام ہوا پہ رقصاں
اک ساتھ اڑ رہا ہے اودھر کبوتروں کا

ہے صید میری اس کی، انجام دیکھیں کیا ہو
امڈا ہے دو طرف سے لشکر کبوتروں کا

جانا گلی میں اس کی، عاشق کا نامہ لے کر،
یہ کام ہے عزیزاں، بے سر کبوتروں کا

اک پر بھی اس گلی سے اے مصحفی نہ آیا
ناحق کو خوں لیا میں سر پر کبوتروں کا

---

[1] آصفیہ: پھرا پیچھے ہیں

٧٩

اشکوں سے میرے لختِ جگر دور رہ گیا — اس قافلے کے پیچھے یہ رنجور رہ گیا
آئے نہ تم کرم سے کبھی گھر مرے میاں — شکوہ یہ تم سے تا بہ لبِ گور رہ گیا
میں جو کہا کہ بل بے تری زلف کی اکڑ — غصّے سے کچھ وہ میری طرف گھور رہ گیا
گردن تک آکے پھر گئی کل اس کی آبِ تیغ — پیمانہ ہو کے عمر کا معمور رہ گیا
میں نے کہا تھا: اب مجھے مقدورِ صبر ہے — بولا یہ اک ادا سے کہ مقدور رہ گیا
تقصیرِ کم نگاہیٔ ساقی ہے، اور کیا — اس انجمن میں گر کوئی مخمور رہ گیا
کیا کیا نہ دوستوں کے بھرے زخمِ جاں ستاں — اک داغ دل مرا ہے کہ ناسور رہ گیا
حاتم رہا نہ رستمِ دستاں جہاں کے بیچ — ہمّت کا اُن کی خلق میں مذکور رہ گیا
جب اس میں خون رہا نہ، تو یہ دل کا آبلہ — ہو خشک جیسے دانۂ انگور رہ گیا
کرتا ہے کوئی اتنا تغافل، خدا سے ڈر — مرنے میں میرے کیا بتِ مغرور رہ گیا

دنیا سے دُوں نہ جائے اقامت ہے مصحفیؔ
آیا جو اس سرا میں بدستور رہ گیا

٨٠

غیر کے گھر میں یار رہنے لگا — ہم کو پھر انتظار رہنے لگا
پھر ہوئی تم کو اپنے حسن کی چاہ — آئینہ پھر دوچار رہنے لگا
کیا کسی سے کیا قرار اس نے — دل جو یاں بے قرار رہنے لگا
پھر وہ بُت صاحبِ ارادہ ہوا — پھر کمر میں کٹار رہنے لگا

مصحفیؔ، یعنی میری جانب سے
اس کے دل میں غبار رہنے لگا

٨١

پہلو سے اُٹھ کے شب جو وہ آرامِ جاں گیا — بے اختیار نالہ سوئے آسماں گیا

کنج قفس میں لطف ملا جس کو، وہ اسیر   چھوٹا بھی گر تو پھر نہ سوے آشیاں گیا
اُٹھنے کا قصد شب جو کیا اس نے بزم سے   وو ہیں ہزار جا یہ دل بدگماں گیا
تکلیفِ سیرِ باغ نہ دیجئے[1] ہم کو ہم صفیر   مُدّت ہوئی کہ دل سے وہ شوقِ فغاں[2] گیا
یاراں رفتہ ہم سے مُنھ ایسا[3] چھپا گئے   معلوم بھی ہوا نہ کدھر کارواں گیا
باہم جنھوں میں مہر و مروّت کی رسم تھی   وہ لوگ کیا ہوئے وہ زمانہ کہاں گیا

کیا جانتا تھا میں کہ نہ دیوے گا مصحفی
کیسا سوال بوسہ مرا رائگاں گیا

۸۲

اک حرفِ کن میں جس نے کون و مکاں بنایا   سارے جہاں کا تجھ کو آرام جاں[4] بنایا
بوے محبّت اپنی رکھی خدا نے اس میں   سینے میں آدمی کے دل عطر داں بنایا
اپنی تو اس چمن میں نت عمر یوں ہی گذری   یاں آشیاں بنایا، واں آشیاں بنایا
محنت پہ ٹک نظر کر، صورت گر ازل نے   چالیس دن میں تیرا میم دہاں بنایا
از بسکہ اس سفر میں منزل کو ہم نہ پہنچے   آوارگی نے ہم کو ریگِ رواں بنایا
مغرور کیوں نہ ہووے صنعت پہ اپنی صانع ق کس واسطے، جب اس نے یہ گلستاں بنایا
خونِ جگر سے میرے، گُل کی شبیہ کھینچی   نالے کو میرے لے کر سرو رواں بنایا
آتا ہے مصحفی تو، یہ کس کے زخم کھائے ق تیرِ جفا کا کس نے تجھ کو نشاں بنایا

سو ٹکڑے ہے گریباں، دامن لہو میں تر ہے
یہ رنگ تو نے ظالم اپنا کہاں بنایا

۸۳

ہے یہاں کس کو دماغ انجمن آرائی کا   اپنے رہنے کو مکاں چاہیئے تنہائی کا
باغ میں اُگتے ہیں واں سے گُلِ رعنا اب تک   جس جگہ سایہ پڑا تھا تری رعنائی کا

---

[1] آصفیہ: تکلیف سیر باغ نہ کرا لخ   [2] آصفیہ: ذوقِ فغاں   [3] آصفیہ: مُنھ اپنا
[4] ن ا: جانِ جہاں

رہ زنِ قافلۂ دل ہوئیں جب وہ مژگاں
پہلے اسباب لٹا صبر و شکیبائی کا

ہیں جو حیراں ترے، صورت ہیں مرقّع کی تمام
جن کو باہم نہیں کچھ ربط شناسائی کا

بزم میں شمع ہوئی، شرم سے پانی پانی
شب جو مذکور چلا اس کی خوش اعضائی کا

بات زنہار نہ کچھ منھ سے نکلنے پائی
ہنستے ہنستے ہی میں گل کھل گیا رسوائی کا

شیشۂ دل کو مرے چور کیا جو اس نے
کیا لیا تھا میں بھلا گنبدِ مینائی کا

مصحفی اک غزل اس مردہ زمیں میں لکھ اور
گر تجھے شعر میں دعویٰ ہے مسیحائی کا

۸۴

گرچہ مذکور ہے ہر جا تری رعنائی کا
پر فسانہ نہیں کم میری بھی رسوائی کا

پھول لالے کے نہیں یہ کہ زمیں سے اب تک
جوش مارے ہے پڑا خوں کسی سودائی کا

یار کہتے ہیں مجھے یوں، تو شکیبائی کر
کاش ہوتا مجھے مقدور شکیبائی کا

کیا تماشا ہے کہ آگے سے ترے کوچے کے
قدم اٹھتا نہیں آگے کو تماشائی کا

خونِ عشاق سے نت اُن کو حنائی رکھنا
میں تو کشتہ ہوں ترے ہاتھوں کی زیبائی کا

تو نے جس دن سے تراشا ہے میاں اپنے تئیں
شور عالم میں پڑا ہے تری مرزائی کا

مصحفی چاہے تو لکھ جائے غزل اور بھی تو
میں مُقِر ہوں ترے خامے کی توانائی کا

۸۵

داغ دیکھے تھا کھڑا لالۂ صحرائی کا
زورِ عالم نظر آیا ترے سودائی کا

بھیج دیتا ہے خیال اپنا، عوض اپنے مدام
کس قدر یار کو غم ہے مری تنہائی کا

تو نہ بدنام کہیں ساتھ مرے ہو جاوے
مجھ کو گر غم ہے تو پیارے تری رسوائی کا[1]

عشوہ و ناز و ادا اس کے یہی کہتے ہیں
لے سکے نام تو یاں کوئی شکیبائی کا

یہ بھی کوئی شرم ہے، آنکھوں کو اٹھا کر صاحب
لیجیے مجرا تو ذرا اپنے بھی مجرائی کا

---

[1] نسخۂ الف: مجھ کو غم ہے تو پیارے الخ

مصحفی، ریختہ پہنچا ہے مرا رتبے کو
شور یاں گرنہ ہے مرزا کی بھی مرزائی کا

۸۶

قاصد اس کو سے پھرا یا نہ پھرا ہووے گا ۔ جی دھڑکتا ہے، خدا جانیے کیا ہووے گا
پاے دیوار کفک جادہ نہ تھا یوں تو کبھی ۔ خوں کسی کا ترے کوچے میں بہا ہووے گا
اب کے گر فصل گل آئی تو جنوں کے ہاتھوں ۔ دھجیاں ہو کے گریباں ہوا ہووے گا
فصل گل، فصل خزاں دونوں گئیں[1] اے صیاد ۔ مرغ دل کون سے موسم میں رہا ہووے گا
درہمی وضع سے آج اس کی نکلتی ہے بہت ۔ آرسی میں کہیں منھ دیکھ لیا ہووے گا
بے خبر رنگ حنا میں تو نہ تھی یہ شوخی ۔ خوں کسی کا ترے تلووں سے لگا ہووے گا
میں تو جاتا ہوں موا[2] خجلت رسوائی سے ۔ ہائے کس کس نے مرا قصہ سنا ہووے گا

پوچھ مت حال دل مصحفی خستہ میاں
وہ اگر صاف کہے گا تو خفا ہووے گا

۸۷

دل گرا یا جگر اس دیدۂ گریاں سے چوا ۔ نہیں معلوم کہ شب کیا مری مژگاں سے چوا
اس نے تیر اپنا جو کھینچا مرے پہلو سے بزور ۔ خون تا دیر زمیں پر دل پیکاں سے چوا
دیکھ کر رنگ حنا ہاتھ پہ تیرے قاتل ۔ رشک کے مارے لہو پنجۂ[3] مژگاں سے چوا
اس قدر تشنۂ خوں تھا کہ دم ذبح مرے ۔ ایک قطرہ بھی نہ اس خنجر براں سے چوا
ہم نے ہشیاری سے ہاتھوں[4] پہ لیا اس کے تئیں ۔ قطرۂ مستی میں جو مے کا لب جاناں سے چوا
کیا گریباں کی پوچھو ہو کہ ہم شب اس بن ۔ اس قدر روئے کہ خوں گوشۂ داماں سے چوا[5]
تربت قیس پہ اک دن جو ہوا ان کا گذر ۔ اس قدر روئے کہ خوں چشم غزالاں سے چوا
آگ دی دل کو محبت نے تو گل ریز کی طرح ۔ اشک کے ساتھ ہی اک شعلہ بھی مژگاں سے چوا

---

[1] نسخۂ الف: کٹیں اے صیاد [2] نسخۂ الف: جاتا تھا موا [3] نسخۂ الف: پنجۂ مرجاں
[4] آصفیہ: آنکھوں پہ [5] رامپور ن ا سے یہ شعر غیر حاضر ہے۔

مصحفی میں نے یہ جانا کہ ستارے ٹوٹے
جب عرق یار کے روے عرق افشاں سے چوا

ب

۸۸

دنیا سے اپنے بار کو لدوائیے شتاب
ساز سفر بہم ہو تو اُٹھ جائیے شتاب

ہونٹوں پہ آرہی ہے یہ جاں اضطراب[۱] میں
آنا ہے آپ کو تو کہیں آئیے شتاب

شب تھوڑی رہ گئی ہے، یہ منزل ہے پُرخطر
بارے کجاوے اونٹوں[۲] کے کسوائیے شتاب

پڑنے لگی ہیں پھر تری آنکھیں اِدھر اُدھر
یہ طور ہے بُرا، انھیں سمجھائیے شتاب

دل دے کے آپ کو میں کہاں تک کھڑا رہوں
قیمت جو کچھ کہ دینی ہو، فرمائیے شتاب

ایسا نہ ہو کہ یارو دل آوے کہیں نکل
سینے کا زخم ہے اسے سلوائیے شتاب

مل جائے روز عید تو واللہ دوڑ کر
اب کی گلے سے اس کے لپٹ جائیے شتاب

بیٹھے ہیں ہم بھی آپ کے یاں انتظار میں
تشریف اس طرف بھی کہیں لائیے شتاب

تا دیر کیوں زمیں پہ رہے خون مصحفی
اچھا نہیں، اسے کہیں گڑوائیے شتاب

۸۹

شاید کسو نے پھر اسے برہم کیا ہے اب
ملنا جو اس نے ہم سے بہت کم کیا ہے اب

یوں سر کے بال اس کے پریشاں ہیں تمام
گویا کسی کے مرنے کا ماتم کیا ہے اب

رہ اے مسیح، اس کی تو پھر کیجیو دوا
میں نے علاج دیدۂ پُرنم کیا ہے اب

رکھنا عصا کا شیخ جی تم کو ضرور ہے
پیری نے قد تمھارا بہت خم کیا ہے اب

وہ بند و بست اس کا جو آگے تھا، اُٹھ گیا
جس تس کو بزم وصل کا محرم کیا ہے اب

۱؎ آصفیہ: انتظار میں   ۲؎ اونٹوں پہ ۵۰

آتش کدوں کو آہ مری سرد کر چکی
بل بے گھمنڈ، قصدِ جہنم کیا ہے اب

سو غم بنے، جب تلک کہ نہ تھا وعدہ درمیاں
امید وصل نے مجھے بے غم کیا ہے اب

آوے وہ دم میں کیونکہ کسی کے کہ ان دنوں
واں خصم نے کچھ اور فسوں دم کیا ہے اب

ہے مصحفیؔ غریب۔ تو کس کے شمار میں
تسخیر اس کی زلف نے عالم کیا ہے اب

۹۰

ہم کو دینے لگے تم چھیڑ کے گالی کیا خوب
آپ نے ہم سے بھی یہ چھیڑ نکالی کیا خوب

کیوں نہ سو جان سے صدقے ہوں ترے صانع نے
طرح ترکیب تری سانچے میں ڈھالی کیا خوب

بارے اب تم بھی لگے خون غریباں کرنے
ہاتھ میں تم نے بھی تلوار سنبھالی کیا خوب

تم نے حسن اپنے کو دو چند کیا نام خدا
موتیوں کی بھی لڑی کان میں ڈالی کیا خوب

جب کہ تو اس میں سے جھانکے ہے، ستاروں کی طرح
جگمگاتی ہے ترے غرفے کی جالی کیا خوب

کیجیو ساعد گل خوردہ پہ میرے بھی نگاہ
ہاتھ آئی ہے مرے پھولوں کی ڈالی کیا خوب

آرسی لے کے ذرا تو بھی تو دیکھ اپنے لب
مسّی پر کھلتی ہے یہ پانوں کی لالی کیا خوب

مصحفیؔ واہ، غزالانِ معانی کے تئیں
صید کرتی ہے تری ہمّت عالی کیا خوب

۹۱

بام تک اس کے جو ہوتا گذر نالۂ شب
کچھ نہ کچھ ہم کو بھی آتی خبر نالۂ شب

مر گئے ہم تو دلا نالے ہی کرتے کرتے
ہم نے اک روز نہ دیکھا اثر نالۂ شب

نالہ پرواز میں آتا ہے دعا سے، یعنی
ہیں مرے دست دعا بال و پر نالۂ شب

لے اڑا نالہ مرا مجھ کو فلک پر گویا
تھی مرے ہاتھ میں محکم کمر نالۂ شب

اس کو آسان نہیں آگ پہ رکھنا ظالم
پر کبوتر کا نہ ہووے یہ پر نالۂ شب

راہ نالے کی رفاقت سے تری کٹ جاوے
تو بھی اے آہ جو ہو ہم سفر نالۂ شب

تو بھی آوے جو تماشے کو تو مانند انار
پھول رکھتا ہے ہزاروں شجر نالۂ شب

نالۂ شعلہ فشاں دل سے نہ نکلا ورنہ — تجھ کو اے آہ دکھاتے ہنرِ نالۂ شب
صورتِ تودۂ باروت ہے گردوں اس میں — ہو تماشا جو پڑے ٹک شررِ نالۂ شب
آگ نکلے ہے جو نالوں سے مرے رہتا ہے — میرے ہمسایوں کو ہر شب خطرِ نالۂ شب
صبح دم لختِ جگر کیوں مری پلکوں سے گرے
مصحفی میں نے یہ پایا ثمرِ نالۂ شب

۹۲

کیوں نکلتا سوتے سوتے منھ سے اپنے: یا نصیب — جاگنا راتوں کا ہم کو بھی اگر ہوتا نصیب
جن کی ہے معشوقۂ دنیا بغل میں رات دن — سچ اگر پوچھو تو ہاں وے لوگ ہی ہیں با نصیب
دیکھ کر مجنوں کے طالع کو منجم نے کہا — بعد مکتب ہووے گا اس طفل کو صحرا نصیب
کون مانے ہے برا خوباں کے نکتوڑوں سے ہائے — ہووے یا رب مجھ کو ان لوگوں کا نکتوڑا نصیب
ٹوٹے پیالے میں بھی جو دیتا نہیں ساقی شراب — پھوٹ گئے ہیں ایسے میرے یا الٰہی کیا نصیب
قسمت اپنی ہیں تو فرداے قیامت پر ہے صرف — بخت ان کے ہیں جنھیں ہے وعدۂ فردا نصیب
خوش نصیبی کا ہماری جس جگہ مذکور ہے — اس جگہ قسمت کہاں کی اور میاں کس کا نصیب
جن دنوں تھوڑی سی قسمت اپنی تھی[1] اس کی شریک — ہم کو تھا اس بزم میں[2] تہ جرعۂ صہبا نصیب
دین و دنیا سے ہمیں کیا کام ہے اے مصحفی
ہیں جو طالب ان کو ہووے دین اور دنیا نصیب

۹۳

باتیں بنا کے مجھ کو شیدا نہ کیجیے صاحب — رسوا کو بس زیادہ رسوا نہ کیجیے صاحب
گو تیرہ بخت ہوں میں پر میری یہ خوشی ہے — ایک اونگلی مستی کا صرفہ نہ کیجیے صاحب
مجلس میں مدعی کی بن ٹھن کے جائیے، لیک — جا کر کے دیر تک واں بیٹھا نہ کیجیے صاحب
کیا مجھ میں اور تم میں اب کچھ دوئی رہی ہے — جو کیجیے اس کا مجھ سے پردا نہ کیجیے صاحب
کیجیے نظر کرم کی اک ناتواں پر اپنے — گر اس میں بھی زیاں ہو اچھا نہ کیجیے صاحب

۱؎ آصفیہ: اپنی اس کی تھی شریک
۲؎ آصفیہ: یہ جرعۂ صہبا

طرز خرام اپنی ہر ایک کو دکھا کر — کوچہ گلی ہیں فتنہ برپا نہ کیجیے صاحب
آتا ہے رشک مجھ کو، مُنھ اپنا آرسی میں — حیرت[1] بھری نگہ سے دیکھا نہ کیجیے صاحب
جاتا ہوں دم بدم تو جھنجھلا کے بولتا ہے — اتنا بھی میرے گھر میں آیا نہ کیجیے صاحب
جو میں کہوں ہوں: "میری تقصیر؟" تو کہے ہے: — "بس بس سر کیے مجھ کو رسوا نہ کیجیے صاحب!"

میاں مصحفی کہاں ہیں، یہ بات حد بُری ہے
ہر اک سے راز دل کا افشا نہ کیجیے صاحب

۹۴

کس دن گلی سے اس کی پھرا نامہ بر شتاب — کب خوش ہوا میں اور کب آئی خبر شتاب
اب دیر چاہیے ہے اسے جاتے تا فلک — وے دن گئے کہ نالہ کرے تھا اثر شتاب
کھینچی نہ دیر فصل گل آنے تلک دریغ — اب کی برس میں اپنے جھڑے بال و پر شتاب
ایسا نہ ہو کہ آتش دل سینہ پھونک دے — مشکیزہ لے کے پہنچیو اے چشم تر شتاب
کیا امتحاں کرے ہے تو اے داغ غم کہ یاں — جینے کے داعیہ پہ ہے دل سے جگر شتاب
ان پردہ داریوں کے تصدق کسی کی جان — خواہش جو دیکھنا، تو چرانا نظر شتاب

رہنے کا لطف اب نہیں یاں خاک مصحفی
اس منزل خراب سے کیجیے سفر شتاب

۹۵

غیروں سے میاں تیری ملاقات نہیں خوب — کچھ عقل کے نزدیک تو یہ بات نہیں خوب
یوں آنکھیں لڑا جس سے کہ تو چاہے ولیکن[2] — آگے مرے ہر اک سے اشارات نہیں خوب
کیا جانیے کیا سمجھے کوئی ملنے کو صاحب — اتنی بھی تو بندے پہ عنایات نہیں خوب
مت پانو رکھ اے لخت جگر دیدۂ تر میں — کہتے ہیں سفر موسم برسات نہیں خوب
کس سے کہوں ایام کی اپنے میں زبونی — گر سوچ کے دیکھوں ہوں تو دن رات نہیں خوب

---

[1] نسخۂ الف و آصفیہ: حسرت بھری   [2] آصفیہ: یوں آنکھیں ملا جس سے کہ چاہے تو ولیکن

آخر کو خطا پاؤ گے تم، حق میں تمھارے — کرتے ہو جو لچّوں کی مدارت، نہیں خوب
کیوں خوار پھرا کرتے ہو تم اُس کی گلی میں
میاں مصحفی جانے دو یہ اوقات نہیں خوب

۹۶

دن کو تو نہیں کوئی ملاقات کی تقریب — منظور ہو ملنا، تو ہے اک رات کی تقریب
اشکوں کے تئیں خوشۂ انگور بنا کر — ہم بھیجتے، سو واں نہیں سوغات کی تقریب
اے ابرِ کرم کیا ہو جو تو گھر میں ہمارے — رہ جائے کبھو آن کے برسات کی تقریب
اک شب مرے گھر بار کا آیا جو تصوّر — جاں نذر کی اس کی میں مدارت کی تقریب
گالی بھی اگر دیجیے تو مانیں نہ بُرا ہم — پر حال مری ہو جو عنایات کی تقریب
واں کیونکہ اشاروں میں کہوں حال دل اپنا — جس جاگہ نہ ہو دور سے اک بات کی تقریب
سن سن کے مرے ذکر کو کہتا ہے وہ کافر — ہر ایک کرے ہے اُسی بدذات کی تقریب
اے مصحفی سو آنکھیں لگیں دیکھنے، اس سے
نکلی جو کبھی حرف و حکایات کی تقریب

۹۷

جی چلے تیرا تو لے چکھ تو بھی اے مستِ شراب — ہیں مرے لختِ جگر مژگاں پہ ٹکوں کے کباب
یوں ہے اس گورے بدن سے جلوہ گر ہو کا رنگ — دستِ قدرت نے ملایا جیسے میدے میں شہاب
بیچ دریا کے پڑا ہے کس مہِ تاباں کا عکس — شمع سے خالی نہیں جو ایک فانوسِ حباب
بال بکھرے گورے مُنھ پر جیسے سورج کی کرن — زلف کے حلقوں میں عارض، سنبلے میں آفتاب
ہائے کیا کیا صحبتیں رہتی تھیں معشوقوں کے ساتھ — کس قدر حسرت فزا ہے یاد ایّامِ شباب
میں تو کل غش کر گیا تھا دیکھ کر اس گل کا رنگ — اشک نے بارے مرے مُنھ پر ذرا چھڑکا گلاب
ایک دن مرنے کے آگے ہم نے دل اس کو دیا — جوں مسافر وقتِ چلنے کے کرے ہے پا تراب
سر پٹکنا، گریہ کرنا، ہاتھ دے دے مارنا — ہم نے بھی دیکھے ہیں کیا کیا ہجر کی شب کے عذاب
گرچہ تو پاکیزہ گو ہے سربسر پر مصحفی — یہ غزل ہم نے ترے دیوان سے کی ہے[1] انتخاب

---

[1] نسخۂ الف: ہے ندارد

۹۸

یہ حالت ہے کہ دل سینے میں گھبراتا ہے بے موجب　　طبیعت پر تکدّر اپنی آ جاتا ہے بے موجب
نہیں اس کی طرف دیکھوں ہوں، نے کچھ مُنہ سے کہتا ہوں　　مگر محبوب میرا مجھ سے شرماتا ہے بے موجب
مری مجلس میں گر وہ آ کے بیٹھے ہے تو پھر وہ ہیں　　یکایک بیٹھے بیٹھے ہنس کے اٹھ جاتا ہے بے موجب
نہ روزوں کا مہینا ہے نہ یہ ماہ محرّم ہے　　ہمیں وہ طفل بدخو تیغ دکھلاتا ہے بے موجب
جو ہم اک بات کہتے ہیں تو وہ ہیں در جواب اس کے　　ہمارے سر پہ سو سو بات ٹھہراتا ہے بے موجب
ہیں آخر اس گلی سے اُٹھ گیا، وہ اُٹھ کے جاتا ہے　　کسو سے گر کوئی اے یار دکھ پاتا ہے بے موجب
نہ شانے نے چھوا ان کو، نہ واں بادِ صبا پہنچی　　تری زلفوں کا ہر اک بال بل کھاتا ہے بے موجب

کوئی کیا مصحفی سے دردِ دل کا ماجرا پوچھے
کہ آنکھوں میں یہ آنسو اپنی بھر لاتا ہے بے موجب

پ

۹۹

کھل کھلا کر نہ ہنسا کیجیے آپ　　ایسی باتوں سے حیا کیجیے آپ
تم سے ہرگز نہیں کچھ کام ہمیں　　لاکھ پردے میں چھپا کیجیے آپ
کوئی ہو کیونکہ تمھارا شاکر　　نہ مروّت نہ وفا کیجیے آپ
دردِ سر ہو دے ہے گر تیرے تئیں　　سر کہ صندل نہ ملا کیجیے آپ
"چال یہ حق میں تمھارے نہیں خوب　ق　ہر کسی سے نہ ملا کیجیے آپ"
میں تو کہنے کو تمھارے مانا،　　اتنا میرا بھی کہا کیجیے آپ

کیوں میاں مصحفی جاں دیتے ہو[1]
درد اپنے کی دوا کیجیے آپ

---

[1] نسخہ الف : جی دیتے ہو

ت

۱۰۰

البتہ فن عشق میں ہو جس کو مہارت ۔۔۔ سمجھے وہ مرے نامۂ پُر خوں کی عبارت
رستوں میں زن و مرد کے ستھراؤ پڑے ہیں ۔۔۔ اک شہر کیا ہے تری رفتار نے غارت
قاتل، تو وضو کر کے مرے تیغ لگانا ۔۔۔ قربانی کو کہتے ہیں کہ ہے شرط طہارت
آنکھوں کا میں کس شوخ کی کشتہ ہوں جواب تک ۔۔۔ کرتے ہیں غزالاں مری تربت کی زیارت
کیا پوچھتے ہو حادثۂ حضرت دہلی ۔۔۔ واں خاک برابر ہوئیں کیا کیا نہ عمارت
کیا جانے وہ کیا لائے ستم سر پہ ہمارے ۔۔۔ سونپی ہے شہ حسن نے غمزے کو نظارت

جب مصحفی خستہ لگا جاں کو دینے
مرتے ہوئے کی اس نے طرف دل کے اشارت

۱۰۱

ہر چند اس نے میری طرف سے بنائی بات ۔۔۔ قاصد کو اس کے سامنے پر کہہ نہ آئی بات
اس گل کی باغ میں جو صبا نے چلائی بات ۔۔۔ غنچے نے مسکرا کے کہا: "ہم نے پائی بات!"
کہتا تھا یہ کہ دل نہ کسی سے لگائیے ۔۔۔ اک قصہ خواں کی رات مجھے کیا خوش آئی بات
آنے کی تیرے کہہ کے مرا دل تو خوش کیا ۔۔۔ قاصد نے گو کہ اپنی طرف سے بنائی بات
آگے کسی کے بات نہ کہیئے کہ ہے مثل ۔۔۔ ہو جاتی ہے نکلتے ہی مُنھ سے پرائی بات
آہ و فغاں سنے ہے مری، آکے در پہ روز ۔۔۔ پر اپنے مُنھ کی اُس نے نہ ہم کو سنائی بات
مانگا جو میں نے بوسہ تو آنکھیں جھکا دیاں ۔۔۔ اس ڈھب مری زمین پہ اس نے گرائی بات
وہ مجھ سے ان دنوں میں جو کچھ بولتا نہیں ۔۔۔ شاید کسو نے جا کے اُسے کچھ لگائی بات

رتبے کو میرے پہنچے ہے کب کوئی مصحفی
روح القدس کہے ہے مجھے: "سن تو بھائی بات!"

۱۰۲

خدا نے حور و پری کو کب ایسی دی صورت
تری سی پائی[1] کہاں حور اور پری صورت

ہے جس کے شور ملاحت کا لیلیٰ اک شمّہ
سمائی ہے مرے دل میں وہ سانوری صورت

عبث بلاتے ہو تم، مجھ کو کب گوارا ہے
کہ صبح آ کے میں دیکھوں مَلی دَلی صورت

زمانہ خط کا ہے، اب وہ بہار ناز کہاں
کسی زمانے میں اُس گل کی یاں رہتی صورت

وہ مجھ کو دیکھے ہے، میں اس کو دیکھا کرتا ہوں
ہے میری اس کی یہ اب اختلاط کی صورت

سجا نہیں یہ بتاں تم نے سر پہ اک پیچا
پکڑ کے آئی ہے طرزِ ستم گری صورت

تری تو بزم میں ہے ازدحام خلق چلا
کہاں تلک کوئی دیکھے بری بھلی صورت

تمھاری سحر نگاہی ہے اور عالم، لیک
اس آئینے کی بھی رکھتی ہے زفتگی صورت

وہ دن بھی کیا تھے کہ جا کر کے دیکھ آتا تھا
میں اپنی آنکھوں سے اس کی کبھی کبھی صورت

کرے ہے عشق کا دعویٰ میاں اسی مُنھ سے
ٹک آئینے[2] میں تو دیکھ اپنی مصحفی صورت

۱۰۳

منعم تو ہو رہا ہے گرفتار سنگ و خشت
کعبے کو جائیے کیونکہ یہ معمار سنگ و خشت

میرے جنوں کے عہد میں، لڑکوں کے ہاتھ سے
ثابت رہا زمیں پہ نہ آثار سنگ و خشت

دلّی سے پختہ محلوں کے وارث کدھر گئے
اب تک ڈھی پڑی ہیں جو دیوار سنگ و خشت

لعل و گہر کی قدر کو کیا جانتے ہیں وہ
بھر عمر جو رہے ہیں خریدار سنگ و خشت

لڑکوں کی خالی اب نظر آتی ہیں جھولیاں
بس ہم تلک تھی گرمیٔ بازار سنگ و خشت

پکّی عبث بناتے ہو زاہد کی قبر کو
یارو کب اس گھڑے سے اٹھا بار سنگ و خشت

شور جنوں یہی ہے تو دیکھو گے شہر میں
لڑکے پھریں گے ڈھونڈتے انبار سنگ و خشت

جو دیکھتا ہے سینۂ مجروح کو مرے
کہتا ہے: ہے یہ سینہ تو افگار سنگ و خشت

رکھ اک غزل کی اور بنا، گو کہ مصحفی
ہے دامن اس زمیں کا تہِ بار سنگ و خشت

---

[1] آصفیہ: پائے ، [2] نسخہ الف: آرسی

۱۰۴

ہرگز کھلا نہ شیخ پہ اسرارِ سنگ و خشت
کعبے میں وہ رہا پسِ دیوارِ سنگ و خشت

پھڑیاں نہ پتھروں کی، پژاووں کے ہیں نہ ڈھیر
کچھ ان دنوں تو سرد ہے بازارِ سنگ و خشت

پکی عمارتوں کا جنھیں شوق تھا کبھی
اب وہ دبے پڑے ہیں تہ بارِ سنگ و خشت

رستے کے بیچ پھینکیں ہیں بھر بھر کے مشت خاک
طفلانِ شہر مجھ کو سمجھ عارِ سنگ و خشت

سختی سے اب زمانے کی پتھر تلے ہے ہاتھ
اُن کا جو تھے ہمیشہ خریدارِ سنگ و خشت

جاوے کدھر نکل کے کہ طفلانِ حی نے آج
مجنوں کو کر رکھا ہے گرفتارِ سنگ و خشت

دلّی کی وہ عمارتیں آتی ہیں جب کہ یاد
مرتے ہیں ہم بہ حسرتِ[1] دیدارِ سنگ و خشت

محلوں کی واں کے کیا میں کہوں خوب صورتی
دیکھا نہ اس طرح کا کہیں کارِ سنگ و خشت

شورِ جنوں نہ اس سے گیا ہائے مصحفی
یہ سر رہا ہمیشہ طلب گارِ سنگ و خشت

۱۰۵

خواب میں آئے ہے جب اس کی میاں آدھی رات
سوتے سوتے میں کر اٹھتا ہوں فغاں آدھی رات

مانگ کی راہ میں ششدر سا کھڑا ہوں کب کا
نابلد ہوں میں، بھلا جاؤں کہاں آدھی رات

ہے مہِ نیم شبی چہرۂ نورانیٔ یار
اور وہ زلفوں سے ہوتی ہے عیاں آدھی رات

ہیں جو آگاہ دل، ان لوگوں کی سوتے سوتے
آنکھ کھل جاتی ہے، بجتی ہے جہاں آدھی رات

وہی سمجھے گا تری مانگ کا جلوہ جس نے
شبِ مہتاب کا دیکھا ہو سماں آدھی رات

ہاتھ جب زلف و رخِ یار پہ جا ہی نہ سکا
پھر برابر ہے بہار اور خزاں آدھی رات

مصحفی تھا دلِ بیمار کا احوال بتر
دے کے میں خط کیا قاصد کو رواں آدھی رات

۱۰۶

اے زبانِ تیشہ کہہ کچھ کوہ کن کی سرگذشت
یعنی آخر کیا ہوئی اُس بے وطن کی سرگذشت

---

[1] نسخہ الف: بہ حسرتِ دیوار

سر سے اک شعلہ لگا ایسا کہ ساری جل گئی
کچھ نہ پوچھو ہم سے شمعِ انجمن کی سرگذشت

طشتِ آتش تھا لگن جب دن کو لائی تھی وہ رات
شمع کا قصہ کہوں میں یا لگن کی سرگذشت

سر پھنسایا جا انھوں نے دام میں صیاد کے
یہ ہوئی آخر کو مرغانِ چمن کی سرگذشت

مصحفی کہتے ہیں راہِ عشق میں مارا پڑا
کون جانے کیا ہوئی اس[1] بے وطن کی سرگذشت

۱۰۷

میانِ عالمِ مستی اگر ہے سجدہ درست
تو پائے خُم ہی پہ یاں بیشتر ہے سجدہ درست

شہیدِ طرزِ جفا دیر و کعبہ کیا جانے
جھکے وہ تیغ جدھر کو اُدھر ہے سجدہ درست

کہے ہے شیشۂ مے یوں ہر اک سے مجلس میں
کہ اہلِ درد کو با چشمِ تر ہے سجدہ درست

گرا جو پانو پہ قاتل کے کٹ کے سر میرا
کہا یہ اس نے: اس انداز پر ہے سجدہ درست

جو بے بصر ہوں اُدھر روئے نہ کیجیے ورنہ
برآستانۂ اہلِ نظر ہے سجدہ درست

وہ آفتاب جو آوے نکل تو اس کے حضور
خود آفتاب کو وقتِ سحر ہے سجدہ درست

گلی کو یار کی سمجھے ہے اپنا وہ کعبہ
یہ مصحفی سے نہ پوچھو کدھر ہے سجدہ درست

۱۰۸

گلی میں اس کی نہ پوچھو کدھر ہے سجدہ درست
قدم قدم ہمیں واں خاک پر ہے سجدہ درست

جہاں کہ ہو تری ابرو کی شکل پر محراب
وہاں بہ چشمِ تر اہلِ نظر ہے سجدہ درست

نمازِ عشق میں ہرگز نہیں تعینِ وقت
فراغ ہووے تو آٹھوں پہر ہے سجدہ درست

نیاز و عجز کو خلوت کی کچھ نہیں حاجت
حرم میں بھی پسِ دیوار و در ہے سجدہ درست

ہر ایک چشم کو مانندِ مُہر بادامی
ہمارے نامے پر اے نامہ بر ہے سجدہ درست

صراحی اپنی جو گردن ادھر جھکاتی ہے
بطاقِ ابروے ساغر مگر ہے سجدہ درست

جب آستانۂ دل پر سرِ نیاز رکھا
تو مصحفی تجھے کب در بدر ہے سجدہ درست

[1] آصفیہ: کیا ہوئی کیا جانیے الخ

۱۰۹

تھی میرے ہاتھ ہی میں تمھاری کمر تو رات
کچھ تم میں ہم میں[1] فرق نہ تھا اس قدر تو رات

آیا نہ تو ہی[2] ورنہ ترے انتظار میں
تا وقتِ صبح، باز رہا اپنا در تو رات

کیا کہیئے اس کے دست حنائی کی یاد میں
پلکوں پہ آ رہا تھا ہمارا جگر تو رات

آیا تھا بے حواس وہ سر کھولے بام پر
نالے نے میرے اتنا کیا تھا اثر تو رات

ہرجائی میرے، یہ بھی کوئی اختلاط تھا
میں تیری جستجو میں پھرا دربدر تو رات

دامن میں کیوں کہ اشک مسلسل نہ اب رہے
پلکوں کے ہاتھ میں تھی یہ سلکِ گہر تو رات

لیتا تھا بے خبر ترے بوسے میں دم بہ دم
اس بات کی تجھے بھی نہ تھی کچھ خبر تو رات

گر شانہ چھیڑ کر نہ چھڑاوے تو قہر تھا
باہم لپٹ گئے تھے وہ زلف و کمر تو رات

انگڑائیاں نہ لے کہیں اب اٹھ کے گھر کو چل
سنتا ہے مصحفی تو، بجی دو پہر تو رات

۱۱۰

ہائے اس کے وہ[3] ننھے ننھے ہات
ہائے اس کی[4] وہ گوری گوری گات

شربت وصل جس کو کہتے ہیں
حق میں عاشق کے ہے وہ آب حیات

تو تو کیا جانے، بے کسی پہ مری[5]
شمع روتی رہی ہے ساری رات

ہے تجھی تک یہ اشک و آہ اے عشق
ساتھ دولھا کے جس طرح ہو برات

بسکہ اس قافلے میں ہے شر و شور
نہیں سنتا کوئی کسی کی بات

ہے اجل یوں کمیں میں انسان کے
موش پر گربہ جوں لگائے گھات

قطب صاحب کی، اب کے چھڑیوں میں
ق
امنڈ آئی ہے جو سبھی مہوات

چھاتیاں دیکھ سادہ وضعوں کی
دلّی کے نوجواں ملیں ہیں ہات

پردگی ہے کوئی تو اس میں بھی
ق
ہے کھنچی یہ جو آسماں کی قنات

یہ تمام اہتمام ہیں اس کے
دن کہاں کے میاں، کہاں کی رات

---

[1] آصفیہ: کچھ مجھ میں تم میں
[2] آصفیہ: آیا ہی تو نہ ورنہ
[3] آصفیہ: وہ اس کے
[4] آصفیہ: ہائے وہ اس کی
[5] نسخۂ الف: بے کسی میری

مجھے وہ ماہ خانگی نہ ملا گئی اب کے بھی یوں ہی بارہ وفات
مصحفی اپنی نا امیدی پر
ہاتھ مل کر کہوں نہ کیوں ہیہات

۱۱۱

رخسار پر ہے زلف پریشاں کی اوقات بازاری تو رکھتے ہی ہیں دکّان کی اوقات
کیا یار پرکھتا ہے برے اور بھلے کا ہر طرح گذر جاتی ہے انسان کی اوقات
محتاج نہیں غیر کا، صدقے سے جنوں کے ہاتھ اپنے ہی ہے اپنے گریباں کی اوقات
گر خون جگر ہو نہ، تو کیا خاک پیے وہ ہے خون جگر پر مرے، پیکاں کی اوقات
کیا سمجھے ہے وہ یاروں کی صحبت کے مزے کو غیروں میں کٹی اس بت ناداں کی اوقات
ہے خانہ نشیں مصحفی افلاس کے مارے
کیا پوچھو ہو اس بے سر و ساماں کی اوقات

ٹ

۱۱۲

لے کے دل زلف میں رکھتا ہے لپیٹ یاد ہیں اس کو کیا لپیٹ سپیٹ
ہے جہاں طرفہ خواب گہ جس میں یار کیا کیا رہے ہیں آ کر لیٹ
کیونکہ اٹکے نہ اس کی ناف سے آنکھ[1] صاف ہی اس قدر ہے اس کا پیٹ
کیا رہا اب کہ اس گلی سے صبا[2] لے گئی میری خاک بھی تو سمیٹ[3]
دور ہے مصحفی فرنگوں کا[4]
کام ایسا نہ کر کہ کھاوے کیٹ

---

[1] نسخہ الف و ن ۲ : اٹکے نہ اس سے ناف کی آنکھ [2] آصفیہ : کیا رہا، اس گلی سے بادِ صبا
[3] آصفیہ : میری خاک کو بھی [4] آصفیہ : مصحفی دور ہے فرنگیوں (کتنا) کا

۱۱۳

آتی ہے یہ کچھ آہ کے صدمے سے دل پہ چوٹ ‏ — ‏ جوں صید تیر خوردہ کہ ہو جائے لوٹ پوٹ
خوبی جواب دینے کی ٹک اس کے دیکھیو ‏ — ‏ گر میں پکارتا ہوں تو کہتا ہے مجھ کو "پھوٹ"
کھاتا ہے چرخ شعلۂ جوالہ رات دن ‏ — ‏ ٹوپی کے گرد ان نے لگائی ہے جب سے گوٹ
ہیں اس گلی میں حسن کے تودے لگے ہوئے ‏ — ‏ خورشید و ماہ لے گئے باندھ باندھ پوٹ

کہتا تھا میں کہ دل تو نہ دے اس کو مصحفی
لے کر نکر ہی جائے گا وہ شوخ ہے ملوٹ

ث

۱۱۴

جیسے کسی چیز پر ہوتی ہے طفلاں میں بحث ‏ — ‏ تیرے لیے شب رہی میرے دل و جاں میں بحث
زلف و رخ اپنا کہیں اس نے دکھایا تھا ٹک ‏ — ‏ آج تک ہوتی ہے جو گبر و مسلماں میں بحث
دعارہ تری تیغ کا کیا کسی گردن سے ہے ‏ — ‏ کرتے ہیں زندانیاں آج جو زنداں میں بحث
کاٹ کا دعویٰ اسے، شور کا لاف اس کو تھا ‏ — ‏ اس ہی سخن پر رہی تیغ و نمکداں میں بحث
کوہ ہے تمکیں کے ساتھ، اور ہے دل اس کا وسیع ‏ — ‏ اس لیے ہوتی نہیں کوہ و بیاباں میں بحث
مکتب اطفال ہے مجمع دیوانگاں ‏ — ‏ رہتی ہے یاں روز و شب دست و گریباں میں بحث
دل سے اور اس چشم سے لاگ ہے اس طور کی ‏ — ‏ ہوتی ہے کیا لطف سے دونوں سخن داں میں بحث
کلبۂ شوریدگاں شور سے معمور ہے ‏ — ‏ کرتے ہیں لڑکے تمام جیسے دبستاں میں بحث

دعوئ شعر اس قدر، تس پہ بھی اے مصحفی
بیٹھ کے تو نے نہ کی مجلس یاراں میں بحث

۱۱۵

یار ملتا ہے کوئی، یہ آہ و زاری ہے عبث ‏ — ‏ اے دل اتنی بے کلی اور بے قراری ہے عبث

دن میں جو سو سو کرے یار اور پھرے اک اک کے گھر — سچ اگر پوچھے کوئی ایسے سے یاری ہے عبث
رام ہوتا ہے کوئی معشوقِ ہرجائی، دلا — بے قراری، بے خودی، بے اختیاری ہے عبث
کوئی اس مجلس میں ہرگز دادِ غم دیتا نہیں — شمع سے کہہ دو کہ تیری اشک باری ہے عبث
غنچہ ایدھر مسکراتا ہے، اُدھر ہنستا ہے گل — اس چمن میں گریۂ ابرِ بہاری ہے عبث
یہ نہیں وہ شب کہ جس کی صبح ہووے گی طلوع — دم شماری کر دلا، اختر شماری ہے عبث

وعدہ کر کے مصحفی کس دن وہ آیا تیرے پاس
تجھ کو اُس پیماں شکن[1] کی انتظاری[2] ہے عبث

ج

۱۱۶

تا بفلک تو گئی اشک کے طوفاں کی موج — دیکھ جسے رہ گئی راہ میں عمّاں کی موج
حسن کا دریا ترے آوے ہے جب زور پر — رُو بہ ہوا جائے ہے زُلفِ پریشاں کی موج
کیوں کہ بیاباں سے قیس آوے طرف شہر کے — پانو کی زنجیر ہے ریگِ بیاباں کی موج
اب تئیں کھاتی ہے وہ رشک سے اک پیچ و تاب — برق نے دیکھی تھی ٹک اس زہِ داماں کی موج
دیکھ اسے کیوں نہ میں چاک گریباں کروں — صورتِ آغوش ہو جس کے گریباں کی موج
چشمۂ حیواں ذقن اور ہے جو غبغب کا طوق — اس کے تئیں جاں تو چشمۂ حیواں کی موج

لکھی شفق کی نہیں، چرخ پہ یہ مصحفی
اڑی ہوئی جائے ہے خوں شہیداں کی موج

۱۱۷

نہ تو اس شہر میں دوا کا رواج — اور نہ ہو ہم سے درد دل کا علاج
کس کو بھاتا نہیں ہے اپنا جگر — گل ہے ہر شاخِ گل کے سر کا تاج
گر ہمیں اتنی دسترس ہوتی — نذر زلفوں کی کرتے شانۂ عاج[3]

---

[1] نسخۂ الف: پیماں گُسل [2] انتظاری میں یائے زائدہ ہے [3] نسخۂ الف: نذر زلف کرتے شانۂ عاج (نیز رامپور ن ا میں بھی اسی طرح)

مفلسی اک تو، تس پہ بیماری — یہ مثل ہے وہی کہ کوڑھ میں کھاج
نالہ جاتا ہے تا بہ عرشِ بریں — ہے شبِ ہجر کی یہی معراج
کام کیا مجھ کو شورِ بلبل سے — میں ہوں اک طوطیٔ نفیس مزاج

مصحفی گلستانِ گیتی میں
ڈھونڈ لاوے تو کوئی مجھ سا آج[1]

۱۱۸

یوں ہوا معلوم ہم کو دل کی بے تابی سے آج — نیند آنے کی نہیں تا صبح بدخوابی سے آج
کیا وہ ماہ چار دہ آیا ہے پشتِ بام پر — لگ رہی ہے چشمِ مہ جو اس کی مہتابی سے آج
سرخیٔ پاں کا لکھوٹا لب پہ کس دن تھا کبھو — نکلے ہے کچھ اور ہوا اس رنگ عنابی سے آج
کل نہیں رہنے کا یہ عالم ترا اے ماہ رو — رو کشی کر لے تو اس ابروے محرابی سے آج
کب سے مصرِ عشق میں قحطِ امتاعِ وصل ہے — شکوہ ہم کرتے نہیں کچھ اس کی نایابی سے آج
یا تو ندیاں بہہ رہی تھیں یاں، یہ کل کی بات ہے — یا اُڑے ہے خاک ان آنکھوں میں بے آبی سے آج

کوزۂ دولاب ہے ہر اشک اپنا مصحفی
ہم کو یہ خدمت ملی ہے چرخِ دولابی سے آج

۱۱۹

عیسیٰ سے کیونکہ ہو دلِ بیمار کا علاج — مشکل بہت ہے عشق کے آزار کا علاج
جوں شانہ جس نے ہاتھ لگایا ہو زلف کو — ہے تازیانہ ایسے گنہ گار کا علاج
آ کر[2] اجل نے موند دی آنکھ اپنی سہج میں — کیا ہو گیا ہے حسرتِ دیدار کا علاج
ناسورِ سینہ بند کرے آ دلا کوئی — عاشق کے تب ہو دیدۂ خوں بار کا علاج
پر باندھ کر قفس میں جو صیاد نے رکھا — اچھا کیا یہ مرغِ گرفتار کا علاج
موے سفید میرے یہ اتنے بُرے نہیں — نرگس کرے جو زردیٔ رخسار کا علاج
جاتا ہے کیسہ پر کوئی دیری طبیب کی[3] — لیتا ہے کم بغل کوئی عطار کا علاج

---

[1] نسخۂ الف و ن ا: کوئی تو مجھ سا آج [2] نسخۂ الف: آ کے [3] دیری غالباً دلیر کی تحریف ہے۔

اپنی شفا تو ہاتھ ہے اب اُس کے مصحفی
کرتا ہے مفلسی میں جو نادار کا علاج

۱۲۰

نکلا ہے سرخ پوش ہو وہ نوجوان آج
آتش میں جُھمک رہا ہے زمیں آسمان آج

میں اس قد خمیدہ سے ماروں گا خصم کو
برسوں میں میرے ہاتھ لگی ہے کمان آج

کیا مے کدے سے آتے ہو تم کچھ نشہ پیے
کتنی بہک رہی ہے تمھاری زبان آج

ہم تم بھی شب میں آ کے نہ مل بیٹھیں دو گھڑی
خورشید و ماہ کا ہے فلک پر قران آج

اے گل وہ عندلیب کہ یاں نغمہ سنج تھا
کنج قفس میں کہتے ہیں دی اُس نے جان آج

وے دن گئے کہ دبدبۂ خسروی تھا یاں
ق سُونے پڑے ہیں دیکھو[1] تو کیا کیا مکان آج

جن کے جلو میں چلتے تھے لاکھوں نشان واں
دیکھو تو کچھ زمیں پہ ہے ان کا نشان آج؟

جا کر گلی میں اس کی پھر آئی بصد غرور
طاقت کا اپنی ہم نے کیا امتحان آج

کہتے تھے مصحفی جسے ہم، اُس کی راہ میں
بسمل پڑا ہوا تھا وہی نوجوان آج

۱۲۱

خسرووں کے سر سے کب جاوے ہوائے تخت و تاج
یاں سلیماں تک ہیں پا یا مبتلائے تخت و تاج

دل شکستہ کر نہ عاشق کا کہ شہر عشق میں
قیمت اک دل کی نہیں ہوتی بہائے تخت و تاج

تاج جس کا ہوشے سر اور تخت ہو نعلین پا
کیوں نہ ہم ایسے کے پھر ہوویں فدائے تخت و تاج

کیجیے کاہے کو پھر اس جاہ دنیا کا غرور
خاک میں ملنا ہی جب ہو مدعائے تخت و تاج

صفحۂ کاغذ پہ رزمیہ سے ہرگز کم نہیں
بسکہ رنگیں ماجرا ہے، ماجرائے تخت و تاج

شاہنامے کو ذرا تو دیکھ تو اے مرد ہوش
ہے لکھا کچھ اور بھی[2] اس میں ورائے تخت و تاج

خاک اس امرِ خلافت پر کہ جس میں خلق نے
ذلتیں کیا کیا اُٹھائی ہیں برائے تخت و تاج

سلطنت غضبی ہے شاہانِ جہاں کی سر بسر
فی الحقیقت ہیں[3] نہیں کچھ یہ سزائے تخت و تاج

---

[1] آصفیہ: دیکھ لو [2] نسخہ الف: اور ہی [3] آصفیہ: فی الحقیقت میں

حضرتِ مہدی اگر ہوتے تو ہاں اے مصحفی
حضرتِ مہدی کے میں جاتا فدائے تخت و تاج

ح

۱۲۲

ملتے ملتے وہ ہیں ہو جاتا ہے بیگانے کی طرح
یاد ہے کافر کو کیا عاشق کے تڑپانے کی طرح

میرزائی کا نہ کیوں مرغِ چمن دعویٰ کرے[1]
آشیاں میں اس کے اک نکلے ہے خس خانے کی طرح

شوق تو دیکھو کہ شب پرزے گریباں کے مرے
شمع پر جا کر جلے اک مشت پروانے کی طرح

کھینچتے ہو، تنتے ہو، کستے ہو ہر دم آپ کو
ہے میاں یہ بھی کوئی آغوش میں آنے کی طرح

اک نہ اک ٹکڑا جگر کا آن رہتا ہے وہ ہیں
نوک مژگاں پر مری یاقوت کے دانے کی طرح

میں تو ہوں دیوانہ شفافی کا اپنے اشک کی
کیا جھمکتا ہے پڑا الماس کے دانے کی طرح

ساقیٔ دوراں کو یارب اس سے کیا منظور ہے
چرخ کو گردش میں کیوں رکھتا ہے پیمانے کی طرح

میں تو بندہ ہوں غرض اپنے دلِ صد چاک کا
رات دن زلفوں میں جھولا جھولے ہے شانے کی طرح

مصحفی تو نے تو پہنچے کو جلا ڈالا تمام
یہ بھی اے ناداں کوئی ہوتی ہے گل کھانے کی طرح

۱۲۳

ہوتی ہے کیا بھی مرے صاحب حیا کی طرح
جاتے ہو دور دور جو نا آشنا کی طرح

آکر مسافروں نے تری کو میں یوں کہا
پانو کو پکڑے ہے یہ زمیں کربلا کی طرح

تقصیر کیا ہے میری، کوئی پوچھتا نہیں
پیچھے پڑی ہیں کیوں تری زلفیں بلا کی طرح

رنگینیٔ مزاج تو تم اس کی دیکھیو
ہاتھوں سے میرے خوں کو ملا ہے حنا کی طرح

صیاد کے شعور کا کشتہ ہوں میں کہ ہائے
باندھا ہے پر سے پر مرا بندِ قبا کی طرح

---

[1] ن ۲: دعویٰ کرے مرغ چمن

بلبل کو اس کے انس جو تھا مجھ سے، بعد مرگ
ہر استخواں پہ بیٹھے ہے آکر ہما کی طرح

بلبل تو میرزائی پر اپنی بہت نہ پھول
دیکھی نہیں ہے تو نے مرے میرزا کی طرح

گلچین روزگار سے فرصت اگر ملی
تو ہم چمن کی سیر کریں گے صبا کی طرح

روتا ہے زار زار جو بیٹھا تو مصحفی
کیا دل میں کھب گئی ہے کسی خوش ادا کی طرح

۱۲۴

رات کاٹی ہم نے تجھ بن جس طرح
دن نہ دشمن کا بھی کٹیو اس طرح

آتش سوزندہ ہے رنگ کفک
لوں کف پا کا میں بوسہ کس طرح

داغ دل شعلے سے غم کے مل گیا
ساتھ سونے کے ہو جیسے مس طرح

مصرع قد سرو سے ہم وزن ہے
ساتھ ان آنکھوں کے ہے نرگس طرح

بخت کی برگشتگی سے پھر گیا
اس کو گھر لایا تو تھا جس تس طرح

مرتے مرتے تک نہ بولا مصحفی
جان دی آخر کو اس نے اس طرح

۱۲۵

تا چند کرتے خدمتِ گل باغباں کی طرح
ڈالی قفس میں ہم نے تو اب آشیاں کی طرح

سروِ سہی، کہا نہ اکڑ اتنا باغ میں
دیکھی نہیں ہے تو نے کسی نوجواں کی طرح

عاشق کو مارتے نہیں یوں جان سے میاں
گر امتحاں کریں ہیں تو اک امتحاں کی طرح

ممنون ہوں میں جی سے سگ کوے یار کا
نامے کو لے چلا ہے مرے استخواں کی طرح

تو بھی تو چشم غور سے ٹک دیکھیو نسیم
ہنسنے میں غنچے کی ہے سب اس کے دہاں کی طرح

سر کھینچتا ہے غرفہ و روزن سے عاقبت
حسن نہاں بھی قہر ہے عشق نہاں کی طرح

کبک دری نہ چال پہ بھول اپنی دور ہو
کب چل سکے ہے تو مرے سرو رواں کی طرح

کس طرح کوئی روک رکھے اس کو، کیا کرے
عمر رواں تو جاتی ہے آب رواں کی طرح

قبضے میں غیر کے وہ بر و دوش آ گیا
خمیازہ کھینچتے ہی رہے ہم کماں کی طرح

کیوں کر کہوں میں چین ہوا دل کو، اب تلک
نالے وہی ہیں اور وہی آہ و فغاں کی طرح

وہ رشکِ ماہ جب سے ہماری نظر پڑا
دن رات ہم پھرا ہی کیے آسماں کی طرح

تم جا کے گھر میں غیر کے واں سو رہے میاں
آنکھوں میں رات کاٹی میں یاں پاسباں کی طرح

ترچھی نگہ میں کاٹ ہے شمشیرِ تیز کا
سیدھی نگاہ چبھتی ہے دل میں سناں کی طرح

عاشق کو قتل کر کے جو یہ پوچھتے نہیں
پوچھے کوئی بتاں سے کہ یہ ہے کہاں کی طرح

ناحق کو شور ہے یہ ترا، تو تو عندلیب
بولے کبھی نہ مصحفی سے خوش زباں کی طرح

١٢٦

سینے سے جلوہ گر ہے ترے ابتدائے صبح
گل کھائے ہے بیاضِ گلو پر صفائے صبح

اے ماہ شستگی ترے برقع کی دیکھ کر
تہ کی سپید بافِ فلک نے ردائے صبح

ہم نے تو تیرے عہد میں ہاں اے شبِ فراق
دیکھا نہ خواب میں بھی رخِ جاں فزائے صبح

کھل جائے آنکھ اگر تری شب سے تو بے خبر
قابل ہے سیر کے چمن دل کشائے صبح

چلتا ہوں میں کہ آکے ابھی کوئے یار سے
بھڑکا گئی ہے آتشِ دل کو ہوائے صبح

منھ دیکھ کر میں کس کا اٹھا تھا جواب تلک
ہوتی نہیں قرینِ اجابت دعائے صبح

نے شام لگ سکے تری زلفوں کے حسن کو
نے آب و تابِ صبح بُناگوش پائے صبح

ہستی سے درگذر، جو تو چاہے ہے وصلِ دوست
جلوہ ہے آفتاب کا بعد از فنائے صبح

لطفِ جبیں سے تیری خجل ہو گئی تھی کل
کس منھ سے تجھ کو آکے پھر اب منھ دکھائے صبح

ہم تو شبِ فراق سے مجبور ہو گئے
اس شب کو تو ہی صبح کر اب اے خدائے صبح

تقصیر وار گو کہ تمھارا ہے مصحفی ق
پر وہ نہیں کہ بھولے یہ عہد وفائے صبح

پیارے شبِ وصال میں[1] اس کو کرو نہ قتل
موقوف صبح پر ہی رکھو ماجرائے صبح

١٢٧

گالیاں دیتے ہو تم مجھ کو مری جان صریح
آپ کی بھی واہ وا کیا ہی زباں ہے فصیح

[1] نسخۂ الف : وصال تو

زلف و رخ یار کا حسن بیاں کیا کروں
شام نہ اتنی ملیح صبح نہ اتنی صبیح

عشق کے آزار کی عشق کے بیمار کی
کر نہیں سکتا دوا عہد میں تیرے مسیح

گرچہ ملاحت ترے حسن کی ہے دل فریب
حسن خط سبز ہے اور ہی اس سے ملیح

سُقم و غلط کو نہیں دخل ترے شعر میں
مصحفی جو کچھ لکھا تو نے وہ سب ہے صحیح

خ

۱۲۸

اپنا تو مرغ دل ہے گرفتار حسن شوخ
لگتا ہے اس کو خوش گل و گلزار حسن شوخ

اب تو فسردہ ہو گئے ہم، آہ تھا کبھی
اپنا بھی عشق گرمیٔ بازار حسن شوخ

ہر ایک خوب رو میں نہ دیکھی یہ چال ڈھال
سچ ہے کہ اور ہوتی ہے رفتار حسن شوخ

چھپتے ہیں کوئی منھ کے چھپانے سے[1] خوبرو
وضعوں سے جلوہ کرتے ہیں آثار[2] حسن شوخ

عاشق جو چشم غور ذرا اس پہ وا کرے
نقشے ہزار رکھتے ہیں معمار حسن شوخ

موسیٰ ہی ہو تو سمجھے تجلّی کے رمز کو
کھلتا ہے کب ہر ایک پہ اسرار حسن شوخ

کیا وہ بھی دن تھے آہ کہ ہم اس حجاب پر
جی بیچ کر ہوئے تھے خریدار حسن شوخ

لالہ سے جلوہ گر ہے کہ فصل بہار میں
کرتی ہے مشت خاک بھی اظہار حسن شوخ

آنکھیں اگرچہ اپنی وہ آنکھیں نہیں رہیں
ہے تو بھی اُن کو خواہش دیدار حسن شوخ

رعنائیاں یہی ہیں تو ہرگز نہ جائے گی
آنکھوں سے میری، حسرت دیدار حسن شوخ

صنعاں کا ذکر کیا ہے کہ صنعاں سے پیشتر
تھی دوش اصفیا پہ بھی زنّار حسن شوخ

لولی و شانِ ہند کے قائل ہیں مصحفی
ہم وہ نہیں کہ ہم سے ہو انکار حسن شوخ

۱؎ ن ۱: مُنھ کو چھپائے سے خوبرو
۲؎ نسخہ الف و ن ۱: بازار

۱۲۹

اس مست کو ہوا ہے جو شوق شراب و سیخ
مژگاں سے لخت دل بھی رکھے ہے کباب و سیخ

روزِ شکار اُس کی سواری میں جا بجا
حاضر رہے ہے مجمرۂ آفتاب و سیخ

صید زبوں ہوں گرچہ، پہ میرا قبول دیکھ
رکھے ہے لاگ مجھ سے بھی تیغ خوش آب و سیخ

اس مست کی گزک کے لیے جوں جہندہ برق
اک جا کیا ہے میں دل پُر اضطراب و سیخ

قربانیانِ تیغ محبت کو مصحفی
بیت الحرم میں چاہیئے برق و سحاب و سیخ

۱۳۰

لباس پہنے ہے اکثر وہ شوخ پُرفن سرخ
کہ ہو نہ خون شہیداں سے اس کا دامن سرخ

دل گداختہ پہلو سے یوں نظر آیا
کہ جیسے کورۂ آتش میں ہو ہے آہن سرخ

لباس سرخ نے اس کے یہ ان میں رنگ بھرا
کہ مجھ کو آئے نظر جالیوں کے روزن سرخ

مسی کا رنگ جو دیکھا ہے اس کے ہونٹوں پر
ہوا ہے مارے خجالت کے رنگ سوسن سرخ

کبھی تو سیر کو چل تو بھی جانب صحرا
کہ جوش لالہ ستاں سے ہیں سارے گلشن سرخ

شہید گر نہیں رنگ حنائے خوباں کا
رہے ہے خون سے کیوں مصحفی کا مدفن سرخ

۱۳۱

کچھ اپنی جو حرمت تجھے منظور ہو اے شیخ
تو بحث نہ مے خواروں سے، چل دور ہو اے شیخ

مسجد میں ذرا وقت سحر دیکھ تو جا کر
شاید کوئی اس چشم کا مخمور ہو اے شیخ

صد دانہ تسبیح رکھے ہاتھ میں اپنے
چو نکلے تو جو یک دانۂ انگور ہو اے شیخ

تو مجھ کو کہے ایک، میں سو تجھ کو سناؤں
اے کاش کہ اتنا مجھے مقدور ہو اے شیخ

آیا ہے وہ بدمست لیے ہاتھ میں شمشیر
مجلس سے شتابی کہیں کافور ہو اے شیخ

کرتا ہے ہمیں منع تو پیمانہ کشی سے
پیمانہ تری عمر کا معمور ہو اے شیخ

البتہ کرے منع ہمیں عشق بتاں سے — تجھ سا جو کوئی عقل سے معذور ہو اے شیخ
پھر دُم ہے وہ شملہ جو ہوا حد سے زیادہ — رکھ شملہ تو شملے کا جو دستور ہو اے شیخ
ہر حرف میں سختی ہے ترے، سنگ جفا سی — ڈرتا ہوں نہ پھر شیشۂ دل چور ہو اے شیخ
کیوں مصحفی کو اتنی تو کرتا ہے نصیحت
سر چڑھ نہ بہت اُس کے جو مجبور ہو اے شیخ

و

۱۳۲

کس کے یاد آئے تجھے دستِ نگاریں فرہاد — جو ہوا تیشہ ترا خون سے رنگیں فرہاد
تو سزاوار نہ تھا اس کا، عبث تو نے کیا — دعوئ عشق بایں عزت و تمکیں فرہاد
ایک دن خواب میں آئی نہ ترے شیریں ہائے — نہ ہوئی شاد تری خاطرِ غمگیں فرہاد
تو سمجھ سختئ بیدارئ شب کو میری — کیوں کہ خارا ہے ترا بستر و بالیں فرہاد
سن کے شیریں نے سر اپنے کو وُہیں پیٹ لیا — جب سنا یہ کہ موا کوہ میں مسکیں فرہاد
کیا تصوّر کی قلم قابلِ تحریر نہ تھی — دل پہ کیوں نقش نہ کی صورتِ شیریں فرہاد
گر سنے تو تو دمِ تیشہ یہی کہتا ہے — اب کوئی دم کو تو پا جائے گا تسکیں فرہاد
قلمِ تیشۂ فولاد سے اس خارا پر — تو نے کیا خوب لکھی صورتِ شیریں فرہاد
مصحفی تجھ کو یہ کہتا ہے، نہ رہنا غافل
عشقِ شیریں بھی ترا دشمن و شیریں فرہاد

۱۳۳

آئینے کو ہے ترے حسن کی خدمت شاید — شانہ رکھتا ہے خمِ زلف سے بیعت شاید
دل دیوانہ مرا اُس کی گلی سے نہ پھرا — ان دنوں اُس کے تئیں ہو گئی رجعت شاید
میں نے جانا جو کیا کم وہ لگا یوں کہنے — اس کو اب آنے کی ملتی نہیں فرصت شاید

بعضے کر بیٹھے ہیں دعویٰ جو شکیبائی کا
سہل سمجھا ہے انھوں نے غم فرقت شاید

بوے یاس آتی ہے اس لالہ ستاں سے مجھ کو
یاں ہے مدفون کوئی کشتۂ حسرت شاید

کر دیا آنکھ ملانا ہی بتاں نے موقوف
اب جہاں میں نہ رہی رسم مروّت شاید

تو جو اودھر ہی کو مائل ہے میاں کرتی ہے
آنکھ تیری طرف آئینے کے رغبت شاید

جرس نالۂ بلبل کی فغاں صبح سے ہے
باغ سے نکہت گل ہو گئی رخصت شاید

تم نے موقوف کیا ہم سے جو ملنا یک بار
ایک ہی بات کی ہوتی ہے محبت شاید

مصحفی کا کرو تم گور غریباں میں سراغ
اسی انبوہ میں ہو اس کی بھی تربت شاید

۱۳۴

ناوک سے نگہ کے تری ہرگز نہ بچا صید
ہاں ہوتے ہوئے دیکھے ہیں عنقا و ہما صید

آہو تو ہیں کیا چیز کہ شیران حرم کو
کرتی ہے کمند دل میں تری زلف رسا صید

ہاں سچ ہے ترے دام میں اے گیسوے پُرخم
ہووے گا کوئی ہم سا گرفتار بلا صید

آہو کہیں مارے کہیں صحرا کے چکارے
کس کس کو تری زلف سیہ نے نہ کیا صید

جب زلف کو کھولا تو پھنسے جال میں اپنے
جب آنکھ اُٹھائی ہوئے مرغان ہوا صید

کچھ بحری و بری میں نہیں فرق اب اس کو
پاتی ہے جسے کرتی ہے وہ زلف دوتا صید

اس طفل نے جب شوق کیا تیر و کمان کا
تب مرغ دلِ مصحفی خستہ ہوا صید

۱۳۵

کس طرح جھانکے کوئی واں کرکے اب گردن بلند
واں کی دیواریں بلند اور واں کے سب روزن بلند

اس کے کوچے سے نکالا جب مجھے، دیکھا کیے
منظروں سے دور تک سر کرکے مرد و زن بلند

پست فطرت پا سکے کب اس کے معنی کے تئیں
مطلع ابرو ترا ہے اے بُت پُرفن بلند

مجھ دوانے کی خبر ان کو نہیں ورنہ ابھی
کرتے دیوار چمن سے سر گل و سوسن بلند

چھوڑ کر سینے کو، میرے سر پہ وہ آ کر پڑا
ہاتھ اپنا جب کیا میں نے گہ شیون بلند

اس تلک میری رسائی کس طرح ہو مصحفی
دست کوتہ اپنا اور اس شوخ کا دامن بلند

ذ

۱۳۶

ہم نے خط لکھنے کو اس کے جب اُٹھایا کاغذ ۔۔۔ لکھتے ہی ہاتھ میں پھر اپنے نہ پایا کاغذ
بسکہ اس طفل کو تھا شوق کبوتر بازی ۔۔۔ کر کے پرزے مرے نامے کو اڑایا کاغذ
درجواب اس نے یہ لکھا کہ بھلا سمجھوں گا ۔۔۔ لکھ کے میں نے جو کبھی اس کو بھجایا کاغذ
نامہ قاصد کو دیا ہم سے بھی یہ چوک ہوئی ۔۔۔ اس کی دیوار پہ لکھ کے نہ لگایا کاغذ
دل چلے کیوں کہ نہ میرا، کہ غضب کے مارے ۔۔۔ آگے قاصد کے، مرا اس نے چلایا کاغذ
ہم تو لکھتے ہی رہے پرزِ دل پہ دل کے غم دل ۔۔۔ ہم نے بازار سے کس روز منگایا کاغذ
دیکھ قاصد کی طرف ہنس کے وہ کافر بولا، ق ۔۔۔ ہیں مکرر جو اسے لکھ کے بھجایا کاغذ

مصحفی نے تجھے بھیجا ہے نہ لا دیکھوں تو
اب کی شاید نئے مضمون کا لایا کاغذ

ر

۱۳۷

آیا جو وہ کل تیر و کماں ہاتھ میں لے کر ۔۔۔ دوڑا مہ نو اپنا نشاں ہاتھ میں لے کر
مہندی کی یہ رنگت نہیں، کافر نے ملا ہے ۔۔۔ خونِ دلِ خونیں جگراں ہاتھ میں لے کر
رہ جاؤں ہوں میں کیسی غریبی سے ذرا دیکھ ۔۔۔ دامن ترا اے سرو رواں ہاتھ میں لے کر
ساقی کی نزاکت پہ ہنسی آئے ہے مجھ کو ۔۔۔ رکھ دے ہے وہ جب رطل گراں ہاتھ میں لے کر

یہ شیشہ نہیں وہ کہ گیا ہاتھ پھر آوے
پٹکو نہ مرے دل کو میاں ہاتھ میں لے کر

بھائی یہ ادا مجھ کو جو کافر نے ادا سے
شب پھینک دیا بیڑہ پان ہاتھ میں لے کر

منہ دیکھنے لگتا ہوں میں، جب دیکھیں ہیں مکھڑا
آئینے کو ہر لحظہ بتاں ہاتھ میں لے کر

کیا چوک ہوئی مجھ سے جو شب چھوڑ دیا ہیں
جوڑا ترا اے آفت جاں ہاتھ میں لے کر

اس رات اندھیری میں، مجھے یہ تو بتا دے
جاتا ہے تو تلوار کہاں ہاتھ میں لے کر

یہ خاک غریباں کی ہے تو یاں سے چلا کر
دامن کو ٹک اے سرو رواں ہاتھ میں لے کر

اے مصحفی اس شہر میں ہم نے کیا سودا
جاتے ہیں مگر دل کو جہاں ہاتھ میں لے کر

۱۳۸

آتا ہے جی میں یوں کہ کسی گل کو تاڑ کر
جا بیٹھیے چمن میں گریبان پھاڑ کر

اس طفل بے شعور نے مانجھے کے واسطے
شیشے دلوں کے چور کیے توڑ تاڑ کر

کس کس کو یاد کیجیے کہ اس خاک داں سے ہائے
کیا کیا نہ گل چلے گئے دامن کو جھاڑ کر

مشہور ہے کہ رستم دستانِ چرخ کو
سو بار ہم نے چھوڑ دیا ہے پچھاڑ کر

عالم کو لولیوں کے[1] محترم ہیں دیکھیے
سنوریں ہیں کیا یہ حسن کے نقشے بگاڑ کر

آیا جو ہیں چمن میں تو اس طفل شوخ نے
پودھے گلوں کے پھینک دیے ہیں اُدھاڑ کر

کہتے ہیں واں سے خون کا نالہ بہا ہے ایک
آئے ہیں ہم جہاں ترے کشتے کو گاڑ کر

بادِ خزاں کا ہووے برا جس نے مصحفی
میدان کر دیا ہے چمن کو اُجاڑ کر

۱۳۹

ہم کو ترساتے ہو تم کیوں یہ ادا دکھلا کر
منہ چھپایا نہ کرو بہر خدا دکھلا کر

شرط یاری یہی ہوتی ہے کہ بس پھر گئے آپ
چار دن مہر و محبت کا مزا دکھلا کر

حسن کہتا ہے اُسے، پردہ اٹھا دے، پر شرم
یوں سکھاتی ہے کہ لے منہ کو چھپا دکھلا کر

۱؎ الف : عالم کی لولیوں کو

دل کو ہاتھ اُس کے جو بیچوں ہوں تو کہتے ہیں رقیب
لے چلو تم اِسے بازار ذرا دکھلا کر

پھر قیامت ہے جو وہ شوخ چھپائے مُنھ کو
اپنا دیدار ہمیں روزِ جزا دکھلا کر

چاک چاک اپنے گریباں کو کیا ہے میں نے[ل]
اُسی دن سے، کہ وہ ہاتھ اپنے گیا دکھلا کر

غنچۂ گل سے مرا غنچۂ دل نازک ہے
لیجیو تو اسے اے بادِ صبا دکھلا کر

نالہ سر کھینچے ہے خاکِ شہداء سے اب تک
تم چلے آئے تھے اک دن کفِ پا دکھلا کر

تیرے بیمار کو دے کر کے پشیماں ہوئے
لائے تھے وہ جو مسیحا سے دوا دکھلا کر

کیجیو قاصد مرے پیارے سے جدائی کا گلہ
وقتِ فرصت مرے نامے کو جُدا دکھلا کر

خواہ دیوانہ کہے خواہ وہ وحشی مجھ کو
مصحفیؔ میں اسے حال اپنا چلا دکھلا کر

۱۴۰

ہم نے لُٹا دیا ہے گھر بار تیری خاطر
بیٹھے ہیں ہم پہن کر زنّار تیری خاطر

جب صبح کو اُٹھیں ہیں سوتے سے سن رہیں ہیں
ہم ہر کسی کی باتیں دو چار تیری خاطر

شاید کسی بہانے تو اُٹھ کے آوے ہم تک
راتوں کو ہم رہیں ہیں بیدار تیری خاطر

گر تو نہ ہو تو پیارے کیا کام یاں ہمارا
آتے ہیں اس گلی میں ہر بار تیری خاطر

نازک مزاج تھے ہم، پر کیا کریں کہ اب تو
سُنتے ہیں ہر کسی کی ناچار تیری خاطر

اے حُورِ جلوہ سن لے، ہم سے کہ ہم نے چھوڑا
حورِ بہشت کا بھی دیدار تیری خاطر

کیوں مصحفیؔ جہاں میں رُسوا ہوا ہے، کہہ دوں
تیرے لیے ستم گر، خوں خوار تیری خاطر

۱۴۱

نکلے ہے یہی دل کے مرے ساز سے باہر
وہ بات نہ کہیئے جو ہو انداز سے باہر

ہر چند کہ حسن اس کے پہ ہیں سیکڑوں پردے
لیکن وہ نہیں چشمِ نظر باز سے باہر

جاتا ہوں گھر اس کے تو وہ بے رحم مقرّر
سن نام مرا نکلے ہے سو ناز سے باہر

ل آصفیہ: ہم نے

ہر چند قفس میں ہوں پڑا، پھر بھی نہیں ہے[1] — یہ سیرِ چمن تو[2] مری پرواز سے باہر

دل چھید سے ہوئے نکلے ہے صاحب نظروں کا — نوکِ نظر اس نرگسِ غمّاز سے باہر

کیا اُس کے سراپا کو بتادے کوئی جو شے — انجام سے ہووے الگ، آغاز سے باہر

معشوق وہی ہے جو کسی بات میں ہرگز — ہووے نہ کبھی عاشقِ جاں باز سے باہر

اے مصحفی رائض ہوں میں میدانِ سخن کا
یہ عرصہ نہیں میری تگ و تاز سے باہر

۱۴۲

وہ دن گئے کہ تھا تو شیریں مقالیوں پر — تیری زباں کھلی ہے ان روز دن گالیوں پر

شب اک جھلک دکھا کر وہ مہ چلا گیا تھا — اب تک وُہی سماں ہے غرفے کی جالیوں پر

اک بال سی کمر کے باندھیں گے لاکھ مضموں — آئی جو طبع اپنی نازک خیالیوں پر

مے پی گے اس چمن سے کون اُٹھ گیا ہے، جو ہے — انگڑائیوں کا عالم، پھولوں کی ڈالیوں پر

لاکھوں مثال تیری، نظروں میں جلوہ گر ہیں — تو کس قدر عیاں ہے ان بے مثالیوں پر

کہہ دو صبا سے کوئی جلدی انھیں کھلاوے — ہوتے ہیں خون ناحق غنچے کی لالیوں پر

اے مصحفی بتا تو، کیا کچھ خوشی ہوئی ہے
ہے ان دنوں جو چہرہ تیرا بحالیوں پر

۱۴۳

دیکھیے کیا جی پہ گذرے نو بہار آئی ہے پھر — گل نے بعد اک سال کے شکل اپنی دکھلائی ہے پھر

رُت بُری ہے یہ، خدا جانے مرا کیا حال ہو — اس ہوا میں یعنی مجھ کو بیم رُسوائی ہے پھر

جوش ماریں ہیں دلوں میں مرد و زن کے ولولے — چھوڑ گھر کو خلق بُستانی و صحرائی ہے پھر

دم بہ دم بادِ صبا سے آئے ہے بٹنے[3] کی بو — غارتِ آرام و تاراجِ شکیبائی ہے پھر

مصحفی چل تو بھی صحرا کو کہ ظالم ان دنوں
سبزہ و گلزار کا عالم تماشائی ہے پھر

---

[1] آصفیہ: پر اس پر بھی نہیں ہے — [2] آصفیہ: سیرِ چمن کو

[3] نسخہ الف: مستی، (بٹنا ــ اُبٹن، عورتیں جلد کی صفائی کے لیے زمانۂ قدیم میں استعمال کرتی تھیں)۔

۱۴۴

سر پہ گل طرّہ کا کروا رکھ کے لائی ہے بہار
ہم سے بھگوا مانگنے اس سال آئی ہے بہار

جب پکڑ کر لے چلا صیّاد بلبل کے تئیں
مُنھ سے نکلا اس کے یہ، تیری دُہائی ہے بہار

یہ جو اک لالہ کا تختہ آئے ہے مجھ کو نظر
اس کی سرخی نے مری چھاتی جلائی ہے بہار

کس طرح تیری وفا کا معتقد ہووے کوئی
عارض گل پر تو رنگ بے وفائی ہے بہار

جس زمیں سے لالہ اُگتا ہے کسی مُدّت کے بیچ
اُس زمیں میں ہم نے جوے خوں بہائی ہے بہار

رہ کوئی دن اور گلشن میں کہ بعد اک سال کے
تو نے مشتاقوں کو شکل اپنی دکھائی ہے بہار

ایک تنکا صحن گلشن[۱] میں نہ آوے گا نظر
کیوں کہ رنگ اکثر گلوں کا کہربائی ہے بہار

نالۂ بلبل کو گل کیوں کان دھر سنتا نہیں
تجھ سے پوچھوں ہوں یہ کیا بے اعتنائی ہے بہار

آب جو سے آئینہ رکھتی ہے اپنے سامنے
ٹک ادھر تو دیکھ یہ کیا خود نمائی ہے بہار

مصحفی میں کیا کروں گا جا کے اب گلشن میں میاں
چشم پُر خوں نے یہیں مجھ کو دکھائی ہے بہار

۱۴۵

رہتا ہے دل اس زلف پریشاں میں گرفتار
وہ اس میں گرفتار، ہیں زنداں میں گرفتار

اے قوّتِ پرواز مدد کیجیو اس کی
ہو جائیے نہ پروانہ چراغاں میں گرفتار

کس طرح چھڑاؤں میں یہ کنجشک دل اپنا
اس طفل کے ہے گوشۂ داماں میں گرفتار

وہ ترکشِ پُر تیر ہوا کیا کہیں خالی
جو صید نظر آئے نیستاں میں گرفتار

اندیشہ ہے کس زلف کا مجھ کو کہ رہوں ہوں
شب تا بہ سحر خواب پریشاں میں گرفتار

چشم اس کی ہے وہ باز کہ دل جس نے کیا ہے
جوں صید زبوں پنجۂ مژگاں میں گرفتار

کس طرح سے سُلجھائے[۲] تری زلف پریشاں
یہ ہاتھ تو رہتا ہے گریباں میں گرفتار

تعلیم گرفتاریٔ دل قیس نے لی ہے
اس وقت کہ وہ تھا نہ دلبستاں میں گرفتار

اس شوخ نے پھر مصحفیٔ خستہ کے دل کو
لے جا کے کیا چاہ زنخداں میں گرفتار

---

[۱] آصفیہ: تنکا خس کا [۲] نسخۂ الف: سلجھاؤں

۱۴۶

عالم ہے تری زلف پریشاں میں گرفتار
کیوں تو نے کیا ہے مجھے زنداں میں گرفتار

جس سر کے پھرا گرد ترا دورۂ دامن
وہ سر ہوا پھر گردشِ دوراں میں گرفتار

اُس آہوئے وحشی کو کوئی کیوں کے کرے صید
دن رات وہ رہتا ہے دلبستاں میں گرفتار

آتا ہے مجھے بزدلیٔ دل کا تاسّف
جا کر یہ ہوا ہے صفِ مژگاں میں گرفتار

ہے زلف سیہ سایۂ ہر شاخ خمیدہ
ہو جائیو مت جا کے گلستاں میں گرفتار

اس چشم کے ہیں سیکڑوں کشمیر میں کشتہ
اس زلف کے ہیں لاکھوں صفاہاں میں گرفتار

اے مصحفی ہم سے نہ گئی حسن پرستی
نت ہم تو رہے الفتِ طفلاں میں گرفتار

۱۴۷

میری اس کی ہے ملاقات کچھ اور
گرمیاں رہتی ہیں دن رات کچھ اور

حسن اتنا تو نہ تھا لیلیٰ میں
دل کے آ جانے کی ہے بات کچھ اور

ذکر میرا جو چلا کچھ تو کہا
ہے زمانے سے وہ بدذات کچھ اور

گل کی پتّی اسے کب لگتی ہے
اے گل تر ہے تری گات کچھ اور

یارِ صادق نہ رہے دُنیا میں
اب کی یاروں کی ہیں نیّات کچھ اور

لگ سکے ہے کوئی اس کو ساون
چشمِ گریاں کی ہے برسات کچھ اور

مصحفی تو ہے وہ مردِ کامل
جس کی عالم سے ہے اوقات کچھ اور

۱۴۸

یوں ہے یہ نقاب اُس بُتِ بے پیر کے مُنھ پر
جیسے ورقِ سادہ ہو تصویر کے مُنھ پر

کیا جانے کسے ذبح کیے آئے ہے کافر
ہے آج تو سرخی تری شمشیر کے مُنھ پر

کس زلف کے حلقے کا تصوّر ہے جو ہر دم
ہے آنکھ مری حلقۂ زنجیر کے مُنھ پر

گو غیر کی خواہش ہے ترے دل میں تو ہو وے
یہ بات نہ کہہ عاشق دلگیر کے مُنھ پر

عزت نہیں اُس صید کی کچھ صید حرم میں
جو صید کہ آیا نہ ترے تیر کے مُنھ پر

برسات میں شق پڑتی نہیں اس میں، یہ منعم
ہنستی ہے خرابی تری تعمیر کے مُنھ پر

منھ جس نے کیا تیری طرف، چشم نے تیری
جو تیر بھی مارا، اسی نخچیر کے مُنھ پر

اے مصحفی کر شکر کہ ہے رنگِ اجابت
اس رات تری آہ کی تاثیر کے مُنھ پر

۱۴۹

ارجن سا بشر آ نہ سکا تیر کے منھ پر
دشوار ہے چڑھنا تری شمشیر کے منھ پر

کچھ بھا جو گیا جی کو تو بس ہو گیا بے خود
منھ اپنا میں رکھ کر تری تصویر کے منھ پر

مت چشم حقارت سے مرا زخم جگر دیکھ
بوسے دیے ہیں اس نے ترے تیر کے منھ پر

وہ تجھ کو نگل جائے گا اے شمع کے شعلے
کہتا ہوں نہ چڑھ اتنا تو گلگیر کے منھ پر

گیرندہ تر اس سے ہے تری زلف کا حلقہ
ہم تو یہ کہیں حلقۂ زنجیر کے منھ پر

اے مصحفی تو اور کہاں شعر کا دعوے
پھبتا ہے یہ اندازِ سخن میر کے منھ پر

۱۵۰

کیا ہی شیریں زباں ہے کافر
کیا ہی مصری کی جان ہے کافر

لاغری اس کمر کی تو دیکھو
کس قدر ناتواں ہے کافر

نازکی اُس بدن کی کیا کہیے
تو کہے دھان پان ہے کافر

تو تو کافر نہیں، خدا کی قسم
تیری کافر زبان ہے کافر

دل مجھے چھوڑتا نہیں اک دم
کس قدر بدگمان ہے کافر

چین سے کیا زمیں پہ بیٹھیں ہم
سر پہ یہ آسمان ہے کافر

مصحفی پوچھ مت صنم کا حال
اب تو نامہربان ہے کافر

۱۵۱

چنداں رہ کرم سے چلے آؤ میرے گھر — اک آدھ شب جو چاہو تو رہ جاؤ میرے گھر
باور تو جب کروں میں جو ملنے کی غیر سے — اپنی خوشی سے آ کے قسم کھاؤ میرے گھر
بیٹھے رہو خدا کی قسم کون وضع ہے — کیدھر چلے ہو دھوم نہ مچواؤ میرے گھر
یہ جانیو کہ آج ہے وعدہ کسی کے ساتھ — وحشت میں دوستو جو مجھے پاؤ میرے گھر
واشد ہر اک کے گھر میں مناسب نہیں تمھیں — زلفوں کے بال بیٹھ کے سلجھاؤ میرے گھر
کہتا ہے مصحفی کہ بہ تقریب بازدید — اے دوستاں گر اب کی اسے لاؤ میرے گھر

یہ جام دوں کہ ہو کے وہ مستی میں بے حواس
گھر آ کے یوں کہے : مجھے پہنچاؤ میرے گھر

۱۵۲

ہم تو سوئے نہ فراغت سے کبھی بستر پر — ہم نے سر اپنا رکھا بھی تو دم خنجر پر
دل سے کرتا ہوں میں یوں کسب حرارت دن رات — ہاتھ جاڑے میں رہیں جیسے سدا مجمر پر
میں تو کیا چیز ہوں لیکن ترے کوچے کے گدا — پشت پا مارتے ہیں حشمت اسکندر پر
حسن سادہ کے جو عالم میں تماشائی ہیں — آنکھ پڑتی ہی نہیں ان کی زر و زیور پر
زخم سینے میں لگے ہیں مرے اس تیغ کے یوں — جیسے پرکار سے خط کھینچے کوئی مسطر پر
ان کو پاپوش میسر نہ ہوا جسم کے تئیں — کفش پا رکھتی تھی جن کی کہ شرف افسر پر
کہہ تو کیا وصف ہے اے چاہ زنخداں تجھ میں — نہیں جاتا جو ترا تشنہ لب کوثر پر

مصحفی سمجھے وہ کیا حال فقیراں جس نے
گرم پہلو نہ کیا ہو کبھی خاکستر پر

۱۵۳

پھولوں کی چھڑی کھائے ہے گل بند قبا پر — ہے آب رواں غش ترے سینے کی صفا پر
کیا عشق کے کوچے میں نہیں امن کی جاگہ — ہر لحظہ بلا ہوتی ہے نازل جو بلا پر

اس شوخ کے کوٹھے سے پڑی برسے ہے سبزی
اے راہ رواں، تم بھی نظر کیجیو ہوا پر

تم دیکھو ہو واں آئینہ، یاں آنکھوں میں جی ہے
اب دیکھیے کیا ہو، نظر اپنی ہے خدا پر

کیا دیجیے دعا اس کو کہ یہ رسم ہے یاں کی
گر دیجیے دعا، ملتی ہے دشنام دعا پر

آیا تھا وہ آنکھوں کو کفک اپنی لگائے
دل لوٹ گیا رات مرا رنگ حنا پر

کیا چاہیئے بستر کو تجھے مخمل و قالیں
اے مصحفی گر رہ نہ کہیں فرش گیا پر

۱۵۴

ہم صبح کو کوچے سے ترے رہ گئے چل کر
دیکھا کہ گیا قافلہ منزل سے نکل کر

کیا قہقہہ اک مار کے اس دم وہ ہنسا ہے
مجلس میں گرے اس کی جو ہم رات سنبھل کر

پڑتا ہے ترے پانو پہ کیا لطف سے آ کر
دامن ترا، ہر دم تری ٹھوکر سے اچھل کر

پابوسی کو سر ہم نے جھکایا تھا کہ وو ہیں
کل رہ گئی اس شوخ کی تلوار اگل کر

تھا تر مرے گریہ سے زبس سنگ در اس کا
مجلس سے جو نکلا سو گرا وو ہیں پھسل کر

آ لاش پہ کشتہ کی ترے، اہل تماشا
پھر پھر گئے آخر کف افسوس کو مل کر

شب شمع کے شعلے نے جو کی چرب زبانی
پروانہ ہوا خاک کی ڈھیری وو ہیں جل کر

اے مصحفی ہے کہنہ زمیں یہ تو دلّی کی
کہہ اور غزل، قافیہ تو اس کا[1] بدل کر

۱۵۵

اتنا تو نہ جینے سے فلک مجھ کو خفا کر
جو مرنے کی مانگوں میں دعا ہاتھ اٹھا کر

غنچہ سا دہن جن نے ترا آپ بنایا
غنچے سے کہا پیرہن صبر قبا کر

میں آہ کے شعلے سے بھڑک اٹھا ہوں سارا
کیا جانیے کیدھر گئے تم آگ لگا کر

لائی جو قضا مقتل تسلیم میں تجھ کو
ہم بیٹھ گئے تیغ تلے سر کو جھکا کر

پروانہ جلا شمع پہ جس وقت، یہ بولا
لے میں تو چلا تو کف افسوس ملا کر

گر خون جگر ہو نہ سکے اشک کا قطرہ
یارب تو اسے پنجۂ خوباں کی حنا کر

---

[1] آصفیہ: اس کا تو

صیّاد تو رہنے دے مجھے کنج قفس میں — جب تک کہ بہار آوے قفس سے نہ رہا کر

اے مصحفی مت دیکھ کسی زلف کے خم کو
دیوانے دل اپنا نہ گرفتار بلا کر

۱۵۶

کافر یہ جو بکھرے ہیں ترے بال ہوا پر — مارا ہے عجب طرح کا اِک جال ہوا پر
لوہو ہی برستا ہے تری تیغ نگہ سے — دیکھا تو عجب رنگ ہے اس سال ہوا پر
آہیں جو مری ہیں رخ خورشید کے دَر پے — دوڑا ہوا جاتا ہے وہ شہ چال ہوا پر
بلبل وہ مُوا کون گلستاں میں کہ جس کے — اُڑتے ہوئے پھرتے ہیں پَر و بال ہوا پر
یہ ابر سیہ تاب نہیں، اُڑ کے گیا ہے — عاشق کا مرے نامۂ اعمال ہوا پر

اے مصحفی گر یہ ہے تری آہ کی گرمی
تو کیوں کہ اُڑے طائر بے بال ہوا پر

۱۵۷

سنبل تر کے تئیں پردہ رخسار نہ کر — دلِ مرغانِ چمن اس میں گرفتار نہ کر
مُنھ دکھا دے کہ دم نزع ہے بیمار ترا — حشر پر اس سے میاں وعدہ دیدار نہ کر
سایۂ تیغ میں لے جا تو سر اپنے کے تئیں — گر ہے عاشق، ہوسِ سایۂ دیوار نہ کر
اے اسیر قفس محنتِ دوریٔ فراق — اس ہوا میں تو ہوائے گل و گلزار نہ کر
کل ترا نقش قدم طیش سے میرے آگے — کبک کو کہنے لگا دعویٰ رفتار نہ کر
صحبتِ شب کا سماں ہے تری آنکھوں سے عیاں — بادہ نوشی کا میاں مجھ سے تو انکار نہ کر

مصحفی عشق چھپانا ہی بھلا ہوتا ہے
گو تو عاشق ہے پر اس بات کا[1] اقرار نہ کر

۱۵۸

جان من جلوہ گری بر سر بازار نہ کر — جنس حسن اپنی کا ہر اک کو خریدار نہ کر

[1] نسخہ الف: تکرار

کیا سروکار تجھے میرے حزیں نالے سے
ہر دم اے مرغ چمن اس کی تو تکرار نہ کر

اس شب و روز کے قصے سے میں تنگ آیا ہوں
اتنا اے عمر مجھے زیست سے بیزار نہ کر

تیرے بن دیکھے جو اک دم میں، مُوا جاتا ہو
ایسے بے صبر سے تو وعدۂ دیدار نہ کر

منھ دکھا اپنا، کہ سکتے نہیں، ہے نزع کا حال
غافل آئینہ مرے سامنے ہر بار نہ کر

لاش رہنے دے مری خاک میں پنہاں، کے روز
قاتل اس فتنۂ خوابیدہ کو بیدار نہ کر

کعبہ و قبلہ میاں یار ترے ہوویں گے
کہہ کے یہ بات عبث ہم کو گنہ گار نہ کر

اور ہووے گا غرور اس کو، تو اے آئینے
خوبیٔ حسن سے یاں تک تو خبردار نہ کر

مصحفی چاہیئے کچھ ضبط بھی ہو عاشق کو
آگے ہر اِک کے، میاں، دردِ دل اظہار نہ کر

۱۵۹

جتنا کہ سراہا وہ ہوا اور بھی مغرور
جوں جوں اُسے چاہا وہ ہوا اور بھی مغرور

اَن بن رہی واں تو، وے اپنی طرف سے
میں نے جو نباہا وہ ہوا اور بھی مغرور

تعریف میں اس کی جو زباں سے مری نکلا
خوش وقتی میں "آہا" وہ ہوا اور بھی مغرور

گر اُس شہ خوباں کو کہا پیار سے میں نے
خورشید کلاہا، وہ ہوا اور بھی مغرور

اے مصحفی روؤں نہ کہ لگ چلنے سے میرے
آہا و فآہا وہ ہوا اور بھی مغرور

۱۶۰

جامہ ملتا ہے بدن سے ترے چسپاں ہو کر
ہم تو جاویں گے نکل چاک گریباں ہو کر

اس کے کوچے میں مری خاک بھی مجھ تک ہے نسیم
اُٹھ گیا میں تو گئی وہ بھی پریشاں ہو کر

جب ترے سامنے آتا ہے سحرگہ خورشید
صورت آئینہ رہ جائے ہے حیراں ہو کر

بوے پیراہن گل اس سے مجھے آتی ہے
شاید آئی ہے صبا طرف گلستاں ہو کر

کیا فضا باغ کا ہے، جاں مری ایسے میں
کر خجل کبک دری کو تو خراماں ہو کر

شعلۂ شمع گیا اس کے جو دامن سے لپٹ
جل گئے رات کو فانوس چراغاں ہو کر

آدمیت کی جو ہو وضع نہ دے ہاتھ سے وہ
آدمی چاہیئے حیواں نہ ہو انساں ہو کر

معجزہ دیکھ ترے رو دے کتابی کا صنم
دین میں آتے ہیں ہندو بھی مسلماں ہو کر

مصحفی مرغ چمن زمزمہ پیرا ہیں سبھی
ان دنوں باغ میں چل تو بھی غزل خواں ہو کر

۱۶۱

باندھی ہے ہم نے از بس جوں نے کمر فغاں پر
نالوں سے میرے آفت ہر شب ہے آسماں پر

مر ہی گیا نہ بلبل، صیاد کیا کیا یہ
رکھنا نہ تھا قفس کو دیوار گلستاں پر

ہم نے بھی کل تماشا جا کر انھوں کا دیکھا
انبوہ ہو رہا تھا اک اس کے کشتگاں پر

قد کی لچک کسو کی آتی ہے یاد مجھ کو
پڑتی ہے آنکھ اپنی جب شاخ ارغواں پر

ہوتا ہے دیکھ جس کو شرمندہ برگ سوسن
مسّی کی یہ اُداہٹ کافر کی ہے زباں پر

تو گھر سے گر نہ نکلا تو سر پٹک پٹک کر
دیویں گے جان اپنا ہم تیرے آستاں پر

جب وہ گیا چمن میں لے ہاتھ میں کماں کو
دو چار تیر پھینکے بلبل کے آشیاں پر

گو خاک میں ملے ہیں ہم گرد باد آسا
لیکن دماغ اپنا اب بھی ہے آسماں پر

اے مصحفی گئے ہیں کیا لے لے حسرتیں وے
آتا ہے گریہ مجھ کو احوال رفتگاں پر

ز

۱۶۲

کس کے مجروح یہ مدفوں ہیں تہ خاک ہنوز
گل زمیں سے جو نکلتے ہیں جگر چاک ہنوز

ہے مری خاک بگولے کی طرح چکّر میں
دست بردار نہیں گردش افلاک ہنوز

یار مل جائے گا اتنی بھی نہ بے صبری کر
ابتدا عشق کا ہے، اے دل غمناک ہنوز

نعش پر نعش چلی آتی ہے اس کوچے سے
بر سر رحم نہیں غمزۂ سفاک ہنوز

کس کی مست آنکھیں میں دیکھی ہیں جو ٹپکے ہے پڑا / رگِ مژگاں سے مری خونِ رگِ تاک ہنوز
خالِ عارض کو ترے اس نے کہیں دیکھا تھا / باغ میں لالہ کو ہے نشۂ تریاک ہنوز
قتل کا مصحفیٔ خستہ کے انکار نہ کر
شاہدِ خوں ہے ترا دامنِ نمناک ہنوز

۱۶۳

بیگانگی ہے اس کی ملاقات میں ہنوز / واحسرتا کہ فرق ہے دن رات میں ہنوز
فندق ان انگلیوں پہ نہیں ہے تو کیا ہوا / رنگینیاں وہی ہیں اشارات میں ہنوز
دیکھا تھا بات کرتے اسے ساتھ غیر کے / سو اپنا جی کھپے ہے اسی بات میں ہنوز
کیا شے ہے تو کہ کچھ نہیں آتا سمجھ میں ہائے / ہم غوض کر رہے ہیں تری ذات میں ہنوز
ایک دن گزک کو اس کے میں دیکھا تھا پیالے / خوں رو رہا ہوں اس کی مکافات میں ہنوز
وہ نازکی کے دن نہیں، پر تو بھی ہے صنم / لطفِ صفائے صبح، تری گات میں ہنوز
سمجھا ٹک اپنے دیدۂ تر کو تو مصحفی
باقی کئی مہینے ہیں برسات میں ہنوز

۱۶۴

خون ٹپکتا ہے مرے دیدۂ گریاں سے ہنوز / دل کو پیوند ہے اُس خنجرِ مژگاں سے ہنوز
اس کے ہاتھوں سے کہاں جاؤں کہ یہ دستِ جنوں / دست بردار نہیں میرے گریباں سے ہنوز
یار مارے گئے سب کوہکن و وامق و قیس / بچ کے آیا نہ کوئی عشق کے میداں سے ہنوز
شبِ ہجراں کے اٹھائے ہیں ہیں کیا کیا صدمے / تب تو دل کانپے ہے نامِ شبِ ہجراں سے ہنوز
ایک شب خواب میں دیکھا تھا کہیں اس کے تئیں / جی الجھتا ہے تری زلفِ پریشاں سے ہنوز
دیکھ کر کشتہ مجھے در پہ ترے کہتی ہے خلق / یہ عمل تو نہ ہوا تھا کسی انساں سے ہنوز
مصحفی گبر ہے یارو نہ مسلماں لیکن
جی سے نفرت ہے اُسے گبر و مسلماں سے ہنوز

١٦٥

طوطی میں کہاں ہے تری گفتار کا انداز
لہجے کی ادا اور یہ تکرار کا انداز

تصویر جو کھینچی بھی مری مانی نے اس میں
گردن سے تو نکلے تھا گنہ گار کا انداز

نازاں ہے بہت طرۂ دستار پہ خورشید
دیکھا نہیں تیرے گل دستار کا انداز

تا دیر میں کل تاک کے سائے میں رہا بیٹھ
نکلے تھا ترے سایۂ دیوار کا انداز

نیچے ہی کو دیکھے ہے ازبس سیکھ گئی ہے
نرگس کبھی تری نرگس بیمار کا انداز

اک عمر جو کی سعی بہت کبک دری نے
آخر کو اڑایا تری رفتار کا انداز

ہر چند کہ ہے سادگی بھی اس کی اک آفت
پر قہر ہے غصے کی ادا، پیار کا انداز

نے ابر بہاری ہی لگے اس کے نہ شبنم
کچھ اور ہے اس دیدۂ خونبار کا انداز

اے مصحفی مت کر ہوسِ مجلسِ آصف
معلوم نہیں ہے تجھے دربار کا انداز

س

١٦٦

دور سے دیکھتے ہیں یار کا دیدار اور بس
فقط اک دید کے ہیں ہم تو گنہ گار اور بس

تو ہی اے یوسف ثانی جو نہ ہو تو کیا ہے
ہے ترے حسن سے ہی گرمیِ بازار اور بس

نیم بسمل کی طرح خاک پہ کب تک تڑپھوں
صدقے تیرے، تو لگا ایک ہی تلوار اور بس

اس نے کیوں چاک کیا پڑھ کے مرے خط میں تو
تھا سراسر گلۂ چرخ ستم گار اور بس

کچھ طمع اور زیادہ نہیں رکھتے تجھ سے
جی سے ہم ہیں تری چاہت کے گرفتار اور بس

تیرے کوچے سے سفر میں نے کیا تھا جس دن
تھے مرے ساتھ مرے دیدۂ خوں بار اور بس

مصحفی اس کے سوا کچھ ہو تو میں کافر ہوں
ہے مرے دل میں یہی آرزوے یار اور بس

۱۶۷

ٹک آکے بیٹھے جو وہ مہ جبیں ہمارے پاس
تو ہم یہ جانیں، ہیں دنیا و دیں ہمارے پاس

چلے گا قافلہ یاروں کا صبح، کیا کیجیے
کہ زادِ راحلہ مطلق نہیں ہمارے پاس

ہم آرزو میں تمھاری ہلاک ہوتے ہیں
خدا کرے کہ تم آؤ کہیں ہمارے پاس

پڑھیں ہیں چینِ جبیں ہی سے شعر ہم اس وقت
جب آکے بیٹھے کوئی نکتہ چیں ہمارے پاس

ہمارے حال کو سن کر بہت ہوا حیراں
گیا جو بیٹھ کوئی خوش نشیں ہمارے پاس

خدا ہی جانے کہ اس دل کو کیا ہوا یارو
جب آکے بیٹھے تو بیٹھے حزیں ہمارے پاس

۱۶۸

اس دلِ ویران کا عالم نظر آیا کہ بس
رات اس سنسان کا عالم نظر آیا کہ بس

یوں ہے سب خلقت خدا کی، جس کا عالم دیکھیے
لیکن اس انسان کا عالم نظر آیا کہ بس

شب جو کھل کھل کر وہ باتیں پیار کی کرنے لگا
اُس بُتِ نادان کا عالم نظر آیا کہ بس

شورِ طوفاں، جوشِ عماں، سب ہے اس انداز پر
دیدۂ گریان کا عالم نظر آیا کہ بس

مجلسِ خنیاگری میں شب گذر اپنا بھی تھا
واں مسی و پان کا عالم نظر آیا کہ بس

چاندنی شب میں جو گئی ہیں[1] اس کے ماتھے پر نگاہ
ہائے وہ افشان کا عالم نظر آیا کہ بس

لکھنؤ میں مصحفی آیا جو میں دِلّی کو چھوڑ
یاں بھی اِس اِس آن کا عالم نظر آیا کہ بس

۱۶۹

کر دیا ہے مجھ کو دو نالوں نے اس کے بے حواس
حد رقیق القلب ہوں میں، کر اسی کو تو قیاس

عیسیٰ مریم بھی اپنی سی بہت کچھ کر گیا
پر دوا، بیمار کو کوئی دوا آئی نہ راس

حسن سے رکھتی ہے یہ اندازِ جنگِ عشق شوخ
دست بُردِ اوّل تو پھر بعد اُس کے بوسہ پھر مساس

---

[1] آصفیہ: چاندنی میں شب جو گئی ہیں

قطرہ ہائے خوں ہیں گرد لخت دل یوں چشم میں
ٹُھنیاں جیسے جڑی ہوویں نگیں کے آس پاس

کھل کھلا کر یاں نہ ہنستا منھ پر شبنم کے کبھو
اے صبا ہوتا گر اس کو خاطر بلبل کا پاس

ایک شب سونگھا تھا میں نے اس کے جوڑے کی مہک
خوش نہیں آتی مجھے اس دن سے ہر گز گل کی باس

جی میں آتا ہے کہ اٹھ جاویں کسی صحرا کو ہم
ان دنوں اے مصحفی ہے شہر سے خاطر اداس

ش

۱۷۰

کس منھ سے ہم جہاں میں کریں آرزوئے عیش
اک غنچہ ہم کو یاں نہیں دیتا ہے بوئے عیش

جیدھر نظر گئی رخ غم ہی نظر پڑا
دیکھا نہ آنکھ کھول کے ہم نے تو روئے عیش

بنتے نہیں کسی کی حریفاں بزم یار
وارانگ ناؤ نوش ہے یا ہائے و ہوئے عیش

پھینکا ہے آسماں نے ز بس سنگ تفرقہ ق
اس مے کدے میں برسر جام و سبوئے عیش

دستِ سبو شکستہ ہے، اور جام اب تلک
لایا نہیں زباں پہ کبھی گفتگوئے عیش

بزم جہاں سے اٹھ گئے عیاش مصحفی
ہم ایک رہ گئے ہیں سو افسانہ گوئے عیش

۱۷۱

جس آنکھ کو ہو رخنۂ دیوار کی تلاش
پھر کیوں کرے وہ شاہد بازار کی تلاش

بلبل کی لاگ کا ہیں دوانہ ہوا اسے
کنج قفس میں ہے گل و گلزار کی تلاش

کیا ہوگا آفتاب قیامت میں خلق کو
ہووے گی جب کہ سایۂ دیوار کی تلاش

اس دست رو سیاہ کا ہر دم ہے کہیں بُرا
رہتی ہے اس کو سادہ ہی رخسار کی تلاش

اے ابر نو بہار تو اب اس کے منھ نہ چڑھ
رنگیں ہے اپنے دیدۂ خوں بار کی تلاش

دل یک نگاہ لطف کا رہتا ہے منتظر
بائع کو جس طرح ہو خریدار کی تلاش

اتنا میں گم ہوا ہوں سخن میں کہ مصحفی
کرتا ہے ہر کوئی مرے اشعار کی تلاش

۱۷۲

یا عہد وفا ہوا فراموش — یا بوجھ سمجھ کیا فراموش
آجائے ہے جب وہ سامنے سے — ہو جائے ہے سب گلہ فراموش
جب یاد ہے، اس کے منہ سے نکلا — میں نے بھی وہیں کہا: فراموش
دیکھا نہ سنا میں اب تلک تو — بندے کو کرے خدا فراموش
کیا ہووے کبھی گر اس طرف سے — ہو جائے رہِ صبا فراموش
اس کو میں اگر ترا گذر ہو — کیجیو نہ ہمیں صبا فراموش
جس خط میں لکھا تھا میں کچھ احوال — قاصد نے وہ خط کیا فراموش
نسیان ہے یاں تلک کہ خط میں — میں یاد کی جا لکھا فراموش
دل میں گذرا جو کوئی مضمون — لب تک آتے ہوا فراموش
جب لکھنے لگوں ہوں خط میں اس کو — ہو جائے ہے مدعا فراموش
کیا کیا نہ فراق ہم نے دیکھے ق — کیا کیا ہوئے آشنا فراموش

پر حیف ہے مصحفی کے[1] دل سے
ہوتا نہیں غم ترا[2] فراموش

ص

۱۷۳

ہے دام میں زلفوں کے گرفتار کوئی شخص — اس کوچے میں آتا ہے شب تار کوئی شخص
لے جاؤں ہوں گذری میں دل اپنا میں ہمیشہ — شاید کہ ہو اس کا بھی خریدار کوئی شخص

---

[1] آصفیہ: کہ ، [2] آصفیہ: مرا

جب آپ نے غرفے سے نکالا تھا سر اپنا
کہتے ہیں کھڑا تھا پس دیوار کوئی شخص

ہر اک کو نہ تم نرگس بیمار دکھاؤ
کیا فائدہ ہو جائے جو بیمار کوئی شخص

ابرو کی یہ جنبش ہے تو کوچے میں تمھارے
تم دیکھو گے کھا جائے گا تلوار کوئی شخص

صنعاں سے میں واقف نہیں، ترسا کی گلی میں
پھرتا تو ہے پہنے ہوئے زنّار کوئی شخص

مت نام لو میرا، یہ کہو اس سے عزیزو
کھینچے ہے ترے عشق میں آزار کوئی شخص

آؤں میں شب تیرہ ترے گھر میں تو میرا
جی دھڑکے ہے ہو جائے نہ بیدار کوئی شخص

ساقی کی نگہ نے یہ چھکایا ہے کہ اب تک
اس بزم میں ہرگز نہیں ہشیار کوئی شخص

اے مصحفی درد دل غم ناک کو میرے
اس شوخ سے کرتا نہیں اظہار کوئی شخص

آتا ہے یہ اب جی میں کہ خط دے کے، بہ اجرت
ہشیار سا بھیجوں میں ہی ناچار کوئی شخص

۱۷۴

دل فرش ہوا جائے ہے آغاز شب رقص
یاں آگو ہی معلوم ہیں انداز شب رقص

کیا زیر و بم اُن کے کی ہے آواز برابر
یہ ساز طلسمات ہیں یہ ساز شب رقص

مانی تو مرقّع تو ہمیں اپنا دکھا دے
ہم تجھ کو دکھا دیویں گے پرواز شب رقص

ہم ماہ کا دیدہ ہے لگا اس کی طرف کو
ہم چشم کواکب ہیں نظر باز شب رقص

دامن کو جھٹک کر جو وہ بیدرد گئی ہے
جاتا نہیں آنکھوں سے مری ناز شب رقص

گانے سے حیا کیوں اُسے پھر بزم میں آوے
ہو نالہ مرا جس کا ہم آواز شب رقص

یہ جلوہ گری ہوتی ہے کیا پردۂ شب میں
اے مصحفی ہم پر نہ کھلا راز شب رقص

ض

۱۷۵

ہوتا ہے حسن روسے ترے آرسی کو فیض
بہتر تو ہے کسی سے جو پہنچے کسی کو فیض

تربت پہ میری رکھ کے قدم اس نے یوں کہا: نقش قدم سے اپنے ہوا ہے اسی کو فیض
ہے گو کہ آفتاب حقیقت نقاب میں نزدیک و دور پہنچے ہے اس سے سبھی کو فیض
بوسہ لیا جو میں ترے لب کا تو کیا ہوا ہوتا ہے آدمی سے میاں آدمی کو فیض
اک عمر لکھنؤ میں رہا یہ، ولے تباہ
ان منعموں سے کچھ نہ ہوا مصحفی کو فیض

۱۷۶

نہ مسیحا کو دکھایا جگر ریش غرض ہم کو آئی نہ کسی سے کبھی در پیش غرض
در پہ اپنے مجھے دیکھا جو کئی بار، کہا سخت مبرم نظر آتا ہے یہ درویش غرض
کیا کریں شکوۂ روزی کہ فلک کے ہاتھوں رزق ہم کو بھی پہنچتا ہے کم و بیش غرض
کیوں ترے سامنے ہم اپنا بھرم بھی کھوویں تجھ سے نکلے ہے کسی کی بت بدکیش غرض
رنج و راحت سے ہیں اے مصحفی جو مستغنی
نوش سے کام ہے کچھ ان کو نہ با نیش غرض

۱۷۷

کیوں نہ اب مژگاں سے دیکھے تیغ اور خنجر کی عرض دیکھنے بیٹھی ہے وہ چشم سیہ لشکر کی عرض
طبلقیں کھولے ہوئے مستوئ باد بہار دیکھتا ہے لالۂ صد برگ کے دفتر کی عرض
پر نہیں میرے، نہیں تو اڑ کے آتا باغ تک اے صبا کہیو یہ گل سے بلبل بے پر کی عرض
دوش ہستی پر گراں ہوں مجھ کو اب آزاد کر خدمت شمشیر میں یہ ہے ہمارے سر کی عرض
اے فلک چاہیں ہیں سر پوشی کو اک دستار وار تجھ سے ہم رکھتے نہیں کچھ تاج اور افسر کی عرض
مرغ بے پروا طبیعت نے نہ بات اس کی سنی شاہد گل دے رہا کتنی زر و زیور کی عرض
ہستی اعراض کا، ہے ذات جوہر سے قیام
مصحفی پروا نہ رکھے کس طرح جوہر کی عرض

۱۷۸

گنتا تھا بس کہ اپنے تئیں خاکسار محض آخر ہوا میں راہ میں اس کی غبار محض

دعویٰ برابری کا نہیں تم سے کچھ مجھے — بندے کو اپنے جانیے خدمت گذار محض
مدت کے بعد ہم کو غم دل کا آشنا — اک تو ملا ہے، سو بھی تغافل شعار محض
کیا تجھ سے اختلاط کا دعویٰ کریں کہ یاں — پہلو میں ایک دل ہے سو ہے بے قرار محض
اک دن دکھا گیا تھا جھلک اپنی، اب تلک — دریا برنگ آئینہ ہے انتظار محض
عاشق کا اعتبار ہی کیا اس کے روبرو — عاشق کو جانتا ہے وہ بے اعتبار محض

تم ہی[1] کرو اعانت اوقات مصحفی
اس روزگار میں ہے وہ بے روزگار محض

ط

۱۷۹

عیش کہاں کدھر نشاط، کہتے ہیں کس کو انبساط — خواب و خیال ہو گیا ہم کو تو عیش اور نشاط
آنکھیں سلا کے آؤں گا اب تری بزم میں کہ ہائے — دیکھوں میں تجھ کو کس طرح غیر سے گرم اختلاط
جان و دل اس کو ہم نے تو پہلے ہی چاہ میں دیا — آگو ہی نذر کر چکے اپنی جو کچھ کہ تھی بساط
جوش جنوں کے ہیں یہ دن، جاویں نہ سوئے کوہ و دشت — چاہیے اپنی ہم کریں موسم گل میں احتیاط
عرصہ میں شاہ سیکڑوں آئے ہیں اس زمین پر — رزم رہی ہے درمیاں، جب سے بچھی ہے یہ بساط
داغ کہن کو تازہ پھر کرتے ہیں ہائے ہم نشیں — یاد جب آئے ہیں ہمیں اس کے قدیم ارتباط

شب سے زیادہ مصحفی رہنے کا اس میں کیا ہے لطف
دہر ہے اک کہن سرا، چرخ ہے اک کہن رباط

۱۸۰

حسن نے بھیجا ہے لکھ لعل شکر خا کو خط — لکھیں گے اس درد کا ہم بھی مسیحا کو خط
روز جدائی کیے اس نے تو دفتر سیاہ — تم نے بھی لکھا کبھی عاشق رسوا کو خط

---

[1] الف : تم بھی

مزرعِ دل، سوختہ گو کہ تو ہے غم نہ کھا — دیدۂ تر نے مرے لکھا ہے دریا کو خط
طوق گلو ہو گئی میرا وہ زنّار زلف — جوں مئے کم دے گئی گردن مینا کو خط
اس کی کجی اب تلک ہم سے نہ یک مو گئی — ہم نے مکرّر لکھا زلف چلیپا کو خط
آج دیا چاہیے ہے دست جنوں تیرے ہاتھ — چاک گریباں مرا، دامن صحرا کو خط
کام کسو سے ہے کیا، وہ جو ہیں اہل کمال
لکھتے ہیں کب مصحفی مردم دنیا کو خط

۱۸۱

کیا لکھے اس کے تئیں اب کوئی ہم سار کا خط — ہائے پڑھتا ہے وہ کب اپنے گنہ گار کا خط
ہم نے یک بار ترے زخم ستم جھیلے ہیں — کون سا عضو ہے جس پر نہیں تلوار کا خط
یوں ہے یک دورِ فلک مرکزِ عالم کا محیط — گرد نقطے کے ہو جس طرح کہ پرکار کا خط
بس کہ خطرے سے تری خو کے نہ بھیجا اس نے — زیر بالیں ہی رہا نت ترے بیمار کا خط
اے نسیم سحر، یک لخت جگر لیتی جا — سوئے گلشن کہ یہ ہے مرغ گرفتار کا خط
شکوہ کیوں کر میں تمھارا نہ کروں اے مشفق — ق آ گیا ہاتھ جو اک دن مرے اغیار کا خط
لے کے قاصد سے بہت شاد ہوا میں جی میں — یہ سمجھ کر، مجھے آیا ہے مرے یار کا خط
کھول کر اس کو جو دیکھا تو ہر اک سطر میں واں — تھا مرے قتل کا مضمون کہ تلوار کا خط
آپ کو اس کا جو باور نہ ہو تو دکھلا دوں — اب تلک کیسے میں موجود ہے سرکار کا خط
خط اغیار سے، مکتوب بنایا اس نے
طاق نسیاں پہ رہا مصحفی زار کا خط

ظ

۱۸۲

گل پھول کی خوشی رہی سرو و سمن کا حظ — اب کی صبا نے خوب اڑایا چمن کا حظ

پروانہ پائے شمع کہے تھا یہ بزم میں — تھا پائے بوس شمع تلک بس لگن کا حظ
آپس میں ساری رات رہیں بوسہ بازیاں — لُوٹا ہے[1] میں نے خوب تمھارے دہن کا حظ
دلّی کی قدر دِلّی سے نکلے پہ ہوئی ہمیں — غربت میں یاد آئے ہے، سچ ہے، وطن کا حظ
کیوں کر ملوں نہ ہاتھ کہ شانے نے ساری رات — لوٹا ہے اس کی زلف کی ہر اک شکن کا حظ
پہنچے تھا ہاتھ تا بہ گریباں گل مرا — تھا موسم بہار میں دیوان پن کا حظ
بخت ان کے ہیں جو سو کے ترے ساتھ لے گئے — گہہ پیرہن کا لطف تو گاہے بدن کا حظ
محظوظ کیا ہو سن کے کوئی اب کسی کے شعر — تھا ہم تلک ہی بزم جہاں میں سخن کا حظ

تنہا چمن میں جاکے، میں غم دیدہ کیا کروں
بن یار مصحفی نہیں سیر چمن کا حظ

۱۸۳

نکل گیا مرے منھ سے کہیں خدا حافظ — تو بولا ہو کے وہ چیں بر جبیں "خدا حافظ!"
چراغ صبح ہوں اب تجھ سے میری رخصت ہے — چلا میں بزم سے بے آستیں خدا حافظ
تو ہے وہ فتنۂ روئے زمیں کہ دیکھ تجھے — ہمیشہ کہتے ہیں اہل زمیں خدا حافظ
چلا ہے آج تو سیر چمن کو گرما میں — ترے بدن کا ہے اے نازنیں خدا حافظ
یہ جتنے بندے ہیں سب کا کوئی ہے پشت و پناہ — جو غور کیجیے تو کس کا نہیں خدا حافظ

صنم وہ کافر خوں خوار مصحفی کا ہے
کہ جس کو دیکھ کہیں اہل دیں خدا حافظ

۱۸۴

یوں وہ بت کافر ہے دل زار سے محظوظ — صیّاد ہو جوں مرغ گرفتار سے محظوظ
ہم اک نگہ دور کو رہتے ہیں ترستے — آئینہ ہے خال و خط و رخسار سے محظوظ
شمشیر اجل کو بھی سراہا نہیں اُس نے — جو کشتہ ہوا ہے تری تلوار سے محظوظ
اے گل ابھی جانے کا نہ کر قصد چمن سے — نرگس ہے تری نرگس بیمار سے محظوظ
اس شوخ کی یارو یہ طبیعت ہے کہ دو دن — دو چار سے ناخوش ہے تو دو چار سے محظوظ

[1] الف: لوٹا مسی نے

ہم موئے کمر کو ترے زنار کریں گے
کافر ہے اگر رشتۂ زنار سے محظوظ

اے مصحفی جیتا رکھے حق تجھ کو بہت سا
کیا رات ہوئے ہیں ترے اشعار سے محظوظ

ع

۱۸۵

پردۂ فانوس میں یوں تو نہاں جلتی ہے شمع
دل جلے ہے جس طرح میرا، کہاں جلتی ہے شمع

چشم تر سے یوں نمایاں ہے فروغ داغ دل
جیسے پانی میں کبھو اے مہرباں جلتی ہے شمع

تو جو مجلس میں نہیں ہوتا تو پیارے تجھ بغیر
بو سے بد دیتی ہے اور جوں استخواں جلتی ہے شمع

ضبط سوز عشق کوئی اس سے آ کر سیکھ لے
اس زباں پر دیکھیو کیا بے زباں جلتی ہے شمع

لائے ہے جلنے کو پروانے کے واں خاطر میں کون
آگ کا شعلہ لیے سر پر جہاں جلتی ہے شمع

اس کے جلنے میں عجب آہستگی ہے دیکھیو
آفریں اِس کو، بطور عاشقاں جلتی ہے شمع

کس کی طاقت ہے کہ لاوے لب تلک یاں آہ گرم
یہ وہ مجلس ہے کہ جس میں بے دخاں جلتی ہے شمع

سبزۂ خط ہو سکے ہے حسن کا روپوش کب
پردۂ فانوس مینا میں عیاں جلتی ہے شمع

گریہ سوز دل پہ عاشق کو روا ہے مصحفی
دیکھ دیوانے بچشم خوں فشاں جلتی ہے شمع

۱۸۶

ساتھ پروانے کے راتوں کو جلا کرتی ہے شمع
بے وفا کیوں کر کہوں اس سے وفا کرتی ہے شمع

کس کا غم اس کو لگا ہے نہیں معلوم مجھے
اشک ریزاں ہی سحر تک جو رہا کرتی ہے شمع

مر رہے ہے جو لگن بیچ کوئی پروانہ
دیکھ اس کو کف افسوس ملا کرتی ہے شمع

میں وہ اندوہ بھرا ہوں کہ مری مجلس میں
بیٹھے ہے جو کبھو رو کے اٹھا کرتی ہے شمع

کون اس بزم میں آیا ہے یہ معلوم نہیں
کس سے فانوس کے پردے میں چھپا کرتی ہے شمع

طرفہ صحبت ہے کہ پروانے جو کرتے ہیں ہجوم
ان کی بے تابی کے عالم پر ہنسا کرتی ہے شمع

یاد میں ساعد سیمیں کی ترے شب تا صبح
گرمیٔ شوق سے پانی ہو بہا کرتی ہے شمع

حسن چھپتا نہیں اس پر بھی تو اس کافر کا
گرچہ فانوس بلوریں میں رہا کرتی ہے شمع

مصحفی میں تو وہ پروانۂ دل سوختہ ہوں
جس کے جلنے سے پگھل کر کے بنا کرتی ہے شمع

۱۸۷

لے گیا پروانہ دل میں حسرت دیدار شمع
سرد ہو جاوے الٰہی گرمیٔ بازار شمع

دیکھیو کیا صبح کا نزدیک پہنچا ہے طلوع
دم بدم ہوتی ہے افزوں زردیٔ رخسار شمع

کیوں نہ وہ مجلس میں آوے باشکوہ سروری
شعلہ طرّہ ہے تو داغ شعلہ ہے دستار شمع

دیدۂ بیدار میرا شب خیال یار میں
اشک ریزاں ہی رہا جوں دیدۂ بیدار شمع

جلتے جلتے آپ کو یک بار کر دینا تمام
کیا پسند آئے ہے یہ میرے تئیں رفتار شمع

تار ہیں میرے گلے میں کچھ گریباں کے سو وہ
سب کہیں ہیں قابل آتش ہیں جوں زنّار شمع

ہر کوئی ہوتا ہے واقف کب زبان حال سے
کون جز پروانہ سمجھے مصحفی گفتار شمع

۱۸۸

اک آن میں حق خدمت ہوا مرا ضائع
کرے کسو کی نہ محنت کے تئیں خدا ضائع

کسو کو دے کوئی پتّا تو کام بھی آوے
کرے ہے باغ میں پھولوں کو کیوں صبا ضائع

دل شکستہ مرا یار تک نہ پہنچا ہائے
ہوئی اس آئینے کی مفت میں صفا ضائع

طبیب لکھ تو نہ اس کے مریض کو مطبوخ
وہ پینے کا نہیں، ہو جائے گی دوا ضائع

خبر ہے تجھ کو بھی کچھ مصحفی کی یا کہ نہیں
کہیں اس نے شب اپنے تئیں کیا ضائع

۱۸۹

ہے تو تو وہ نقش قلم قدرت صانع
جس نقش میں جھلکے ہے بڑی قدرت صانع

گر دیکھے تو سیرِ چمن ندرتِ صانع — سو رنگ ہیں نقش قلمِ قدرتِ صانع
ہے تو تو رعونت شکنِ مانی و بہزاد — نقشے ہیں ترے نکلے ہے اک قوتِ صانع
جس نے کہ مرے چہرے کو دیکھا، یہی بولا — اس صنع کے اوپر ہے بجا حسرتِ صانع
صانع کی ترے حسن سے ہرگز نہ جھپکے آنکھ — گر حائل نظارہ نہ ہو حیرتِ صانع
ہیں مائل نظارہ ترے گبر و مسلماں — کیا جانیے کیا ہو گئی ہے غیرتِ صانع
کس عضو کی تعریف کروں کون سی جاگہ — ق مصروف غوامض نہ ہوئی ہمتِ صانع
بازو ہی ترے گول بنائے نہیں اس نے — نکلے ہے سراپا سے ترے قوتِ صانع

اے مصحفی گر دیکھے کوئی اس کا سراپا
ہر عضو سے ٹپکے ہے بڑی فطرتِ صانع

غ

۱۹۰

ہے مرے سینے میں روشن داغِ فرقت کا چراغ — گل نہ ہو ہرگز الٰہی یہ محبت کا چراغ
بے نشاں اب ہو گیا ہوں میں، وگرنہ پیش ازیں — تھا ترا نقشِ قدم ہی[1] میری تربت کا چراغ
داغ دے دل کو، لیے پھرتا ہوں سب کے سامنے — میں نے اب اس کو بنایا ہے زیارت کا چراغ
ہوتی ہے مشکوے شاہاں میں سخا سے روشنی — روسیاہ اُس گھر کا جس میں ہو نہ ہمت کا چراغ
دل ہے یا بیت الحزن ہے جس میں اے گل تجھ بغیر — شام سے لے صبح تک روشن ہے حسرت کا چراغ
دیدۂ گریاں نے روغن اشک کا ڈالا وہیں — داغ ہو کر جب جلایا دل نے الفت کا چراغ

احتیاجِ شمع کیا ہے مصحفی اپنے تئیں
ہے دلِ پر شور اپنا کنجِ خلوت کا چراغ

۱۹۱

کون کرے سیرِ باغ، کس کو ہے اتنا دماغ[2] — چاہیئے دل کو فراغ، تب ہو کہیں سیرِ باغ

---

۱ الف: تھا ترے نقش قدم سے   ۲ آصفیہ: فراغ

ہاتھ پہ[1] ساقی کے ہوں، کیوں نہ نظر دوختہ — دل کو مرے لے گئی گردشِ چشم ایاغ
داغ محبت جسے کہتے ہیں سب اہل درد — دھوئے سے جاتا ہے کب یہ بھلا دل کا داغ
دیکھ کے تیری کمر، کھوئے گئے ہیں زبس — منزل عنقا سے ہم کرتے ہیں اپنا سراغ
وقت خوش اُن کا جو لوگ، چھوڑ کے یہ خاک داں[2] — کنج لحد کے تئیں سمجھے ہیں کنج فراغ
حال یہ سرکاروں کا اب کے امیروں کی ہے — دیگچے بیکار ہیں، سرد پڑے ہیں اجاغ

سیر چمن سے مجھے کام ہے کیا مصحفی
ہے دل پُر داغ ہی حق میں مرے خانہ باغ

ف

۱۹۲

ابر کیوں کر ہو سکے اس چشم گریاں کا حریف — جس کا ہر اک قطرہ ہے آشوب طوفاں کا حریف
فصل گل آنے سے یہ کیسا ستم مجھ پر ہوا — ہاتھ مرا ہو گیا میرے گریباں کا حریف
کارخانے میں خدائی کے نہیں انساں کو دخل — مورچہ ہو جاوے ہے، دم میں سلیماں کا حریف
ہاتھ مرا ہی رہے تھا شانہ کش دن رات ہائے — شانہ تھا کس روز اس زلف پریشاں کا حریف
یہ ستم آنکھوں سے اپنی ہائے کیوں کر دیکھیے — غنچہ اس منھ پر ہو ان لب ہائے خنداں کا حریف
آشنائی کا کسی سے کیجیے کیا اعتبار — دم میں ہو جاتا ہے یاں انساں ہی انساں کا حریف
کیوں عبث کھیلا ہے اپنی جان پر تو اے تدرو — ہو نہیں سکنے کا اس سرو خراماں کا حریف
رخ سے تیرے حسن یوسف ہے مقام عجز میں — ذرہ کیوں کر ہو سکے خورشید تاباں کا حریف
زشتی کچھ اور ہے اور خوبروئی اور ہے — ہو سکا ماہ فلک کب ماہ کنعاں کا حریف
رات دن گردش میں ہے، پر ہو نہیں سکتا ہنوز — دَور دامانِ فلک اس دَور داماں کا حریف

مصحفی کچھ تشنۂ خوں اس کا پیکاں ہی نہیں
دل بھی ہے پہلو میں میرے اس کے پیکاں کا حریف

---

[1] نسخہ الف و ن ۱: ہاتھ سے   [2] آصفیہ: چھوڑ گئے خاکداں

۱۹۳

اس نے جس دن سے کیا آنکھ لڑانا موقوف — ہو گیا ہم سے بھی اس کوچے کا جانا موقوف
کششِ عشق نہ ہو کیوں کے زیادہ کہ کیا — اس نے جالی سے بھی دیدار دکھانا موقوف
پردۂ شرم و حیا جب کہ دیا ہم نے اُٹھا — آخر اس نے بھی کیا منہ کا چھپانا موقوف
دیکھ لے گا جو کوئی تم کو تو پھر مشکل ہے — کیجیے از پئے خدا بام پہ آنا موقوف
میری تربت کا نشاں جب سے ملا ظالم نے — خاک تودہ پہ کیا تیر لگانا موقوف
چال اٹھکیلی کی تم سے نہ گئی، کیا کہیے[۱] — نہ ہوا ہم سے[۲] غریبوں کا ستانا موقوف

مصحفی موسمِ گل دن ہیں جنوں کے ناداں
ان دنوں کیجیے گریباں سلانا موقوف

ق

۱۹۴

عشق کیا ہے، تباہیٔ عاشق — شرحِ اوقاتِ واہیٔ عاشق
کتنا تاثیر سے پڑا ہے دور — نالۂ صبح گاہیٔ عاشق
غازۂ روے خوبرویاں ہے — عشق، اے روسیاہیٔ عاشق
تیری آنکھیں ہوئی ہیں کیا ہی خجل — دیکھ کر کم نگاہیٔ عاشق
کوئی آیا نہ محکمے کے بیچ — ہائے بہر گواہیٔ عاشق

روزِ محشر پر اب رہی موقوف
مصحفی دادخواہیٔ عاشق

ک

۱۹۵

نادار ہو گئے ہیں ہم یہاں تک — مقدور نہیں ہمیں فغاں تک

۱ھ الف: کیجیے ۲ھ آصفیہ: تم سے

کوئی ضبط نفس کرے کہاں تک   آتش ہے جگر سے اک زباں تک
اے آہ سحر میں تجھ کو دیکھا   اک دن نہ گئی تو آسماں تک
اب ہم سے ضعیف و ناتواں کو   پہنچاوے ہے کون کارواں تک
اب[1] وہ جو گئے تو رہ گئے ہم   طاقت تھی بدن میں ہم رہاں تک
صیّاد تو چھوڑ تو چمن میں   جاویں گے نہ اُڑ کے آشیاں تک
بلبل کی دعا ہے یہ کہ یا رب   ق   مجھ کو نہ جلائیو، خزاں تک
کھانے کو مرے، فلک کے ہاتھوں   اک خون جگر ہے، سو کہاں تک
اس رُت میں جو چھوٹ کر نہ پہنچوں   جیتے جی اپنے آشیاں تک
پہنچائیو مشت پر کو میرے   اے باد صبا تو گلستاں تک
اے آتش عشق، شمع آسا   ق   حاضر ہوں میں تجھ سے جسم و جاں تک

پر کام نہ مصحفی کا پہنچے
اس بزم میں داغ امتحاں تک

۱۹۶

یہ زلف سیہ روکش زنجیر ہے اب تک   آنکھوں پہ مرے عالم تصویر ہے اب تک
یاں حسرت دل خوں میں ہوئی خاک بسر ہے   واں یار و مرے قتل کی تدبیر ہے اب تک
عالم میں نہیں ایک کہ سر جس کا رہا ہو   وہ ترک نگہ دست بہ شمشیر ہے اب تک
ہر چند کہ ملتا تو نہیں اُس سے میں برسوں   ق   پر دل میں مرے دوستیِ میرؔ ہے اب تک

کس واسطے اے مصحفی وہ خسرو معنی
باُلطفِ زباں بر سرِ تقریر ہے اب تک

گ

۱۹۷

چہرے پہ نازکی سے ہے جوش شکست رنگ   یہ تازہ گل ہے لالہ فروش شکست رنگ

[1] آصفیہ : بس وہ جو

کہتی ہے خلق رخ پہ ہے جوشِ شکستِ رنگ — حاشا کہ مجھ کو کچھ بھی ہو ہوشِ شکستِ رنگ
فندق اگر یہی ہے تو جاوے گا تا فلک — ہر برگِ گل سے آج خروشِ شکستِ رنگ
دیکھا ہے گرم کس نے جو رخسار پر ترے — جوشِ عرق کے ساتھ ہے جوشِ شکستِ رنگ
بے جنبشِ زباں ہی ترانے کو درد کے — پہچانتے ہیں نغمہ نیوشِ شکستِ رنگ
رکھتا ہے عضو عضو مرا دردِ یار سے — برگِ خزاں کی طرح خروشِ شکستِ رنگ
گل روپ اُن کا دیکھیو، چہرے جو آج ہیں — کاہش سے غم کی، جلوہ فروشِ شکستِ رنگ
گذرے گا بزمِ غیر میں جو تم پہ شب، سحر — آکر ہمیں کہے گا سروشِ شکستِ رنگ
ٹوٹا ہے دل کسی کا اس آہستگی کے ساتھ — پہنچی صدا نہ جس کی بہ گوشِ شکستِ رنگ

اتنا میں تنگِ ضعف ہوا ہوں کہ مصحفی
ہستی مری گراں ہے بدوشِ شکستِ رنگ

ل

۱۹۸

آئینہ ہوا اس رخِ زیبا کے مقابل — مہ ہو نہ سکے جس کے کفِ پا کے مقابل
ہر چند کہ نظروں سے تو غائب ہے ہمیشہ — نقشہ ہے مرے دیدۂ بینا کے مقابل
افسوس کہ یارو مجھے اس دل نے کیا ہے — اک ظالمِ خوں خوار کے لے جا کے مقابل
دل نام جو یک قطرۂ خوں بر ہیں ہے میرے — دن رات رہے ہے صفِ اعدا کے مقابل
آجائیے رونے پہ تو ہر ایک مژہ سے — دریا ہی رواں کیجیے دریا کے مقابل
دنیا طلب اس بات سے غافل ہیں صد افسوس — اور پرورشِ دین ہے دُنیا کے مقابل
ہر چند کہ دل غنچۂ تصویر ہے میرا — پر وسعتِ دل اپنی ہے صحرا کے مقابل
ہے عید کا دن، آج تو لگ جاؤ گلے سے — جاتے ہو کہاں جاں مری آ کے مقابل
ہر چند زلیخا کی وہ آنکھیں نہیں تو بھی — تصویر ہے یوسف کی زلیخا کے مقابل
ہوتے ہیں دل مردہ مرے شعر سے زندہ — یہ سحر ہے اعجازِ مسیحا کے مقابل

کیا تاب ہے جو سنبل گلزار ارم ہو
اے مصحفی اس زلف چلیپا کے مقابل

۱۹۹

ہے گرفتاریٔ دل باعث بیماریٔ دل
ہوں نہ بیمار میں، گر ہو نہ گرفتاریٔ دل

مثل زنجیر گرہ اس میں پڑی ہیں لاکھوں
بسکہ وہ زلف ہے زحمت کش بسیاریٔ دل

زخم دل رو بہ شفا ہے کہ ہوا ہے آ کر
زنگ پیکاں کا ترے مرہم زنگاریٔ دل

اس کے کوچے میں دل اپنے کو میں شب کھو آیا
کیا کہوں ہو نہ سکی مجھ سے خبرداریٔ دل

کیا بیاں اس کا کروں میں مجھے شرم آتی ہے
عشق میں تیرے ہوئی جاں جو کچھ خواریٔ دل

فائدہ کچھ نہیں بس دل میں سمجھ لے اپنے
پوچھ مت مجھ سے میاں موجب بیزاریٔ دل

میں تو جاتا ہوں چلا[1]، نالہ یہ کہہ کر کیجیو
تجھ سے اے آہ اگر ہووے ہواداریٔ دل

مصحفی اس کو میں سرگرم وفا پاتا ہوں
ان دنوں کچھ تو ہوا ہے اثر زاریٔ دل

۲۰۰

کیا شوق میں ہیں نعرہ زناں قمری و بلبل
اے کاش سنیں میری فغاں قمری و بلبل

بہتر ہے تمھارا بھی جو آنا ہو کہ شب یاں
ہے مجمع آتش نفساں قمری و بلبل

کیا کرتی ہو، آتا ہے وہ گل سیر چمن کو
ٹک بند کرو اپنی زباں قمری و بلبل

آنے سے خزاں کے نہ رہا باغ میں کوئی
کیدھر ہے گل و سرو کہاں قمری و بلبل

اے سرو رواں، غنچہ دہاں، یاد میں تیری
رہتی ہیں ہمیشہ نگراں قمری و بلبل

صیاد ذرا دیکھیو اس باغ میں ہر سو
کیا پھرتے ہیں پرواز کناں قمری و بلبل

جو کچھ کہ صنوبر نے کیا گل سے، وہ قصہ
کرتی ہیں بہت خوب بیاں قمری و بلبل

اے مصحفی لے جا کے مرے شعر تو پڑھیو
ہوں زمزمہ پرداز جہاں قمری و بلبل

---

[1] نسخہ الف و ن ۲ : جلا

۲۰۱

دن رات ہیں میرے دل کے دُنبال　　صدقے میں، ترے گھنے گھنے بال
پھر زلف کے پیچ میں پھنسا ہوں　　پھر عشق ہوا ہے جی کا جنجال
کرتے ہی نہیں وفا جو خوباں　　شہران کے ہیں کیا وفا کا ہے کال
صدقے ہیں ترے، نہ مہ نے پایا　　یہ حسن یہ چہرہ یہ خط و خال
جی جاؤں ہیں اے مسیح دلہا　ق　گر رحم ہو تجھ میں نیم مثقال

اے مصحفی ہے زمیں یہ آساں
تو ایک غزل اور بھی تو لکھ ڈال

۲۰۲

عالم کو کیا ہے تو نے پامال　　عالم سے جدی ہے کچھ تری چال[۱]
آزاد کیا قفس سے مجھ کو　ق　صیاد نے کرکے بے پر و بال
انصاف کرو، کوئی تو یارو[۲]　　کس طرح اڑوں ہیں خستہ احوال
تعویذ بنا رکھوں میں لے کر　　ہاتھ آوے گر اس کی زلف کا بال
سب یار چلے گئے، ہیں تنہا　　سرمارو ہوں کارواں کے دنبال
کب لب سے ترے ملے مرے لب　ق　مجھ کو تو یہ آرزو ہے اشکال
یہ بس ہے کہ منھ سے منھ ملادے　　حقّے کی ترے صنم یہ مہنال
ہے ایک تو قہر چنپئی رنگ　　تس پر یہ غضب ہے کیسری شال
پوچھا ہے جو میں نے اشک خوں کو　　ہوگئی ہیں مری ہتھیلیاں لال
فرقت میں تری گذرتی ہے یاں　　ایک ایک ساعت برابر سال
بالوں نے تیرے سر پہ میرے　ق　مارا ہے عجب طرح کا اک جال
جس سے نہ تجھے ہی ہے رہائی　　نے میرے ہی جی کا جائے جنجال
کیوں کر نہ میں ماہ نو کو دیکھوں　　دیتا ہے کسی کے یاد خلخال

۱؎ آصفیہ: دونوں مصرع بتقدیم و تاخیر　　۲؎ الف: تو کوئی

خوں اس کا ہدر کیا میں تجھ کو ق یہ بات نہیں ہے اتنی اشکال
گر قتل ہے مصحفی کا منظور
کیا دیر ہے اس میں اٹھیے فی الحال

۲۰۳

دل میں جب عشق کی اٹھی ہے سول[1] ق شعر کہنا بھی میں گیا ہوں بھول
منھ سے نکلے ہے گر کوئی مصرع شعر بھی کیا ہوئے ہے اول جلول
بے حواسی میں[2] سب فرامش ہیں یاد تھے جتنے شاعری کے اصول
مجھ کو شاعر نہ اب کہو مجھ میں عشق کے دیو نے کیا ہے حلول
تب تو دیوانہ وار تکتا ہوں تب تو کہتے ہیں لوگ مجھ کو فضول
گرچہ میں جانتا ہوں یہ کہ نہیں رشک و حسرت سوا کچھ اس میں حصول
لیک میں کیا کروں جو خسروِ عشق خود کرے آ کے مُلکِ دل میں نزول
دیکھ کر وصل و ہجر کا عالم کبھی خوش ہوں تو پھر کبھی ہوں ملول
آہ کے بال و پر جلیں ہیں وہاں دل کی خواہش ہے درمیاں میں رسول
یوں تو ہیں گلستانِ گیتی میں ق اور بھی رنگ رنگ کے گل پھول
پر میں کیا جانوں کیا ادا ہے کہ وہ مجھ سے کرتی ہے اشک خوں کو وصول
مصحفی دیکھوں ہو وے کیا انجام
اب تو ذلت کو میں کیا ہی قبول

۲۰۴

تھا آپ ہی دیوان مرا نامۂ اعمال کاہے کو فرشتوں نے لکھا نامۂ اعمال
اے آہ اثر دیکھ لیا بس میں ترا بھی یک روز نہ آتش میں جلا نامۂ اعمال
نامے کو ہوا سے کے مرے، یوں وہ کہے ہے جاتا ہے کسی کا یہ اڑا نامۂ اعمال
آنکھوں سے مری شب جو گرے اشک ندامت پانی میں طرح کف کی بہا نامۂ اعمال

۱؎ آصفیہ : دل میں یہ عشق کی اٹھے الخ ۲؎ الف : سے

کیا دے ہے فرشتوں کے تئیں خفیہ نویسی — جو خفیہ وہ لکھتے ہیں مرا نامۂ اعمال
ہے شور جنوں موجب آمرزش مجنوں — یاں ساتھ گریباں کے پھنسا نامۂ اعمال
کیا روزِ قیامت ہے جو کوچے میں بُتاں کے — اُڑتا ہوا پھرتا ہے مرا نامۂ اعمال
پڑھتا نہیں یوں خط کو مرے وہ بُتِ کافر — جوں عاصی سے جاوے نہ پڑھا نامۂ اعمال
جب روز قیامت مجھے اس رُخ نے دکھایا — لا ہاتھ میں زلفوں نے دیا نامۂ اعمال
کیا فائدہ رکھتا ہے گنہ گار کا جینا — جوں جوں کہ بڑھی عمر، بڑھا نامۂ اعمال

اے مصحفی اس اشکِ پشیمانی سے اپنے
افسوس کہ دھویا نہ گیا نامۂ اعمال

۲۰۵

چمن دہر میں غم ناک ہیں ہم اور بلبل — مثل گل با دلِ صد چاک ہیں ہم اور بلبل
آتش گل کا بھڑکنا جو یہی ہے تو نسیم — ایک دن دیکھیو تو خاک ہیں ہم اور بلبل
بوسۂ عارض گل کیوں کہ دلیرانہ نہ لیں — شیوۂ عشق میں چالاک ہیں ہم اور بلبل
نسبت عشق ہے آپس میں ہماری بھی درست — آشنائے نظر پاک ہیں ہم اور بلبل

اپنے معشوقوں کے دامن سے لپٹ جاتے ہیں
مصحفی عاشق بے باک ہیں ہم اور بلبل

۲۰۶

مزا ہے ہووے گر چپکے ہی چپکے مدعا حاصل — کسی نے کر لیا معلوم رازِ دل تو کیا حاصل
مری نظارہ گہ میں آکے گر دشمن مرا بیٹھا — کیا نظارہ میرا اس میں اس کو کیا ہوا حاصل
رکھا سر کاٹ کر قاتل نے میرا نوک نیزہ پر — ہوا بعد از شہادت کے مجھے یہ مرتبہ حاصل
اجل بھی سامنے آتے ہوئے اس کے تو ڈرتی ہے — کرے کیوں کر کوئی قاتل سے اپنے خوں بہا حاصل
یہی ہوتی ہے شاید راہ و رسمِ دوستی ہے ہے — ستانے سے ہمارے تو ہی کہہ کیا بے وفا حاصل
ہمیں دنیا میں جیتے جی تو کچھ حاصل نہیں ہوتا — مگر ہووے ہمارا مدعا بعد از فنا حاصل
عبث میاں مصحفی ہر لحظہ تم اس کو میں جاتے ہو[1] — اُسے پروا تمھاری کب ہے، یہ باتیں ہیں لاحاصل

---
[1] نسخہ الف: ہم اس کو میں جاتے ہیں۔

م

۲۰۷

دیکھ آئینے میں زلف کو جھپکا[1] نہ کرو تم   لڑکے ہو مگر آپ کو رُسوا نہ کرو تم
ایسا ہی اگر زلف سے ڈر لگتا ہے تم کو   تو جان مری آئینہ دیکھا نہ کرو تم
بات اُس کی میں بولوں ہوں، تو جھنجھلا کے وہ کافر   کہتا ہے: "مری بات میں بولا نہ کرو تم!"
پچھتاؤ گے، آواز تو پہچانو کسی کی   دروازہ رخ غیر پہ کھولا نہ کرو تم
کیوں دیتے ہو ایذا مجھے، کیا خو ہے تمھاری   پہلو میں مرے آن کے بیٹھا نہ کرو تم
کیا جانیے آجاتے وہ ہیں کیا مرے جی میں   بن ٹھن کے مرے سامنے آیا نہ کرو تم
یارو جو میں دل اپنا گنوایا تو تمھیں کیا؟   جانے بھی دو، اس بات کا چرچا نہ کرو تم
آنکھوں کا خمار اور بھی ہوتا ہے زیادہ   مے پی کے میاں اتنا بھی سویا نہ کرو تم

سنتے ہو میاں مصحفیؔ اس رونے سے حاصل
رو رو کے عبث آنکھوں کا دریا نہ کرو تم

۲۰۸

صرف مشتاق ہیں اک تیری ملاقات کے ہم   آرزومند نہیں اور کسی بات کے ہم
موردِ شانِ تغافل جو ہوئے خوباں کے   کیا سزاوار نہ تھے لطف و عنایات کے ہم
آفتیں اور زمانے میں مگر تھوڑی تھیں   متحمل جو ہوئے عشق کی آفات کے ہم
کوند بجلی کی کلیجے سے نکل جاتی ہے   تجھ بن ان صدموں سے دن کاٹیں ہیں برسات کے ہم
کون سی چھیڑ کہ ہم ساتھ نہیں ہوتی ہائے   بزم خوباں میں نشانے ہیں اشارات کے ہم
دم شمشیر پہ کٹتی ہے ہماری شب و روز   بندے ہیں اپنی بھی باریکیٔ اوقات کے ہم

مصحفیؔ جاتے ہیں اب گھر کو ذرا سوویں گے
ہے خمار آنکھوں میں، جاگے ہوئے ہیں رات کے ہم

۱؎ نسخہ الف: جھکا

۲۰۹

کیوں تیوری چڑھی رہتی ہے اب، کچھ نہیں معلوم — اس رنجش بے جا کا سبب کچھ نہیں معلوم
اک سرخی سی چہرے پہ ہے اس شوخ کے لیکن — اب تک تو ہمیں وجہ غضب کچھ نہیں معلوم
دروازے شب وصل یہ میں بند کیے تھے[1] — کیوں کر کیے، کیا جانے، یہ سب کچھ نہیں معلوم
بجلی سی گئی کوند جو شب بزم بتاں میں — کیدھر سے ہوئی جنبشِ لب کچھ نہیں معلوم
باریک خیالاں، ترے اوصاف کمر میں — حیران تجھی تو ہیں کہ جب کچھ نہیں معلوم
اس مرتبہ بگڑا تو نہ تھا ذائقہ میرا — کیوں تلخ لگے اب کی عنب، کچھ نہیں معلوم
حیراں ہوں میں، کس بات سے[2] ہو جاتی ہے یارب — بن بن کے مری بات کڈھب کچھ نہیں معلوم
ہم روز ازل سے ہیں بنے عشق کے پتلے — دنیا کا ہمیں تاب و تعب کچھ نہیں معلوم
تقطیع نے[3] سینے کی، گریباں تو اڑائے — اب لادے ستم کیا تری چھب کچھ نہیں معلوم
الماس کے آویزے ہیں جن کے انھیں ہے ہے — درد دل الماس طلب کچھ نہیں معلوم
با نام و نشاں تھے وے یہ ہیں جن کی مزاریں — ہر چند کہ اب ان کا نسب کچھ نہیں معلوم

دیوانہ سا جاتا ہے چلا مصحفی اس پاس
ناداں کو رہ و رسم ادب کچھ نہیں معلوم

۲۱۰

خط پہ ہے سبزہ زار کا عالم — رخ پہ ہے نو بہار کا عالم
کس کی نرگس ہے آنکھ جو اس میں — نکلے ہے انتظار کا عالم
برق و سیماب نے کہاں پایا — اس دل بے قرار کا عالم
جل گئی شمع دیکھ عاشق کے — دیدۂ اشک بار کا عالم
خاکساران دہر سے ہے جدا — اس ترے خاکسار کا عالم
نکلے ہے اس کی زلف پرخم سے — سنبل تاب دار کا عالم
گرچہ ہیں قہر سادی آنکھیں بھی — پر جدا ہے[4] خمار کا عالم

---

[1] نسخۂ الف و ن ا: کیے ہیں [2] نسخۂ الف: اس تختی نے و ن ا: تختی نے [3] آصفیہ: پر غضب ہے

آ گئے آنکھوں کے میری پھرتا ہے   وہی رفتارِ یار کا عالم
مصحفیؔ روزگار کیا کیجیے
کہ نہیں روزگار کا عالم

٢١١

شمع رو، ایسے کے پروانے ہیں ہم   اس فراست کے بھی دیوانے ہیں ہم
الغرض جو کچھ ہیں تیرے ہیں میاں   آشنا ہیں یا کہ بیگانے ہیں ہم
کیا کریں اتنی سی ہستی کا گھمنڈ   اس چمن میں اوس کے دانے ہیں ہم
عاشقی کا نشہ ہے ہم میں[1] بھرا   بادۂ الفت کے پیمانے ہیں ہم
اس عمارت پر نہ کر منعم غرور   ہم سے عبرت لے کہ ویرانے ہیں ہم
ان پری رُویوں سے ہوویں گے خفا
مصحفیؔ کیا ایسے دیوانے ہیں ہم

٢١٢

نظروں میں تیری پیارے گو بے وقار تھے ہم   اس پر بھی جان و دل سے خدمت گذار تھے ہم
سودا کیا نہ تونے ہم ساتھ دوستی کا   واللہ تو ہی چوکا حد مایہ دار تھے ہم
دامان و جیب اپنا، گریہ سے جب[2] چمن تھا   تو سیر کو نہ آیا ابرِ بہار تھے ہم
آتے تھے پاس تیرے جو دوڑ دوڑ ہر دم   کم بخت دل کے ہاتھوں بے اختیار تھے ہم
گالی بھی ان لبوں کی قسمت ہے اور کی ہائے   بوسے کے جن لبوں سے امیدوار تھے ہم
تھا اعتبار اپنا تیری ہی ہم دمی سے   بس تونے منہ جو موڑا بے اعتبار تھے ہم
قدر اس کی تونے ناداں افسوس کچھ نہ جانی   ہر چند جان و دل سے تجھ پر نثار تھے ہم
تو ملنے سے ہمارے[3] ناگہ جو رُک گیا یوں   خاطر پہ تیری شاید ان روزوں بار تھے ہم
پیکانِ غمزہ تیرا دل میں لیے پھریں تھے   جاتے تھے جس طرف کو تیرے شکار تھے ہم
صید زبوں سے اپنے کیوں تونے منہ کو موڑا   اس پر بھی کام کے تھے، لاغر ہزار تھے ہم

---

١ آصفیہ: ہم میں ہے   ٢ آصفیہ: سب   ٣ آصفیہ: ملنے سے تو ہمارے

اے مصحفی تصور اُس کا جو بندھ گیا تھا
با صد ہزار حسرت شب ہم کنار تھے ہم

۲۱۳

کب لگ سکے جفا کو اس کی وفاے عالم — ہے جس کا ہر کرشمہ صبر آزماے عالم
محتاج پھر جہاں میں کوئی نظر نہ آتا — کرتا خدا جو مجھ کو حاجت رواے عالم
ہم کو تو کچھ نہ سوجھا، آوے وہی[1] دکھا دے — ق دیکھا ہو گر کسی نے کچھ یاں وراے عالم
عالم اگر ہے حادث تو مجھ کو تو بتا دے — کیوں اب تلک ہے وہ ہی نشو و نماے عالم
کوئی کچھ ہی سمجھے اس کو پر اپنی آنکھ میں تو — ساتھ اس حدوث کے ہے ثابت بقاے عالم
وہ بھی نظر میں اپنی اس وقت جلوہ گر ہے — عالم جو کچھ کہ ہوگا بعد از فناے عالم
آنکھیں تو تجھ کو دی ہیں، ٹک دیکھ تو سہی تو — ہے راست کس کے قد پر چسپاں قباے عالم
عالم میں اور ہم میں، اک طرفہ رفتگی ہے — عالم فدا ہے ہم پر، ہم ہیں فداے عالم
ہم ابتدا کی پوچھیں، پر بیٹھ کر حقیقت — ہم کو کوئی بتا دے، گر انتہاے عالم
کیا لطف عاشقی کا اب رہ گیا ہماری — یاں آخرِ جوانی واں ابتداے عالم
کس غنچہ لب کی تجھ کو یاد آگئی ہے اس دم — جو تنگ ہو گیا ہے مجھ پر فضاے عالم
ایسے سے دادخواہی، محشر میں پھر ستم ہے — ہر ایک غمزہ جس کا ہو خوں بہاے عالم
کب داد کو کسی کی پہنچا وہ روے دلکش — ہم نے تو اُس کو پایا حسرت فزاے عالم
جب عالم حیا سے بیگانہ وہ نگہ تھی[2] — مانے تھے تب ہی اس کو ہم آشناے عالم

ہیں مصحفی ہم اب تو مانند حادثے کے
دیکھیں ٹلے ہے کس دن سر سے بلاے عالم

۲۱۴

صرف گریہ کا ہوا ہے اثر نالہ تمام — ہے جگہ اشک کی اب چشم میں تب خالہ تمام
گھل گئے گرتے ہی ہم چشم فلک سے اس طرح — بات کہتے ہی میں ہو جائے ہے جوں ژالہ تمام

---

[1] آصفیہ: ہمیں — [2] نسخۂ آصفیہ سے اضافہ

گل کو تشبیہ ہے کیا لختِ جگر سے میرے
چشم بد دُور یہ آتش کے ہیں پرکالہ تمام

تیری مہندی کے شہیدوں کا جہاں مدفن ہے
جس طرف دیکھیے پھولے ہیں گل لالہ تمام

جب سے لگوائی ہے تو نے یہ تمامی کی سنجاف
دُور دامن ہے ترا شعلۂ جوّالہ تمام

شوق رکھتا ہے یہ کس مہ کی ہم آغوشی کا
شکل آغوش فلک پر ہے جواب ہالہ تمام

مصحفی جب سے مرا شہرہ گیا مشرق کو
میرے اشعار کا مشتاق ہے بنگالہ تمام

۲۱۵

کس راہ گیا لیلیٰ کا محمل نہیں معلوم
ہے بادیہ ریگ اور ہمیں منزل نہیں معلوم

میں حشر کے دن دعوئ خوں کس سے کروں گا
وہ کشتہ ہوں جس کشتہ کا قاتل نہیں معلوم

نکلیں ہیں مرے دل کے تڑپنے میں ادائیں
ہے کس کی نگاہوں کا یہ بسمل نہیں معلوم

تھا روئے دل خستہ تو شب میری طرف کو
کب ہو گیا مژگاں[1] کے مقابل نہیں معلوم

وہ بحر ہے دریائے سرشک اپنا کہ جس کا
پہنا ہی نظر آوے ہے ساحل نہیں معلوم

مرجاؤں کہ جیتا رہوں میں ہجر میں تیرے
کس چیز کا خواہاں ہے مرا دل[2] نہیں معلوم

آنکھوں سے گذارا ہے جو یوں لختِ جگر کا
آتے ہیں چلے کس کے یہ گھائل نہیں معلوم

کیا جانیے کیا اس میں تری آنکھوں نے دیکھا
کیوں ہو گئیں آئینے کی مائل نہیں معلوم

اے مصحفی افسوس کہ اس ہستی پہ ہم کو
تحصیل وفاداری کا حاصل نہیں معلوم

۲۱۶

کب خوں میں بھرا دامن قاتل نہیں معلوم
کس وقت یہ دل ہو گیا بسمل نہیں معلوم

اس قافلے میں جاتے ہیں محمل تو ہزاروں
پر جس میں کہ لیلیٰ ہے وہ محمل نہیں معلوم

درپیش ہے جوں اشک سفر ہم کو تری کا
دن رات چلے جاتے ہیں، منزل نہیں معلوم

حیران ہیں ہم اس کے معمّائے دہن میں
کیوں کر کھلے یہ عقدۂ مشکل نہیں معلوم

---

[1] ن ۲: مژگاں سے [2] الف: ترا دل

اے مصحفی جل بھن کے ہوا خاک میں سارا
دکھلاوے گی اب کیا تپش دل نہیں معلوم

۲۱۷

کیا دل میں ترے کس گل کی خوبی نے اثر شبنم	جو تو رہنے لگی شام و سحر باچشم تر شبنم
لڑی موتی کی یُوں اُس کان میں ہے ساتھ نیلم کے	رہے سوسن کی پتّی[1] پر کبھی جوں جھول کر شبنم
کیا ہے کون سے گل نے تجھے کم بخت رنجیدہ	پڑی روتی ہے کیوں آٹھ آٹھ آنسو خاک پر شبنم
وداع گل کا عالم ہم نے کل گلشن میں دیکھا تھا	کھڑی روتی تھی[2] منھ پھیرے اِدھر بلبل اُدھر شبنم
غنیمت جان لے یہ صحبت شب، صبح کے ہوتے	نہ پاوے گی تو ہرگز اپنی ہستی کا اثر شبنم
سنا اس نے جو درد آلود نالہ مرغ خوش خواں کا	ہوا سارا چمن سیراب، روئی اس قدر شبنم

نہیں اے مصحفی وہ آب و رنگ اس سال گلشن میں
خزاں آئی گئے پودے، کہاں گل اور کدھر شبنم

۲۱۸

سیراب آب جو سے قدح اور قدح سے ہم	سرخوش گلوں کی بُو سے قدح اور قدح سے ہم
مکھڑے پہ ہے گلال جو اس مست ناز کے	رنگیں ہے عکس رُو سے قدح اور قدح سے ہم
پیر مغاں کرم ہے جو سیراب ہو سکے	تیرے نم وضو سے قدح اور قدح سے ہم
بزم شراب رقص کی مجلس سے کم نہیں	ناچے ہے پُر لہو[3] سے قدح اور قدح سے ہم
حلقے نہیں یہ زلف میں ساقی کی بلکہ ہے	وابستہ مو بمو سے قدح اور قدح سے ہم
حرمت لکھی شراب کی یاں تک کہ کھنچ رہا	زاہد کی گفتگو سے قدح اور قدح سے ہم
شیشہ جو پھوٹ جائے تو پھوٹے وے نہ ہو	یارب جدا سبو سے قدح اور قدح سے ہم
وہ تفرقہ پڑا کہ بہت دور رہ گیا	دست پیالہ جُو سے قدح اور قدح سے ہم

اے مصحفی ہمیں تو گوارا نہیں یہ نیش
نوش اُس کے لب سے چُوسے قدح اور قدح سے ہم

---

[1] آصفیہ: رہے سوسن کے پتے میں [2] آصفیہ: روتی تھیں [3] سب نسخوں میں: پر لو

۲۱۹

میری آنکھوں میں تو ہو رشکِ گلِ خنداں تم | خوبرو چشمِ خلائق میں نہیں چنداں تم
مارے خجلت کے چھپائے گہرِ انجم کو | شب کو دکھلاؤ اگر اپنے دُرِ دنداں تم
سیکڑوں کھینچتے ہو رنگِ حنا کی تحریر | طرزِ خوبی میں ہو استادِ حنا بنداں تم

حق میاں مصحفی جیتا رکھے تم کو تا دیر
کیوں کہ ہو روشنیٔ بزمِ خردمنداں تم

۲۲۰

ہر دم کو سمجھتے ہیں دمِ بازپسیں ہم | غافل تو ہوا ہم سے ذرا بھی، تو نہیں ہم
گر شوخیٔ رفتارِ بتاں یہ ہے تو ہرگز | آرام سے سوویں گے نہیں زیرِ زمیں ہم
پہلا سا مزا اب نہ رہا عشقِ کہن میں | پھر دل کو نئے سر سے لگاویں گے کہیں ہم
مر جاویں گے تو ہم سے کہیں منہ نہ چھپانا | جیتے ہیں تجھے دیکھ کے اے زُہرہ جبیں ہم
ان روزوں تو پاتے ہیں دماغ عرش پر اپنا | ملتے ہی ترے بھول گئے اپنے تئیں ہم
مانندِ صبا پھرتے ہیں نت کوچہ بکوچہ | رکھتے ہی نہیں خانہ کہ ہوں خانہ نشیں ہم
زلفیں تری کہتی ہیں کہ ہم دل کو اُڑا لائیں | آنکھیں تری کہتی ہیں کریں غارت دیں ہم
کاجل کا بل اُس چشم کے گوشے میں کھپے ہے | کیا خوب زمانے سے ہوئے گوشہ گزیں ہم

میاں مصحفی گر گوشۂ تحقیق سے دیکھیں
ہیں ہر طرف اس آئینہ خانہ میں ہمیں ہم

ن

۲۲۱

وابستۂ بہارِ طرب غم بہت ہے یاں | ہنسنے کو گُل، تو رونے کو شبنم بہت ہے یاں
چھیڑا ہے کس بہانے سے رات اُس کی زلف کو | ہے راست اس جگہ پہ میاں، خم بہت ہے یاں

جوں خط سیاہ پوش ہوں کیوں کے نہ عاشقاں   جانے کا تیرے حسن کے ماتم بہت ہے یاں
ہے مجھ کو کج کلاہوں سے ربط حباب و موج   صحبت رہے گر ان سے کوئی دم بہت ہے یاں
کوے بُتاں کی پوچھے کوئی مصحفی سے راہ
کس واسطے کہ سب سے وہ محرم بہت ہے یاں

۲۲۲

دنیا ہے جاے رنج و محن، غم بہت ہے یاں   مرتا نہیں ہے ایک پہ ماتم بہت ہے یاں[۱]
نازک نہال جتنے ہیں دلی کے، قہر ہیں   یعنی قدم قدم پہ خم و چم بہت ہے یاں
اے دل تمام عمر تو یاں کون خوش رہا   گذرے خوشی کے ساتھ جو یک دم بہت ہے یاں
زلفوں کے پیچ سے ہے نکلنا ہی اب بھلا   یعنی کہ حال اپنا تو درہم بہت ہے یاں
آتی ہے مجھ کو خاک سے مُردوں کی[۲] یہ صدا
آ مصحفی، کہ اور بھی[۳] عالم بہت ہے یاں

۲۲۳

مرتے ہیں ہم تو جان ترے اشتیاق میں   رکھیو خبر گذر ہی نہ جاویں فراق میں
راتوں کو آنکھ اٹھا کے ذرا دیکھ تو سہی   کیا شکلیں جلوہ گر ہیں فلک کے رواق میں
اتنا نہ دشمنی پہ کمر باندھ آ سمجھ   اس طرح جانیں جاتی یہاں ہیں نفاق میں
حلقے میں کان کے نہیں جا پائی اب تلک   لٹکا رکھا ہے اس نے گہر کو بلاق میں
قاصد نے خط دیا جو مرا اس کو مصحفی
پڑھ کر، لفافہ پھینک دیا اس نے طاق میں

۲۲۴

جی چاہتا ہے وعدۂ دیدار ہو کہیں   گو اس میں ہیں کہیں ہوں، وہ دلدار ہو کہیں
گرما زدہ ہم آتے ہیں صحراے عشق سے   ٹک بیٹھیے جو سایۂ دیوار ہو کہیں

---

۱ نسخہ الف: مرتا نہیں جو ایک پہ ماتم الخ (نیز رامپور ن ۱)   ۲ آصفیہ: خاک کے مُردوں سے الخ
۳ نسخہ الف: اے مصحفی، کہ آدمی الخ

اب تو یہی دعا ہے مری، دام عشق میں[1]
میری طرح سے تو بھی گرفتار ہو کہیں

رکھا ہے پھر زمیں پہ قدم تو نے ان دنوں
ڈرتا ہوں میں کہ فتنہ نہ بیدار ہو کہیں

آیا ہے پشت بام پہ پھر ماہ چار دہ
غرفے سے ٹک تو تو بھی نمودار ہو کہیں

جی چاہتا ہے اپنا بھی ٹک دیکھیے اگر
آب روان و سبزہ و گلزار ہو کہیں

دل ہے مری بغل میں وہ جنس، آہ مصحفی
جس جنس کا نہ کوئی خریدار ہو کہیں

۲۲۵

دروازہ نہ تھا اس کا تو جائے سگِ درباں
عاشق کے لیے ہے یہ بلائے سگ و درباں

از بس ہیں انھیں دی ہے اذیت مرے حق میں
مرجائے کہیں ہے یہ دعائے سگ و درباں

کوچے میں ترے کی ہے بسر عمر جو ہم نے
اک عمر اٹھائی ہے جفائے سگ و درباں

پھر آؤں ہوں کوچے کی طرف اس کے میں جاکر
راتوں کو جو آتی ہے صدائے سگ و درباں

اے شوخ وفاداریٔ عاشق پہ نظر کر
کچھ اتنی نہیں ہے یہ وفائے سگ و درباں

اس کوچے میں کیا بات کہ پر مارے فرشتہ
رہ جائے بندھی واں تو ہوائے سگ و درباں

موجد نہیں میں مصحفی اس طرفہ[2] زمیں کا
ہے حکمِ قتیلاؔ سے بنائے سگ و درباں

۲۲۶

نے زخم خوں چکاں ہوں نہ حلق بریدہ ہوں
عاشق ہوں میں کسی کا اور آفت رسیدہ ہوں

ہستی سے اپنی مجھ کو نہیں مطلق آگہی
عمرِ گذشتہ یا کہ غزالِ رمیدہ ہوں

نکلے ہے میری وضع سے اک شورش جنوں
دریا نہیں میں سیل گریباں دریدہ ہوں

مرغانِ باغ میں مرے نالے کا شور ہے
ہر چند میں ابھی نفسِ ناکشیدہ ہوں

پہنچے سزا کو اپنی جو منھ پر مرے چڑھے
میں دستِ روزگار میں تیغِ کشیدہ ہوں

جاتا ہے جلد قافلۂ عمر کس قدر
مہلت نہیں ہے اتنی کہ ٹک آرمیدہ ہوں

---

[1] الف: اپنی یہی دعا ہے مرے الخ   [2] رامپور ن ۲: تازہ

کون اُٹھ گیا ہے پاس سے میرے جو مصحفیؔ
روتا ہوں زار زار پڑا، آب دیدہ ہوں

۲۲۷

دکھلاؤں اگر اس بُتِ خود کام کی آنکھیں
کھل جائیں ابھی غنچۂ بادام کی آنکھیں

یہ بادیہ وہ ہے کہ جہاں صید کی خاطر
نت دیدۂ حیراں ہی رہیں دام کی آنکھیں

مقصود ہے آنکھوں سے ترا دیکھنا پیارے
جب تو ہی نہ ہو پاس تو کس کام کی آنکھیں

کیا دور ہے اس شوخ سے، آتے ہی چمن میں
مل ڈالے جو تلووں تلے بادام کی آنکھیں

دیکھا نہیں دو دن سے جمال اس کا میں شاید
آئی ہیں کہیں اس بُتِ خود کام کی آنکھیں

ٹک تو بھی تو روزن سے ذرا جھانک کہ کیوں کر
نکلیں ہیں ترے عاشقِ بدنام کی آنکھیں

سرخی تری آنکھوں کی کہاں پاویں وہ ساقی
گو لعل و کمیت سی ہوں اصنام کی آنکھیں

اے مصحفیؔ نظارے سے اُس رنگ کفک کے
ڈوبی ہیں لہو میں کسی ناکام[1] کی آنکھیں

۲۲۸

اے شبِ ہجر کہیں تیری سحر ہے کہ نہیں
نالۂ نیم شبی تجھ میں اثر ہے کہ نہیں

جان پر اپنی میں کھیلا ہوں جدائی میں تری
بے خبر تجھ کو بھی کچھ اس کی خبر ہے کہ نہیں

ایک مدت ہوئی ہم وصفِ کمر کرتے ہیں
پر یہ معلوم نہیں اس کے کمر ہے کہ نہیں

رکھ نہ سوزن کو، ذرا دیکھ تو لے اے جراح
قابلِ بخیہ مرا زخمِ جگر ہے کہ نہیں

کیا خوش آئی ہے دلا منزلِ ہستی تجھ کو
سچ بتا، یاں سے ترا عزمِ سفر ہے کہ نہیں

تو جو بے پردہ ہو، منھ غیر کو دکھلاتا ہے
پاس میرا بھی کچھ اے رشکِ قمر ہے کہ نہیں

دیکھ تو اے بُتِ بے مہر تری فرقت میں
ہر بُنِ موے مرا، دیدۂ تر ہے کہ نہیں

اس کے در پر ہی جو رہتا ہوں میں دن رات پڑا
مجھ سے جھنجھلا کے کہے ہے: ترے گھر ہے کہ نہیں

مصحفیؔ اُس کی گلی میں جو تو جاتا ہے سدا
اپنی بدنامی کا کچھ تجھ کو بھی ڈر ہے کہ نہیں

۱؎ رامپور ن ۱ و ۲، نیز نسخۂ الف: اسی ناکام

۲۲۹

لیتا ہوں میں جب اس کی بلائیں وہ نازنین ‏ ‏ جھنجھلا کے یوں کہے ہے، "کہ چل دور ہو کہیں"
صورت کو تیری دیکھ کے اے قبلۂ چمن ‏ ‏ ہر شاخِ گُل نے جھک کے کیا سجدہ بر زمیں
بجلی سی کوندتی ہے پڑی، سیر دیکھیو ‏ ‏ یہ خرمنِ فلک میں مری آہ آتشیں
پیدا ہوئے ہیں مادرِ گیتی سے توأمان ‏ ‏ تیرا جمال، اور مری آہ آتشیں
اس کو بھی اب خیال ترا کم رہا ہے جان ‏ ‏ جانے دے مصحفی کی جو خواہش تجھے نہیں

۲۳۰

تمھاری اور مری کج ادائیاں ہی رہیں ‏ ‏ رہے جو پاس تو باہم لڑائیاں ہی رہیں
زبسکہ کرتے رہے بے کسوں پہ تم بیداد ‏ ‏ سدا گلی میں تمھاری دوہائیاں ہی رہیں
ہوئی نہ ساز مری اس کی صحبت اک شب ہائے[1] ‏ ‏ اِدھر سے عجز اُدھر سے رکھائیاں ہی رہیں
دریغ، یار سے بچھڑے تو ایسے ہم بچھڑے ‏ ‏ کہ تا بہ روزِ قیامت جدائیاں ہی رہیں
اب اُس کے ملنے کا کیا لطف مصحفی باہم ‏ ‏ نہ وہ سلوک نہ وہ آشنائیاں ہی رہیں

۲۳۱

اِدھر سے جھانکتے ہیں گہ[2] اُدھر سے دیکھ لیتے ہیں ‏ ‏ غرض ہم اُس کی صورت سَو ہُنر سے دیکھ لیتے ہیں
کیا ہے بخت نے جس دن سے ہم کو اُس کا ہم سایہ ‏ ‏ ہم اُس رشکِ پری کو اپنے گھر سے دیکھ لیتے ہیں
جو ہو جاتے ہیں دیوانے ترے، اتنے نقابوں پر ‏ ‏ خدا جانے کہ وہ تجھ کو کدھر سے دیکھ لیتے ہیں
ہمیں گریہ سے وہ فرصت کہاں جو خال و خط دیکھیں ‏ ‏ مگر نقشہ ترا اس چشمِ تر سے دیکھ لیتے ہیں
ہمارے دیکھنے سے کیوں خفا ہوتا ہے اے ظالم ‏ ‏ ترا لیتے ہیں کیا، ٹک اک نظر سے دیکھ لیتے ہیں
ہمیں اُس کوہیں لہنے کا نہیں کچھ اور تو حاصل ‏ ‏ پر اتنا ہے کہ گاہے چاکِ در سے دیکھ لیتے ہیں

---

[1] الف: صحبتِ یک شب ‏ ‏ [2] الف: گاہ

لگیں ہیں دیکھنے جب مصحفی ہم اس کے کوچے میں
ٹک اک پھر کر بھی رُسوائی کے ڈر سے دیکھ لیتے ہیں

۲۳۲

یا تو آوے وہ رشکِ ماہ کہیں — یا ہو اس شب کا روسیاہ کہیں
اب ملاقات کی وہ شکل نہیں — دیکھ لیتے ہیں گاہ گاہ کہیں
ہیں جو مردود سارے عالم کے — کچھ تو ہم سے ہوا گناہ کہیں
خانۂ آسماں جو ہے پُر دود — کی نہ ہووے کسی نے آہ کہیں
مہِ نو سر جھکائے جاتا ہے — آج دیکھا وہ کج کلاہ کہیں
مرغِ دل کاش سرد ہو جاوے — کھا کے اِک ناوکِ نگاہ کہیں
مصحفی چاہے ہے تو اس کو بہت
لاوے آفت نہ تیری چاہ کہیں

۲۳۳

کبھی وفائیں، کبھی بے وفائیاں دیکھیں — ہیں ان بتوں کی غرض آشنائیاں دیکھیں
ہم اُٹھ چلے جو کبھی اس گلی کو وحشت میں — تو اس گھڑی نہ کنوئیں اور نہ کھائیاں دیکھیں
زہے نصیب ہیں اس کے کہ جس نے وصل کی شب[1] — گلے میں اپنے وہ نازک کلائیاں دیکھیں
یہ سطحِ خاک ہے کیا رزم گاہ کا میدان — کہ جس پہ ہوتی ہوئی نت لڑائیاں دیکھیں
گلی میں اُس کی یہ بازارِ مرگ گرم ہوا — کہ داد خواہوں کی واں چار پائیاں دیکھیں
رکھا نہ خط کبھی عارض پہ اس پری رُو نے — برنگِ آئینہ نت واں صفائیاں دیکھیں
ہنوز جیتے رہے ہیں تو سخت جانی سے — وگرنہ ہم نے بھی کیا کیا جُدائیاں دیکھیں
نہ ہاتھ آئی مرے مصحفی وہ زلفِ رسا
میں طالعوں کی بھی اپنے رسائیاں دیکھیں

---

[1] نسخہ الف: یہ شعر ندارد

۲۳۴

جوں اشک راہ خشک سے کم ہے خبر ہمیں — آیا ہے جب سے پیش، تری کا سفر ہمیں
اب اس کے انتظار میں مرنا پڑا دریغ — آنے کی اپنے کہہ نہ گیا نامہ بر ہمیں
جس رہ گذر میں اس کا گذر تھا سو اب تلک — پنواے ہے زمین وہی رہ گذر ہمیں
گہہ دستِ شانہ ہیں تو گہے[1] دستِ بہانہ ہیں — کرنی ہے تیری خدمت زلف و کمر ہمیں
کیا جانتے ہیں ہم کہ وہاں تو بھی ہووے گا — گلشن میں لے گئی تھی نسیم سحر ہمیں
ہر چند برگِ لالہ بہت جھجے ہیں لیک — کچھ خوش لگیں ہیں اپنے ہی لخت جگر ہمیں
نازک دماغ اتنے ہوئے ہیں کہ ان دنوں — دینے لگی ہے نکہتِ گل بھی ضرر ہمیں
اک پنجہ سج کے تو کہیں نکلا تھا ایک دن — آتا ہے اب تلک تری خو سے حذر ہمیں

اے مصحفی زمیں یہ شگفتہ ہے، اس کے بیچ
کہہ کر سنا اک اور غزل خوب تر ہمیں

۲۳۵

راہ عدم دکھائے ہے اس کی کمر ہمیں — اب اپنی زندگی نہیں آتی نظر ہمیں
اے مرگ جلد آ کہ ترے اِنتظار میں — اس زندگی نے سخت دیا دردسر ہمیں
ہیں کاروانِ عمر سے واماندہ ہم غریب — ساتھی چلے گئے ہیں سبھی چھوڑ کر ہمیں
کیا گرمِ اختلاطِ خس و خار ہوں کہ یاں — فرصت ہے زندگی کی بقدر شرر ہمیں
رکھتے یہ پانو ہم تنِ تنہا براہِ مرگ — ملتا گر اس سفر میں کوئی ہم سفر ہمیں
موجِ نسیم تو نہ ہلا اپنی آستیں — وقفہ کہاں ہے مثلِ چراغِ سحر ہمیں
یہ تیغ یہ کمر ہے تو اِک دن تو دیکھیو — دیکھے گی خلق کشتہ تری راہ پر ہمیں
دیکھیں ہیں ہم اس آئینہ خانے میں جس طرف — جز روے دوست کچھ نہیں آتا نظر ہمیں

پورب میں آئے چھوڑ کے دلّی سے شہر کو
اے مصحفی لے آئی ہے قسمت کدھر ہمیں

---

[1] نسخہ الف: کبھی

۲۳۶

جاں باز سپاہی یہیں بے جان ہوئے ہیں
کہتے ہیں اسی کوچے میں گھمسان ہوئے ہیں

ہے اور ہی، خلوت کی پریشانی ہماری
ہم دیکھ کے زلفوں کو پریشان ہوئے ہیں

کیوں روئے ہے شبنم کھڑی، ماتم ہے یہ کس کا
گل باغ میں کیوں چاک گریبان ہوئے ہیں

تسبیح لیے میں جو گیا ہنس کے وہ بولا
اب آپ بھی کیا مرد مسلمان ہوئے ہیں

اب تو مہ و خورشید کو منھ اپنا دکھائے
پھرتے ہیں بہت دیر سے، حیران ہوئے ہیں

افلاک سے کچھ کم نہ سمجھ خاک کا رتبہ
مخلوق اسی خاک سے انسان ہوئے ہیں

دیکھا ہے تجھے جب مہ و خورشید نے پھرتے
لے لے کے بلائیں تری، قربان ہوئے ہیں

کرنے جو لگا ذبح مجھے، غیر یہ بولا
کیا کرتے ہیں یہ آپ بھی نادان ہوتے ہیں

کہ اُس کی طبیعت میں بھی اب وہ نہیں شاید
دن مجھ کو جدائی کے جو آسان ہوتے ہیں

کھانے نہیں دیتے ہیں مجھے خون جگر بھی
نالے تو مرے حلق کے دربان ہوتے ہیں

اے مصحفی مت پوچھ کہ دلّی سے نکل کر
کیا کہیے کہ ہم کتنے[1] پشیمان ہوئے ہیں

۲۳۷

سر کیوں کے نہ ہم باغ کی دیوار سے ماریں
کیا کیا گئیں ان آنکھوں کے آگے سے بہاریں

ہر چند کہ گم گشتۂ صحرائے جنوں ہیں
خضر آئے نظر ہم کو تو اس کو نہ پکاریں

کچھ ڈر نہیں، منزل کو پہنچ جائیں گے ہم بھی
گو راہ ابھی دور ہے، جی کاہے کو ہاریں

جن محلوں میں خوبانِ جہاں صدر نشیں تھے
اب اُن کی جگہ واں نظر آتی ہیں مزاریں

ہم رونے لگے دیکھتے ہی دور سے اُن کو
جب تیرے شہیدوں کی نظر آئیں مزاریں

کچھ کام نہیں ہم کو تو خوبانِ جہاں سے
مُکھڑے کو ملیں غازہ کہ[2] زلفوں کو سنواریں

ہر چند کہ سائل ہیں ترے در کے پہ ہم تو
حاتم کے بھی آگے نہ کبھی ہاتھ پساریں

لدتا ہے ابھی قافلہ، ہاں ہم بھی چلیں گے
یارانِ سُبک سار جو ہیں وہ تو سدھاریں

۱؎ نسخہ الف: کیسے　　۲؎ الف: وہ زلفوں کو الخ

گلدستہ تو کیا چیز ہے گر ہووے رسائی
ہم مکھڑے پہ تیرے مہ و خورشید کو واریں

گلزار ہے داغوں سے زبس اپنا سراپا
طاؤس خجل ہووے جو جامے کو اُتاریں

اے مصحفی شکوہ نہ کریں روزئی کم کا
یوں چاہیے اب ہم کو کہ اوقات گذاریں

۲۳۸

کم خواب کی یہ جو[۱] نظر آتی ہیں ازاریں
بخت اُن کے ہیں جو لُوٹتے ہیں ان کی بہاریں

یارانِ عدم سنتے نہیں بات کسی کی
کس طرح ہم ان قافلے والوں کو پکاریں

باشندے جو اس کوچے کے ہیں یاس کے مارے
جیتے ہی بنا رکھتے ہیں واں اپنی مزاریں

ہم وہ ہیں کہ ہرگز نہ کہیں بات کسی سے
گر جی میں اُٹھے جوش تو پھر جی ہی میں ماریں

اے تیغ اجل جلد خبر لے تو ہماری
ہم سر سے کسو طرح تو یہ بوجھ اتاریں

ہم وہ ہیں کہ درماندہ پسِ قافلہ گر ہو
ہر گام پہ ٹھہریں اُسے پھر پھر کے پکاریں

ہے عرصۂ شطرنج فلک، مُہرے کواکب
ہم ایسے کہاں کے ہیں جو بازی کو نہ ہاریں

کچھ شغل نہیں ہم کو تو بیداری شب کا
کس طرح پھر اوقات بہ غفلت نہ گذاریں

قصد اپنا تو ہے مصحفی مے خانے کی جانب
جو کعبہ رواں ہوویں وہ کعبے کو سدھاریں

۲۳۹

رکھتا ہے جو تُو زبان شیریں
میرا بھی تو ہے بیان شیریں

خسرو سے نہ روٹھ ہے وہ عاشق
عاشق کو ستا نہ، مان شیریں

لاکھوں ہی کے دم میں خون کرتے
کھاتے ہو یہ تیرے پان شیریں

کہتے ہیں کہ تیرے عشق میں دی
فرہاد نے اپنی جان شیریں

کرتے نہیں اس طرح سے معشوق
عاشق کا امتحان شیریں

حلقے ہیں یہ زلف کے نہیں رُخ
لیلیٰ کی ہے مہمان شیریں

---

۱ آصفیہ: جویہ

کہتے ہیں کہ مر گیا جو خسرو — کھا زہر موئی اُس آن شیریں
شرویہ مرا بہ تلخ کامی — دُنیا سے گئی جوان شیریں
اے مصحفی عشق وہ بلا ہے
جس سے نہ بچی ندان شیریں

۲۴۰

دیکھ آیا ہے یہ کس جامۂ چسپاں کے تئیں — چاک کرتا ہے جو گل اپنے گریباں کے تئیں
ایک عالم نہ کہیں زیر و زبر ہو جاوے — منع کر منع ذرا جنبشِ مژگاں کے تئیں
مے کشو شیخ کی تقصیر بھی کچھ ثابت ہے — کیوں عبث کھینچتے ہو مردِ مسلماں کے تئیں
آپ یہ دل ہے مرا اپنے کیے پر نادم — تم پریشاں نہ کرو اور پشیماں کے تئیں
گر خدائی میں تصرّف مجھے ہوتا تو میں — کوتہی عمر کی دیتا شبِ ہجراں کے تئیں
اے صبا یار سے کہیو کہ یہ کہتے ہیں اسیر — کبھی آباد کروگے درِ زنداں کے تئیں
یار نے دی ہمیں لب اپنے سے گر اک دشنام — یہ سمجھ، بخش دیا ملکِ سلیماں کے تئیں
بحر و کاں میں گہر و لعل کی ہے اب یہ دعا — نہ لگے چشمِ بد اُن کے لب و دنداں کے تئیں
یاد کر قیس کو، اے مصحفی رویا میں بہت
دشت[1] میں دیکھ کے آوارہ غزالاں کے تئیں

۲۴۱

دلّی ہوئی ہے ویراں، سُونے کھنڈر پڑے ہیں — ویران ہیں محلّے، سنسان گھر پڑے ہیں
جب دیکھتا ہوں ان کو، تب تا کمر پڑے ہیں — یہ بال میرے جی کے پیچھے مگر پڑے ہیں
عزّت یہ پیادگی کی[2] کم ہے کہ گھوڑے والے — گھوڑے سے دیکھتے ہی مجھ کو اُتر پڑے ہیں
دیکھا تو اس چمن میں بادِ خزاں کے ہاتھوں — اُکھڑے ہوئے زمیں سے کیا کیا شجر پڑے ہیں
قریاتِ ہند کا اب یہ رنگ ہے کہ کوسوں — جاوے کوئی جدھر کو اُجڑے نگر پڑے ہیں
رویا ہے اس چمن میں کون آ کے اے صبا جو — ہر نخلِ گل کے نیچے لختِ جگر پڑے ہیں

---

[1] آصفیہ: دیکھ کر دشت میں الخ — [2] آصفیہ: عزت پیادگی میں الخ

بگڑا کیے ہیں ہم بھی اس نازنین سے ہر دم
کام اپنے رفتہ رفتہ یوہیں سنور پڑے ہیں

ہیں جان و دل کے خواہاں، کیا سر کے بال اس کے
جو کچھ اِدھر پڑے ہیں اور کچھ اُدھر پڑے ہیں

مقتل میں یہ تماشا اُس کے یہاں میں دیکھا
ایدھر کو دھڑ پڑے ہیں، اودھر کو سر پڑے ہیں

بُلبل کا باغباں سے کیا اب نشان پوچھوں
بیرونِ درِ چمن کے، یک مشتِ پَر پڑے ہیں

شبنم گلاب پاشی غنچے کی جلد اُٹھا لا
گُل بسترِ غشی پر سب بے خبر پڑے ہیں

اے مصحفی ہیں ان کو اب چھوڑتا ہوں کوئی
وہ بعد مدّتوں کے میری نظر پڑے ہیں

۲۴۲

کبھی تو بیٹھوں ہوں جا اور کبھی اٹھ آتا ہوں
منوں ہوں آپ ہی، پھر[۱] آپ ہی رُوٹھ جاتا ہوں

معاملہ تو ذرا دیکھیو تو چاہت کا
مجھے ستاوے ہے وہ، اُس کو میں ستاتا ہوں

رُکا ہوا وہ مجھے دیکھ کر جو بولے ہے ق
تو بولتا نہیں میں اُس سے، سر ہلاتا ہوں

پراتنے میں جو میں سوچوں ہوں یہ نہ رُک جاوے
زباں پہ اپنی بھی اک آدھ[۲] حرف لاتا ہوں

کہے ہے دل یہ کہ ایسے سے دوستی ہے عبث
بُرائیوں کا جو اُس کی خیال لاتا ہوں

یہ کہہ کے بیٹھ رہوں ہوں جو اپنے گھر میں ذرا
تو دل کہے ہے یہ گھبرا کے: "میں تو جاتا ہوں"

جب اپنا حال یہ دیکھوں ہوں میں تو ہو ناچار
جھپٹ کے پیچھے سے دل کے قدم اٹھاتا ہوں

بتا تو مصحفی کیا تجھ کو ہو گیا کم بخت
کچھ ان دنوں ترا چہرہ تغیر پاتا ہوں

۲۴۳

یہ جو اپنے ہاتھ میں[۳] دامن سنبھالے جاتے ہیں
پیچھے پیچھے اِن کے، اِن پر مرنے والے جاتے ہیں

لطف و رنجش کا تماشا ہے کہ دن میں لاکھ بار
گہہ بلائے جاتے ہیں ہم گہہ نکالے جاتے ہیں

جان سے جاتے رہے ہیں بسکہ لاکھوں بے گناہ
ہر طرف کوچے میں اس کے خوں کے نالے جاتے ہیں

سعی تو اپنی نہ کر اے گریہ صرفِ شست و شو
دل کے، دھونے سے کوئی یہ داغ کالے جاتے ہیں

---

۱ الف: تو پھر آپ ہی الخ ۲ الف: اک اور ۳ آصفیہ: ہاتھ سے

گر نہیں ہے وعدہ گہ وہ کو تو کیوں راتوں کو لوگ
اس کے کوچے میں اندھیرے اور اُجالے جاتے ہیں

اس کے کانوں تک رسائی کیوں نہیں، حیران ہوں
عرش اعظم تک تو میرے شب کے نالے جاتے ہیں

ہو گیا ہوں میں تو اُن کا مصحفیؔ حلقہ بگوش
یاد سے میری کب اُن کانوں کے بالے جاتے ہیں

۲۴۴

پھول لائے کے ہیں جتنے، چشمِ خوں آلودہ ہیں
اس چمن کے بیچ کیا کیا گلبدن آسودہ ہیں

جا پڑی ہے کیا کسی کی تیرہ بختی پر نظر
جو کئی دن سے میاں آنکھیں تری بےدودہ ہیں

یہ چمن افسوس کی جا گر نہیں تو کس لیے
برگ ہائے لالہ و گل دست باہم[1] سودہ ہیں

نہی کا اندیشہ دل میں تک ذرا لاتے نہیں
ہم بھی کتنے مرتکب ہے ہے بہ نافرمودہ ہیں

غنچے اِس گلزار میں لاکھوں ہیں، لیکن مصحفیؔ
جب تلک تو آئے سب بندِ قبا نکشودہ ہیں

۲۴۵

کس کے مقتل سے ہوا آج گذار دامن
یک وجب خون میں تر، ہے جو کنار دامن

پاس خاطر ہے ضرور اس کی بھی اے دست جنوں
رشتہ رکھتا ہے گریبان سے تار دامن

در بہ در خاک مری پھرتی ہے ہمراہِ صبا
کاش ہو جائے کسی کی یہ غبار دامن

خون عاشق کی نہ بے صرفہ بہا رنگینی
غیر کے ہاتھ سے دلوا نہ فشار دامن

جامہ چیں نے تو چمن تجھ کو بنایا ہے تمام
دیکھوں چولی کی چُنت[2] یا کہ بہار دامن

فی المثل جامۂ شبنم ہو گر اُس کے بر میں
اُڑ سکے تو بھی تو اُس گل سے نہ بارِ دامن

دامن اس گل کا ہے پاؤں کے تصدق دمِ رقص[3]
اور ہم ہوتے ہیں جی ہی میں نثار دامن

فائدہ کچھ نہیں، رہنے کا چمن میں ایسے
ایک کانٹا بھی جہاں ہووے نہ خار دامن

مصحفیؔ آوے ہے تو کیا کسی خارستاں سے
ریشہ ریشہ ہیں جو یکسر ترے تارِ دامن

---

[1] الف: برہم   [2] الف: چُنٹ   [3] نسخۂ الف و ن ا: تصدق ہر دم

۲۴۶

خونِ ناحق ہے مرا، نقش و نگارِ دامن
کہیں کچھ گل نہ کھلا دے یہ بہارِ دامن

ہاتھ نکلا نہ کوئی گورِ غریباں سے کبھو
گرچہ سو بار ہوا واں سے غبارِ دامن

بر میں جب پہنے ہے تو جامۂ زرکش، عشاق
حرزِ جاں کرتے ہیں لے کر ترے تارِ دامن

نہ گئی گریۂ خونیں کی ادھر رنگینی
اب گریبان ہو کس منھ سے دوچارِ دامن

جفتِ شمع اُس کی وہ ساقیں ہیں کہ جن کے اوپر
نہیں فانوس سے کچھ کم وہ حصارِ دامن

سرمۂ چشم اگر ہو نہ سکی میری خاک
یہ بھی بس ہے کہ ہوئی اس کی غبارِ دامن

مصحفی کیوں کے نہ بھڑکوں[1] میں کہ تحریکِ نسیم
آتشِ دل پہ مری کرتی ہے کارِ دامن

۲۴۷

اشک خونیں ہیں مرے نقش و نگارِ دامن
کس کو دکھلاؤں میں اے گل یہ بہارِ دامن

شکر صد شکر نہیں میں کسی خاطر کا غبار
خاکسارانہ جو ہوں بھی تو غبارِ دامن

ناز کی دیکھ تو اس کی کہ بہ ہنگام خرام
رگِ گل کو بھی سمجھتا ہے وہ خارِ دامن

کیا سمجھ دشتِ تجرّد میں قدم ہم نے رکھا
ایک کانٹا بھی ہوا واں نہ دوچارِ دامن

دامن اک خوشۂ پرویں نظر آتا ہے ترا
موتی گوٹے کے ٹکے ہیں جو کنارِ دامن

نذر کانٹوں کی کیے دشتِ جنوں میں جا کر
رہ گئے تھے جو کہیں یک دو سہ تارِ دامن

مصحفی چلتے تھے ہم اس کی جلو میں اس وقت
جب کہ طفلی میں وہ ہوتا تھا سوارِ دامن

۲۴۸

عشق میں امتحاں ہزاروں ہیں
خستہ و نیم جاں ہزاروں ہیں

بات آہستہ کہہ، کہ مجلس میں
دوست دشمن میاں ہزاروں ہیں

---

[1] آصفیہ : بھڑکوں

تو تو ٹک صاف رہ کہ تیرے لیے
مجھ سے یاں بدگماں ہزاروں ہیں

آتشِ گل بھڑکیو بچ کے ذرا
باغ میں آشیاں ہزاروں ہیں

باغباں گر نہیں تو کیا غم ہے
گل کے یاں پاسباں ہزاروں ہیں

تجھ سے دل لگ گیا ہے، یوں تو مرے
مشفق و مہرباں ہزاروں ہیں

سیر کی جا ہے آج مژگاں پر
اشکِ خونیں رواں ہزاروں ہیں

عشق کا قصہ، ایک جلد نہیں
اس کی تو داستاں ہزاروں ہیں

مصحفی مجھ سا کم ہے دلّی میں
یُوں تو جادو بیاں ہزاروں ہیں

۲۴۹

میں کیا کہوں کہ راتیں کیا سخت کٹتیاں ہیں
اپنی تو چھاتیاں ان راتوں سے پھٹتیاں ہیں

جاؤں کدھر کہ یارو وہ نازنین سی زلفیں
آ آ کے خواب میں بھی مجھ کو لپٹتیاں ہیں

گلشن میں بلبلوں نے جو شور کر رکھا ہے
شاید گلوں کی شاخیں پھر اب کی چھٹتیاں ہیں

پیغامِ وصل مجھ کو دیتی ہے کم نصیبی
جب دن لگیں ہیں بڑھنے اور راتیں گھٹتیاں ہیں

میں سامنے سے ناگہ آجاؤں ہوں تو دو ہیں
ہوتے ہی اس کی سیدھی نظریں پلٹتیاں ہیں

خورشید جھانکتا ہے، دلّی کی مہ جبیناں
جس دم نقابیں اپنے رخ سے اُلٹتیاں ہیں

اے مصحفی تو اتنا رویا نہ کر کہ ظالم
رونے سے تیرے سب کی نیندیں اُچٹتیاں ہیں

۲۵۰

یا تو[1] کٹتی تھی[2] بہم عالمِ یک جائی میں
جاگنا مجھ کو پڑا[3] آیا شبِ تنہائی میں

کس طرح چین سے گذرے کہ بچھڑتے ہی ترے
آگیا فرق مرے تاب و توانائی میں

قلقِ خستہ درونانِ الم کیا جانے
جس کی بھر عمر کٹے صبر و شکیبائی میں

کیوں نہ خوش ہو تو صنم، صرف کیا صانع نے
لطفِ رعنائیٔ گل بھی تری رعنائی میں

---

[1] آصفیہ : منھ سے [2] آصفیہ : یا گذرتی تھی [3] ن ۲ : یا پڑا جاگنا مجھ کو

خالی از لطف نہیں چاک گریباں پھرنا   ہم نے دیکھے ہیں مزے عالمِ رسوائی میں[1]

شب کو کھڑے سے اُٹھا یا تھا میاں تو نے نقاب   تو ہی کہہ کچھ بھی رہا تھا مری رسوائی میں

مصحفیؔ قیس کے ملنے کا نہ کر قصد میاں
انس دیکھا ہے کہیں مردمِ صحرائی میں

۲۵۱

تبِ غم سے جو چھاتیاں جلیاں   حسرتیں آب ہو کے بہہ چلیاں

نازک و نرم انگلیاں اس کی   ایسی ہیں جیسے مونگ کی پھلیاں

کیا کہوں فندقوں کا اس کی رنگ   دسوں جیسے گلاب کی کلیاں

کیوں کے دلّی سے لکھنؤ ہے خوب   نہ وہ کوچے یہاں نہ وہ گلیاں

لے گیا دل کو مصحفیؔ کے وہ شوخ
باتوں باتوں میں کر کے چھل بلیاں

۲۵۲

جس گھڑی قاتل کے تھا حلقومِ بسمل ہاتھ میں   رہ گیا تھا وہ بھی لے دامانِ قاتل ہاتھ میں

جن دنوں تھی میری اور اس کی ذرا صحبت برآر   وہ بھی جوں آئینہ رکھتا تھا مرا دل ہاتھ میں

اب یہ کیا فتنہ اُٹھا جو چاک در کرنے کو بند   اس کے گھر والے لیے پھرتے ہیں کہگِل ہاتھ میں

جس نے گستاخانہ اس کی زلفِ مشکیں کو چھوا   ہم نے اس ناداں کے پھر دیکھے سلاسل ہاتھ میں

لطف تو تب ہے کہ مجنونِ بیاباں گرد کے   ہو گریباں کے عوض دامانِ محمل ہاتھ میں

اس تمنّا میں کہ تیغ اس کی کہیں ہووے علم   سر لیے بیٹھے ہیں اپنا اہلِ محفل ہاتھ میں

بھیک لی میں ہاتھ میں اس کی تو یوں بولا وہ شوخ   چاہیے پیالہ رکھے درویش سائل ہاتھ میں

ہاتھ تو مارے بہت میں بحرِ غم میں مصحفیؔ
پر نہ آیا گوشۂ دامانِ ساحل ہاتھ میں

---

[1] ن ۲ : یہ شعر ندارد   ن ۱ : ہم نے دیکھے ہیں ترے الخ

۲۵۳

کبھی اس تازہ گُل بن ہم جو رخت اپنا بدلتے ہیں — ملیں ہیں عطر تو لیکن کفِ افسوس ملتے ہیں
نزاکت اور صفا ایسی بہم پہنچائی ہے اس کو — کہ سبزے پر چمن کے پانْو شیشے کے پھسلتے ہیں
خدا جانے میں دیکھ آیا ہوں کس موتی کے دانے کو — جو اشک آنکھوں سے میری رات دن موتی سے ڈھلتے ہیں
دلا تنہا نہ رکھیو پانْو صحرائے محبت میں — یہ وہ صحرا ہے جس میں قافلے مل مل کے چلتے ہیں
وہ واں تعویذِ بازو ہو رہے ہیں دوست دشمن کے — جنھوں کے واسطے[1] راتوں کو یاں تعویذ جلتے ہیں
جب اس مجلس میں جاتے ہیں تو ہو جاتی ہے یہ حالت — کہ ہم گھبرا کے آپ ہی گرتے ہیں آپ ہی سنبھلتے ہیں
کوئی ان کافروں کے ہاتھ سے کیدھر نکل جاوے — نئی ترکیب ہے روز اور نئے نقشے نکلتے ہیں
شہیدِ ناز کو تیرے جہاں لے جا کے گاڑا تھا — یہ حالت ہے کہ واں سے خون کے نالے اُچھلتے ہیں
ٹلیں گے لے کے ہی، دل کے عوض اس شوخ کا بوسہ — جو وہ دل لینے پر مچلا تو اب ہم بھی مچلتے ہیں
جو خط بھیجوں تو خط کو آگ پر رکھ دے ہے وہ ظالم — جو قاصد جائے تو قاصد کے واں تلّے نکلتے ہیں
کچھ ان روزوں تو میں یہ رنگ دیکھا اس کی مجلس کا — کبوتر مکّی ہو جاتے ہیں اور مکتوب جلتے ہیں

عبث تو کوہِ غم سے کر رہا ہے رات دن کُشتی
کوئی اے مصحفی ایسے پہاڑ آگے سے ٹلتے ہیں

۲۵۴

جن روزوں کہ تھا اپنا گزر اُس کی گلی میں — مارے تھے فرشتہ بھی نہ پر اُس کی گلی میں
تلوار سے مارے گئے ہیں بسکہ ہزاروں — بہتا ہے لہو تا بہ کمر اُس کی گلی میں
آئے تو وے آتے ہوئے تیغ کو لے کر — ہم کاٹ کر رکھ آئے جگر اُس کی گلی میں
آنے سے مرے پیشتر اے وائے یہ کس نے — کہہ دی مرے آنے کی خبر اُس کی گلی میں
یاں تک ہوئے پامال کہ پایا نہ صبا نے — کچھ خاک ہماری کا اثر اُس کی گلی میں
دو چار قدم جا کے پھر آتے ہیں ہمیشہ — رہنا ہے ہمیں اور سفر اس کی گلی میں
جی جائے گا اس جا کبھی مر جائے گا یعنی — ہر گام پہ ہے لاکھ خطر اس کی گلی میں

---

[1] ن ۲ : جنھوں کی فکر میں

پھر گور و گڑھا اس کو وہاں کچھ نہیں ملتا
جاتا ہے کوئی خستہ جو مر اس کی گلی میں

بیم سگ و دربان تو ہرگز نہیں ہم کو
ہے اپنے نصیبوں کا ہی ڈر اُس کی گلی میں

وہ گھورنے لگتا ہے ہمیں دیکھ کے کیسا
کرتے ہیں کسو پر جو نظر اُس کی گلی میں

اپنے تو شب و روز کٹے عشق میں یوہیں
کی شام گھر اپنے تو سحر اُس کی گلی میں

یارو وہ کسی کو بھی دکھاتا ہے مُنھ اپنا
پھرتے ہیں عبث شمس و قمر اُس کی گلی میں

ہر بام سے جب آنے لگیں سیکڑوں پتھرے
حیراں ہوں کوئی جائے کدھر اُس کی گلی میں

گہ باغ ارم ہے تو کبھی گلشن جنّت
ہر وقت ہے اک لطف دگر اُس کی گلی میں

غافل نہ قدم رکھ تو کہ رکھتے ہی قدم کے
گردن سے اُتر جائے ہے سر اُس کی گلی میں

میاں مصحفی ڈرتا ہوں کہ ہو جاؤ نہ رسوا
تم جاتے ہو با دیدۂ تر اُس کی گلی میں

۲۵۵

کشتوں کی اس کے لاشیں جو اب تک گڑیں نہیں
شاید کہ جاے دفن انھیں زیرِ زمیں نہیں

کیوں اس گلی میں آنے سے کرتے ہو ہم کو منع
اپنی تو واں کسی سے نگاہیں لڑیں نہیں

ساغر کشی کریں ہیں تری انکھڑیاں مدام
ان کافروں کو ہائے ذرا پاس دیں نہیں

لینا بہ زور بوسہ مرا، دیدنی تھا کل
اور اس کا مُنھ پھرا کے وہ کہنا: نہیں نہیں

تیوری چڑھی ہی رہتی ہے اس پُر غرور کی
وہ کون سی گھڑی ہے کہ چیں بر جبیں نہیں

کہتا ہے مجھ سے راہ میں خط اس کا گم ہوا
قاصد کی بات کا مجھے اب تک یقیں نہیں

کوئی کہیں رہے ہے پڑا اور کوئی کہیں
اس کی گلی میں اپنا ٹھکانا کہیں نہیں

نالے کا اس کے ہائے اثر کون لے گیا
کیا ہو گیا جو نالۂ بُلبل حزیں نہیں

چُبھتا ہے کس لیے وہ مرے دل میں مصحفی
اس کا خدنگِ غمزہ اگر دل نشیں نہیں

۲۵۶

امید وفا پر میں جفائیں بھی اُٹھائیں
پر تو بھی تو آنکھیں نہ تری راہ پر آئیں

سُنبل کو پریشان کیا بادِ صبا نے
جب باغ میں باتیں تری زلفوں کی چلائیں

آنکھیں جو اٹھائیں تو کیا قتل دو عالم
پلکیں جو جھکائیں تو مرے خوں میں ڈبائیں

کچھ بات بن آئی نہ ترے سامنے مجھ کو
ہر چند کہ یوں جی میں بہت باتیں بنائیں

جب پلکوں سے اک اشک کا قطرہ نہ گرے تھا
رو رو کے میں ندیاں انھیں پلکوں سے بہائیں

تھا بسکہ خجل اپنی وہ پیماں شکنی سے
شب مل جو گیا مجھ سے تو آنکھیں نہ ملائیں

جب میں نے کہا: "آنکھیں چھپا" کھول دیا منھ
جب میں نے کہا: "منھ کو دکھا" آنکھیں دکھائیں

شب در تلک اُس کے جو گیا میں تو کھڑے ہو
پردے میں، کئی باتیں مجھے اُس نے سنائیں

ہم عہدہ برآ ہو نہ سکے طوقِ جنوں سے
دیوانوں کی اس فصل میں زنجیریں بڑھائیں

مجروح ہوا میں کہ تری پلکوں نے مجھ پر
نیزہ کبھی ہنس کے، کبھی تلواریں چلائیں

اے مصحفی یک شب نہ کبھی چین سے سویا
کس کافر بے رحم سے میں آنکھیں لڑائیں

۲۵۷

ہے غلط تجھ سے جو امید بہی رکھتے ہیں
ہم تو دستِ تہی اے سروِ سہی رکھتے ہیں

قتل کا کس کے ارادہ ہے جو اس سج دھج سے
آپ نت ہاتھ میں تلوار سجی رکھتے ہیں

دل تمھیں دیں ہیں، فقیروں کی بھی ہو نذر قبول
ہم بساط اپنی میں اے دوست یہی رکھتے ہیں

کرتے ہوویں گے کسی ساتھ مروّت خوباں
ساتھ میرے تو وہی کم نگہی رکھتے ہیں

لذّتِ درد نہ تا اس سے نکلنے پاوے
بھر کے زخموں میں نمک ہم انھیں سی رکھتے ہیں

کیا کریں نذر تری تو ہی کہہ اے زلفِ سیاہ
ہم تو جوں شانہ فقط دستِ تہی رکھتے ہیں

جی میں آتا ہے کروں اُن کو میں اک دن سیدھا
بال زلفوں کے تری مجھ سے کجی رکھتے ہیں

یہ جو چاہے کہ ہو، ہو نا ترا سنمکھ معلوم
عشوہ و ناز و ادا یوں تو سبھی رکھتے ہیں

مصحفی کا نہیں تو سوز کا کہنا مانو
ٹک ادھر دیکھو میاں، ہم بھی تو جی رکھتے ہیں

۲۵۸

مژگاں تری جب تک کہ صف آرا نہ ہوئیں تھیں
آہوں کی مری چھڑیاں بھی برپا نہ ہوئیں تھیں

یوں مل گئے خوبانِ جہاں خاک میں سارے — وہ صورتیں گویا کبھی پیدا نہ ہوئیں تھیں
شوخی نے ترے حسن کی ان کو بھی لبھایا — جو آنکھیں کبھی محو تماشا نہ ہوئیں تھیں
مجھ کو ہی[1] نہ کچھ یاد رہیں، ورنہ شبِ وصل، — باتیں مری اور یار کی[2] کیا کیا نہ ہوئیں تھیں
ندیاں مری پلکوں سے پڑی بہتی تھیں لیکن — آنکھیں کبھی اس طرح سے دریا نہ ہوئیں تھیں
ان کو بھی ترے عشق نے بے پردہ پھرایا — جو پردہ نشیں عورتیں رسوا نہ ہوئیں تھیں
دیکھے تھا ہیں دزدیدہ کبھی اس کی طرف کو — کم بخت نگاہیں مری رسوا نہ ہوئیں تھیں

اے مصحفی اس جنبشِ داماں نے کھلا دیں
جو منھ مندی کلیاں کہ کبھی وا نہ ہوئیں تھیں

۲۵۹

پہلو میں کہاں تک دلِ بے تاب کو داہیں — یا رب یہ زمیں کی کہیں کھنچ جائیں طنابیں
قوت سے ترے پاے نگاریں کی کریں ہیں — خورشید سے پنجہ ترے گھوڑے کی رکابیں
جب دل کا جہاز اپنا تباہی میں پڑے ہے — لے دوڑیں ہیں آنسو وہیں آنکھوں کی غرابیں
اس بات کا کھینچے گا تو خمیازہ کسی روز — پیتا تو ہے جا جا کے تو لونڈوں میں شرابیں
ہو جائے جو بے پردہ تو جل جائے دو عالم — اُس حسنِ جہاں سوز کے حائل ہیں نقابیں
اس سختی سے کہہ کس کے تئیں ذبح کیا ہے — جو خوں میں بھری ہیں تری تلوار کی نابیں
خوباں کا قلق جو ہے، نہیں لطف سے خالی — اک طرفہ ادا رکھتی ہیں کافر کی خرابیں
بادام کواکب سے ہوا مجھ پہ یہ روشن — نعمت سے بھری ہیں یہ سب افلاک کی قابیں

ہرگز ورقِ دل کے نہ مضمون کو پہنچا
اے مصحفی کیں جمع عبث تو نے کتابیں

۲۶۰

خنجر کی میاں پوچھ تو لوہو، بھری نابیں — ہم جب تئیں کشتے کو ترے خاک میں داہیں
کچھ تجھ کو خبر ہے کہ نہیں ہو کے دو ٹکڑے — مہ آپ بنا ہے ترے توسن کی رکابیں

۱؎ آصفیہ: بھی　　۲؎ آصفیہ: مرے اور یار کے

دیواں کو مرے دیکھ کے یوں کہنے لگا وہ :
"بکتی ہوئی پھرتی ہیں بہت ایسی کتابیں"

آگاہ ہوں میں خوب لغت ہائے فلک سے
دیکھی ہوئی ہیں میری تو یہ ساتوں نصابیں

افراد ہیں یہ جتنے کہ ارضی و سماوی
سچ پوچھو تو ہیں چہرۂ بازی کی نقابیں

رنگینی سے خالی نہیں ازبسکہ وہ، کافر
دل خوں کریں ہیں ترے پانْو کی جرابیں

اے مصحفی اب چکھیو[1] مزا زُہد کا تم نے
مے خانے میں جا جا کے بہت پی ہیں شرابیں

۲۶۱

کر دل کی ذرا سیر، کہ ہے سیر اسی میں
عاشق کا بنا ہے حرم و دیر اسی میں

دریائے محبت سے نہ باہر نکل اے دل
ہے شوق سا تجھ کو تو ذرا پیر اسی میں

مذکور جو کرتا ہوں میں اُس شوخ کا ہر جا
سُن سُن کے موئے جاتے ہیں بس غیر اسی میں

بیٹھوں ہوں جو اس کو میں تو کہتا ہے وہ ظالم
اُٹھ جا ابھی یاں سے، ہے تری خیر اسی میں

اے مصحفی ہر دم نہ کر اس شوخ کا شکوہ
جانے بھی دے بڑھتا ہے میاں بیر اسی میں

۲۶۲

جب تلک دادِ محبت میں لگا بیٹھا ہوں
ننگ و ناموس سے میں ہاتھ اٹھا بیٹھا ہوں

ڈھونڈتا ہے مجھے وہ تیغ لیے اور میں وہیں
ڈر کے مارے پسِ دیوار چھپا بیٹھا ہوں

جب ذرا آئی ہے طاقت تو نکل کر گھر سے
شوق کے مارے تری راہ میں آ بیٹھا ہوں

ہاتھ اب طرۂ سنبل کو لگانے کو نہیں
قسم اس شوخ کی زلفوں کی میں کھا بیٹھا ہوں

جب کبھی تیغ نکالی ہے مرے قاتل نے
سب سے پہلے میں ہی میداں میں جا بیٹھا ہوں

اُس نے غصے سے اگر مجھ کو پکارا ہے کہیں
میں بھی جھنجھلا کے اُسے گالی سنا بیٹھا ہوں

طُرفہ صحبت ہے کہ خلوت میں شبِ وصل کے بیچ
وہ کھنچا مجھ سے تو میں اُس سے کھنچا بیٹھا ہوں

غیر مجلس سے جو میں اس کو اٹھاتا ہوں تو وہ
یہی کہتا ہے کہ چل بھی، تجھے کیا، بیٹھا ہوں

---

[1] ن ۱ : چکھو

کیا بُری خو ہے تری، تجھ کو کہا اے ہم دم
چھیڑ مت مجھ کو میں اس وقت رُکا بیٹھا ہوں

مصحفی مجھ کو نہ کر شعر و سخن کی تکلیف
اس گھڑی جان سے میں اپنی[۱] خفا بیٹھا ہوں

۲۶۳

مجھ کو اس بت سے ملا دے تو سرِ راہ کہیں
سن لے میری بھی شتاب اے مرے اللہ کہیں

کوچۂ زلف میں پھرتا ہوں بھٹکتا کب کا
شب تاریک ہے اور ملتی نہیں راہ کہیں

آہ کرنے سے دلا تیرے مجھے یہ ڈر ہے
ہو کے بجلی نہ پڑے تجھ پہ تری آہ کہیں

جی درازی سے تو اب اس کی تنگ آیا ہے
یا الٰہی یہ شبِ ہجر ہو کوتاہ کہیں

دوستی کا جو مرے ساتھ تو دم بھرتا ہے
دشمن اس بات سے ہو جائے نہ آگاہ کہیں

مجھ کو اب تاب غمِ عشق نہیں ہے اے کاش
جان ہی لے کے ٹلے یہ غمِ جاں کاہ کہیں

جب مرے پاس سے یار اٹھ ہی گیا مجھ کو کیا
خواہ وہ غیر کے گھر جا کے رہے خواہ کہیں

چاہ کا اس کی ہی تو ذکر کیا کرتا ہے
تجھ کو رسوا نہ کرے مصحفی یہ چاہ کہیں

۲۶۴

یارو ہماری گر اُسے چاہ اس قدر نہیں
ہم کو بھی دوستی کا نباہ اس قدر نہیں

بوسہ لیا ہے میں نے کفِ پا کا آپ کے
گر بخش دیجیے تو گناہ اس قدر نہیں

کس طرح اس کی تیغ سے عاشق کا سر بچے
ہاتھوں کی کچھ پناہ،[۲] پناہ اس قدر نہیں

منھ پھیر لے ہے دیکھ کے ہم کو وہ طفلِ شوخ
ہر چند اپنا حال[۳] تباہ اس قدر نہیں

چاہیں کہ اس کے ہجر میں ہم آہ کر سکیں
طاقت ہمارے جسم میں آہ اس قدر نہیں

نزدیک اپنے عشق کی منزل ہے دو قدم
گر پاؤں اٹھائیے[۳] تو یہ راہ اس قدر نہیں

کرتے ہیں جس قدر کہ فقیروں سے یہ غرور
ان منعموں کی حشمت و جاہ اس قدر نہیں

چھاتی سراہیے انھیں لوگوں کی جو دلا
کہتے ہیں زخمِ تیغِ نگاہ اس قدر نہیں

---

۱ آصفیہ : اپنی میں   ۲ ن ا : جان پناہ   ۳ ن ا : گر پاؤں اوٹھا ہی

اس کی ادائیں مصحفی کرتی ہیں مجھ کو ذبح
صورت میں تو وہ غیرت ماہ اس قدر نہیں

۲۶۵

یار بن زیست کا کچھ لطف جوانی میں نہیں
زندگانی کا مزا عالم فانی میں نہیں

قاصد آ کے کبھی دل اپنے کو خوش کرتا تھا
اب اثر اس کی بھی تقریر زبانی میں نہیں

غیر اس کے کہ نکلتا ہے ذرا دل کا بخار
فائدہ اور تو کچھ اشک فشانی میں نہیں

تیری تصویر رگِ گل سے مگر کھینچی تھی
یہ نزاکت قلم صنعت مانی میں نہیں

اور ہی بات ہے ہم جس کو سہا[۱] کرتے ہیں
بحث اپنی کبھی الفاظ و معانی میں نہیں

مصحفی درد ٹپکتا ہے سخن سے تیرے
غزل اس لطف کی دیوانِ فغانی میں نہیں

۲۶۶

سیر جہاں سے ہم کو خبر ہے بھی اور نہیں
اک واہمہ سا پیش نظر ہے بھی اور نہیں

دیکھے ٹک آنکھ کھول کے غافل جو تو تو پھر
ہستی تری برنگ شرر ہے بھی اور نہیں

کیا امتحاں کرو ہو ہمارا بہ تیغ و تیر
ہم لوگ وے ہیں جن کے جگر ہے بھی اور نہیں

انجام کیا ہو اس شب ہجراں کا دیکھیے
طالع سے تو امید سحر ہے بھی اور نہیں

خوباں کے کیا دہان و کمر کا کروں میں ذکر
ان لوگوں کے دہان و کمر ہے بھی اور نہیں

لیتا ہے جب وہ ہاتھ میں آئینہ اس گھڑی
باہم قرانِ شمس و قمر ہے بھی اور نہیں

دیکھی ہے جب سے ہم نے وہ شمشیر آب دار
جوں شمع اپنے دوش پہ سر ہے بھی اور نہیں

از بسکہ درد و داغ سے پایا ہے اس نے رنگ
نالے میں عاشقوں کے اثر ہے بھی اور نہیں

گم گشتگان بادیۂ عشق کے تئیں
ریگ رواں کی طرح سفر ہے بھی اور نہیں

بیم و امید ہی میں گذرتی ہے اپنی عمر
کشتی نشیں کو جیسے خطر ہے بھی اور نہیں

وے شورشیں رہیں نہیں ہجراں کی مصحفی
اب اُس گلی میں اپنا گذر ہے بھی اور نہیں

---

[۱] ن ۲: ہنسا

۲۶۷

ساقی تو مے پلا مجھے بھر بھر گلابیاں
پھر اک گھڑی کو دیکھ مری بد شرابیاں

اک عمر تک تو دست و گریباں رہیں مدام
بجلی کی کوندیں دل کی مرے اضطرابیاں

ہے تر ترا لہو میں جو دامان و آستیں
یہ چشم خوں فشاں کی ہیں ساری خرابیاں

کیا کیا نہ جی میں گذرے ہے آتی ہیں جب کہ یاد
عالم میں وہ نشے کے تری بے حجابیاں

مشکل کہ دے کسی کو سواری یہ مصحفی
ہیں توسنِ فلک میں جو یہ بدرکابیاں

۲۶۸

چلتے چلتے جو تری راہ میں آ جاتے ہیں
مہ و خورشید منھ اپنے کو چھپا جاتے ہیں

تو جو ہوتا ہے کبھی گھر میں، تو شوخی کر کے
تیرے درباں ہی کی ہم گالیاں کھا جاتے ہیں

یاں تک آنکھوں میں کھٹکتا ہوں میں ان کی کہ بتاں
دیکھتے ہیں جو، نظر مجھ سے چرا جاتے ہیں

میں تو جاتا نہیں، پر سیرِ چمن کرنے کبھو
دل کے پرزے مرے، ہمراہِ صبا جاتے ہیں

راہ رَو، وے ہیں کہ جاتے ہوئے دل سے اپنے
اُلفتِ کعبہ و بت خانہ گرا جاتے ہیں

آ کے کوچے میں ترے، دل کی تسلّی کے لیے
روزنِ در ہی سے ہم آنکھ ملا جاتے ہیں

کیا عجب اس کا اگر صبح کے ہوتے، نالے
ق
خس و خارِ غم و اندوہ جلا جاتے ہیں

رسم ہے قافلے والوں کی کہ جنگل کے تئیں
یک بیک چلتے ہوئے آگ لگا جاتے ہیں

مصحفی طول کھنچی صحبت اشعار اب، تو
اک غزل اور بھی یاروں کو سنا جاتے ہیں

۲۶۹

جب بتاں زلف کی زنجیر دکھا جاتے ہیں
خون سودائیوں کے جوش پر آ جاتے ہیں

دیکھیے کیوں کے طرف اس کے کہ نظارہ پرست
طرزِ نظارہ کو آنکھوں میں اڑا جاتے ہیں

ہم کو جس دل نے پھنسایا ہے ترے دام کے بیچ
ہم وہی دل تری زلفوں میں پھنسا جاتے ہیں

شوخ چشموں کے جو ہوتا ہے مقابل کوئی شخص
گھور گھور اس کو یہ نظروں میں ہی کھا جاتے ہیں

برگ گل اڑتے ہیں، یا میرے جگر کے ٹکڑے
ہر طرف دست و گریباں ہوا جاتے ہیں

عجب عالم ہے تری زلف کے دیوانوں کا
جب بہار آئے ہے زنجیر تڑا جاتے ہیں

وہ سنے یا نہ سنے، اس کو ہم اپنا احوال
پس دیوار کھڑے ہو کے سنا جاتے ہیں

عشق ہے ان کو جو جاتے ہوئے کوچے میں ترے
اپنے پانو کے نشاں آپ ہی مٹا جاتے ہیں

مصحفی جوش پہ ہے بحر معانی، ہم تو
اب کی پھر زور طبیعت کو دکھا جاتے ہیں

۲۷۰

بیٹھے بیٹھے جو کبھی رونے پہ آ جاتے ہیں
خوں کے نالے ترے کوچے میں بہا جاتے ہیں

یہ وہ کوچہ ہے جہاں گالیاں کھانے والے
سیکڑوں سنتے ہیں اور لاکھوں سنا جاتے ہیں

ناصحوں کی میں نصیحت سے بجاں آیا ہوں
یہ تو بک بک کے مری جان بھی کھا جاتے ہیں

مشت پر لاتے ہیں اس بزم میں گر پروانے
شعلۂ شمع پہ یک مشت جلا جاتے ہیں

وہ بڑے مرد ہیں جو سامنے تیرے آ کر
تیغ ابرو کا تری وار بچا جاتے ہیں

ساغر زہر بھی دیتا ہے فلک گر ہم کو
ہاتھ سے لیتے ہی، ہم اس کو چڑھا جاتے ہیں

ملک ہستی سے جو جاتے ہیں جریدہ ہو کر
راہ میں اپنا سب اسباب لٹا جاتے ہیں

ہاتھ مہندی رچے دکھلا کے ہمیں محبوباں
اور بھی دل میں محبت کو رچا جاتے ہیں

اس زمیں میں غزل اک اور بھی رنگیں کہہ کر
مصحفی چار چمن اس کو بنا جاتے ہیں

۲۷۱

کبھی پردے سے جو وے آنکھ لڑا جاتے ہیں
جو کہ دیکھا نہیں ہم نے وہ دکھا جاتے ہیں

اس کے کوچے کی طرف جب میں لگوں ہوں جانے
دل میں اندیشے کئی اس گھڑی آ جاتے ہیں

یہ وہ صحرا ہے جہاں راہوں کے چلنے والے
چلتے چلتے ہی زمیں بیچ سما جاتے ہیں

---

۱ آصفیہ : اس کے

قصہ خواں گرچہ نہیں ہم، پہ خوشامد کے لیے
داستاں روز نئی کہہ کے سنا جاتے ہیں

یہ بگولے جو یہاں اُٹھتے ہیں، صحرا سے کبھو
آ کے تُربت پہ مری خاک اڑا جاتے ہیں

مل گیا خاک میں جب اشک تو آئی یہ صدا
یعنی جاتے ہیں تو یوں اہلِ صفا جاتے ہیں

اتنے مشتاق تماشا ہیں کہ کوچے سے ترے
ماہ و خورشید بھی نت رو بقفا جاتے ہیں

تو وہ استادِ مسلّم ہے کہ خوبانِ جہاں
تجھ کو آ کر سبقِ ناز سنا جاتے ہیں

مصحفی کیوں کے چھپے ان سے مرا دردِ نہاں
یار تو بات کے انداز سے پا جاتے ہیں

۲۷۲

سرزنش یاں خاک کوے یار کو ہے اور نہیں
پائمالی سایۂ دیوار کو ہے اور نہیں

بس کہ ہے نرمی مرے معشوق کی رفتار میں
اس سے نسبت کبک کی رفتار کو ہے اور نہیں

ذبح کرتا ہے وہ مجھ کو ہاتھ اپنا تھام تھام
خاطرِ زخم اس بتِ خوں خوار کو ہے اور نہیں

بسکہ وہ ہر دم شرابِ ناز کا مخمور ہے
حال سے میرے خبر اس یار کو ہے اور نہیں

پرتوِ رُخ سے ترے اے آفتابِ دل فروز
چہرہ افروزی گل و گلزار کو ہے اور نہیں

مجھ کو آئینے سے یہ روشن ہوا اس کے حضور
بے قراری طالبِ دیدار کو ہے اور نہیں

مصحفی مرتا ہے تجھ سے خوبرو پر اس لیے
آرزوے مرگ اس بیمار کو ہے اور نہیں

۲۷۳

نقشِ شیریں میں تری حسن کا پرداز کہاں
یہ نزاکت یہ ادا اور یہ انداز کہاں

طائرِ سدرہ سے میں تیز پری کرتا ہوں
دیکھیو پہنچی ہے یارو مری پرواز کہاں

عرشیوں کو مرے نالوں نے خبر عشق کی دی
بات لے پہنچے ہیں دیکھو تو یہ غمّاز کہاں

یادِ دہلی سے تو جی اپنا بھرا آتا ہے
ہائے وے سیریں، وہ طفلانِ خوش آواز کہاں

عاشقِ عالم حظ قدر تری کیا جانے
اس نے دیکھا ہے ترے حسن کا آغاز کہاں

آیا مشرق کو تو مغرب سے اب آگے آگے
دیکھوں لے جاوے مجھے طالعِ ناساز کہاں

دم رُکا آئے ہے تنہائی سے یا رب میرا
اٹھ گئے چھوڑ کے مجھ کو مرے دم ساز کہاں

ہاتھ میں شیشۂ مے، ناز سے ہلتا جُلتا
آج جاتا ہے تو اے سروِ سرافراز کہاں

بال طاؤس کو چھب اس کی دکھا دیتا ہیں
یا رب اس وقت گیا وہ بتِ طنّاز کہاں

کیوں کے نسبت دوں رگِ گل کو کمر سے تیری
نازکی اُس کی مسلّم ہے پہ یہ ناز کہاں

مصحفی یار تو سب دشمنِ جاں ہیں واللہ
راز دل کس سے کہوں اپنا میں[1]، ہمراز کہاں

۲۷۴

اوّل تو تھوڑی تھوڑی چاہت تھی درمیاں میں
پھر بات کہتے لکنت آنے لگی زباں میں

کیا جانیے چمن میں کیا تازہ گل کھلا ہو
آئے ہیں آگ رکھ کر ہم اپنے آشیاں میں

ابرو کا اس کی یارو کیا ہم سے ہو سکے وصف
سورج کو جیسے کھینچا اک گوشۂ کماں میں

وہم اور گمان اپنا کیا کام کر سکے واں
نے وہم میں سماوے آوے نہ جو گماں میں

صورت پہ اس کی یارو جاتی ہے جاں اپنی
ہر چند خوبصورت ہیں اور بھی جہاں میں

آجائے غش تجھے بھی اے ماہ گر تو دیکھے
اس کے بدن کا جلوہ پیراہنِ کتاں میں

میداں سے کوئی اب تک واقف نہیں ہے ہے ہے[2]
یوسف کو گم کیا ہے اندھوں نے کارواں میں

دامن ہو میرا خالی لختِ جگر سے کیوں شب
یہ تازہ گل ہیں دیکھوں دامانِ آسماں میں

اے مصحفی وہاں سے ہم خوب رو کر[3] آئے
سوئے چمن گئے تھے کیوں موسمِ خزاں میں

۲۷۵

عشق بازی ہے کچھ یہ کھیل نہیں
اس میں ہر بوالہوس کا میل نہیں

مجھ سے خال اُس کے ایسے رُو کھے ہیں
تو کہے اِن تلوں میں تیل نہیں

سُرمہ دنبالہ دار، آنکھوں میں
سچ جو پوچھو پٹا ہے سیل نہیں

کون سی جاگہ، لکھنؤ کے بیچ،
خوبرویوں کی ریل پیل نہیں

---

[1] ان الف: دنیا میں [2] ن ا: میداں سے کوئی اب تک واقف نہیں ہے کورے [3] آصفیہ: رو کے

کیوں کہ سنبل کی بُو مجھے خوش آئے ۔۔۔ اُس کے بالوں میں تو پھلیل نہیں
کون سا وقت ہے کہ آنکھوں سے ۔۔۔ سیلِ خونِ جگر کی ریل نہیں

مصحفی دل چمن میں کیوں کہ لگے
وہ چنبیلی وہ رائے بیل نہیں

۲۷۶

اقطاعِ زمیں سارے گر دیکھیے موزوں ہیں ۔۔۔ کیا کیا نہ سہی قامت اس خاک میں مدفوں ہیں
شاعر کو خبر کب ہے جو ان کے تئیں باندھے ۔۔۔ یک جنبشِ لب ہی میں یاں سیکڑوں مضموں ہیں
لیلائے عرب[1] ہے تو، آشوبِ ملاحت ہے ۔۔۔ دلّی کے پری پیکر سارے ترے مجنوں ہیں
یہ رنگِ حنا تو نے اے شوخ نکالا ہے ۔۔۔ یا خون سے عاشق کے پنجے ترے گلگوں ہیں
بے پردگی اب تیری پہنچی ہے میاں یاں تک ۔۔۔ جو ہم سے بھی بازاری رُخ کے ترے مفتوں ہیں
جس دن سے ترا چہرہ اُن کو نظر آیا ہے ۔۔۔ اس دن سے میاں میرے سب یار دگرگوں ہیں
افسونِ محبّت کو اک ہم تو سمجھتے ہیں ۔۔۔ نے سحر کے بندے ہیں نے قائلِ افسوں ہیں
جس دن سے میں دیکھا ہے رنگِ کفِ ساقی ۔۔۔ پلکیں مری رنگیں ہیں آنکھیں مری پُرخوں ہیں

اے مصحفی اور ہی ہے اندازِ غزل گوئی
کہنے کے تئیں یوں تو شاعر سبھی موزوں ہیں

۲۷۷

چوسَر میں ہم اُس شوخ سے جی ہار گئے ہیں ۔۔۔ دین و دل و ایماں سبھی ہار گئے ہیں
نے نے یہ غلط، جی تو ہمیں پاس ہے لیکن ۔۔۔ دو چار سپاری کی ڈلی ہار گئے ہیں
جیتا ہے جو یک شیشہ تو پھر مارے خوشی کے ۔۔۔ دو شیشہ شرابِ عنبی ہار گئے ہیں
بازی رہی ہے تو بھی سدا اس کی ہماری ۔۔۔ جیتے ہیں کبھی کچھ تو کبھی ہار گئے ہیں

پوچھا جو میں کیا جیتے میاں مصحفی تم سے
یوں ہنس کے کہا: وہ تو ابھی ہار گئے ہیں

---

[1] آصفیہ: لیلیٰ عرب

۲۷۸

جن ہاتھوں سے لیتا تھا کسو کی میں بلائیں
اُن ہاتھوں سے اب مانگوں ہوں دن رات دعائیں

جس وقت کہ دیکھوں ہوں میں کافر کی ادائیں
مژگاں سے نگاہیں مری لیتی ہیں بلائیں

تو داور انصاف اگر ہے تو ہوا کر
احسنت کہیں ہیں مجھے میری ہی وفائیں

یہ بھی مری قسمت میں لکھا تھا کہ شبِ وصل
یوں طالعِ دُوں تجھ سے مجھے دُور سلائیں

جی میں کبھی انصاف تو تو اپنے کیا کر
کیا کیا سہیں ہیں دیکھ تو میں تیری جفائیں

گلشن میں بہار آئی، گئے پھول، جھڑے نخل
افسوس جو ہم اب بھی گریباں نہ سلائیں

بیدار ہیں طالع اُنھیں لوگوں کے جو ہرگز
پانْو پہ ترے رکھ کے سر اپنا نہ اُٹھائیں

اے مصحفیؔ وہ مجھ کو بچھڑتے ہی گیا بھول
یہ جی میں نہ آیا کہ کبھی خط تو بھجائیں

۲۷۹

ہمارے داغ جگر جب نمود کرتے ہیں
تو ان کو دیکھ کواکب سجود کرتے ہیں

جہاں میں ہم سا بھی کم ہوگا کوئی دیوانہ
زیانِ جاں میں ہیں اور فکرِ سود کرتے ہیں

ہے بوے عشق بھری میرے استخوانوں میں
تب ہی تو آگ پہ یہ کارِ عود کرتے ہیں

موے ہیں حسرت دیدار میں تری جو غریب
ہم ان کے واسطے ختم درود کرتے ہیں

ہمیں سلام نہیں، اور غیر کے گھر میں
ہمیشہ نامہ و قاصد ورود کرتے ہیں

جو رکھے آگ پہ تو اب بھی استخواں میرے
طرح فتیلۂ عنبر کی دُود کرتے ہیں

سیاہ بختی کا کس کی اثر ہے جو خوباں
لبوں کو اپنے مسی سے کبود کرتے ہیں

جو مصحفیؔ نے کیا اپنے ساتھ اے ظالم
کوئی یہ کام نصاریٰ، جہود کرتے ہیں

۲۸۰

باتوں میں آپ ہنس ہنس نت زہر گھولتے ہیں
ہم سے کبھی بے حیا ہیں جو تم سے بولتے ہیں

تیر نگہ ہوا ہے دل میں مرے ترازو — تس پر بھی آپ ہر دم تیغے کو تولتے ہیں
تیرے بھی فتنہ سازی لیویں گے دیکھ اے حشر — خواب عدم سے اب کی جو آنکھ کھولتے ہیں
سینے پہ میرے ہر دم رکھتے ہیں ہاتھ خوباں — دل لے چکے پھر اس میں یہ کیا ٹٹولتے ہیں

جس رہ کہ مصحفی میں روتا ہوا گیا تھا
اس رہ کے جانے والے موتی ہی رولتے ہیں

۲۸۱

جیتا رہوں کہ ہجر میں مر جاؤں، کیا کروں — تو ہی بتا مجھے میں کدھر جاؤں کیا کروں
ہے اضطراب دل سے نپٹ عرصہ مجھ پہ تنگ — آج اس تلک بہ دیدۂ تر جاؤں کیا کروں
حیراں ہوں کہ کیوں کے یہ قصہ چکے مرا — سر رکھ کے تیغ ہی پہ گذر جاؤں کیا کروں
بتلا دے تو ہی ناشدِ دل کا مجھے[1] علاج — گلشن میں[2] اے نسیمِ سحر جاؤں کیا کروں

بیٹھا رہوں کہاں تلک اس در پہ مصحفی
اب آئی شام ہونے کو، گھر جاؤں کیا کروں

و

۲۸۲

جفا شعار جو ہو سو وفا شعار نہ ہو — کوئی امید وفا پر کسی کا یار نہ ہو
یہ آرزو ہے کہ جو اس گلی میں مر جاوے — وہ خاک ہو پہ تری راہ کا غبار نہ ہو
ذرا تو رہ دل بے صبر، کیا ہے بے صبری — ملے گا یار بھی، اتنا تو بے قرار نہ ہو
گلی میں اس کی میں جاتا ہوں، راہ میں مجھ سے — خدا کرے کہ کوئی آشنا دوچار نہ ہو
بھلا وہ غم زدہ سیر چمن کو کیا جاوے — ہوائے خندۂ گل جس کو سازگار نہ ہو
وہ انگلیوں کو کرے جب کہ اپنی فندق بند — ہو اس چمن میں تو ممکن ہے انتشار نہ ہو

---

[1] ن ۲ : مری علاج
[2] نسخہ الف و ن ۱ : کاہش میں

زمین باغ سے اُگتے ہیں لالہ خوں آلود / کسو شہید کی تازہ کوئی مزار نہ ہو
نہ جاوے لگ کے گر اس گل بدن سے موجِ نسیم[1] / چمن کے بیچ کبھی موسم بہار نہ ہو
کیے ہیں فرش میں اس کی گلی میں خارِ مژہ / کہ تا یہاں قدمِ غیر کا گذار نہ ہو
علاج دل کا مرے ہے اگرچہ صبر و شکیب / میں کیا کروں جو مرا دل پہ اختیار نہ ہو
خبر شتاب لے اس مرغِ دل کی اے صیاد / کہیں تلف ترے ہاتھوں سے یہ شکار نہ ہو
ذرا سمجھ کے قدم شب کو گھر سے باہر رکھ / برونِ در کوئی تازہ امیدوار نہ ہو
بڑا ستم ہے جو اس فصلِ گل میں ناصح سے / رفو مرا یہ گریبانِ تار تار نہ ہو
کبھی ستارہ نہ چمکے زمین کا ہرگز / جو کفش پاؤں میں اُس کے ستارہ دار نہ ہو
میں بے دماغ ہوں صحبت سے اپنی، گیا ہے عجب / کسی کے ساتھ جو صحبت مری برآر نہ ہو
تمام دیدۂ حیراں کی شکل ہے نرگس / کہیں اسے بھی مرے گل کا انتظار نہ ہو
چلا ہے شوق مجھے لے کے آج اُس کی طرف / مزہ تو ہے جو کوئی[2] در پہ پردہ دار نہ ہو
الٹ دے جب کہ تو مکھڑے سے اپنے طرفِ نقاب / کسی کا رازِ نہاں کیوں کے آشکار نہ ہو
ہزار بار تجھے آگے[3] ہم نے سمجھایا / نہ ملیے اُسے کبھی آپ سے جو یار نہ ہو
خدا کے واسطے اے مصحفی کہا بھی مان
تو اس کے پیچھے میاں اس قدر تو خوار نہ ہو

۲۸۳

کیا کم ہوا ہے زخموں سے میرا بدن اُتو / اب تیغ سے کرو ہو جو چادر کفن اُتو
تو نازکی تو دیکھ، کہ موجِ نسیم سے / ہو جاتے ہیں یہ برگ و گل و یاسمن اُتو
زینت سے کام کیا اُنھیں جو ہیں پلاس پوش / ہوتا کہیں دکھا ہے لباسِ خشن اُتو
مجرم کو گرم لوہے سے دیتے ہیں کیوں کے داغ / یہ بات ان سے پوچھیے ہو جن کا فن اُتو
آئے ہے آج گرم ہوا صحنِ باغ میں[4] / کرنے کو بُوٹہ دار قبائے چمن اُتو
ایمن ہیں تیغِ کاریٔ گردوں سے اہلِ فقر / ہرگز نہ ہیں سنا کہ کریں پیرہن اُتو

---

[1] آصفیہ: صبح نسیم [2] ن ۱: کبھی [3] ن ۲: ہم نے آگے [4] ن ۲: موج ہوا گرم باغ میں

زیبندگی سے کام ہے کیا ہم کو مصحفیؔ
اپنے لباس کی ہے یہاں ہر شکن اُتو

۲۸۴

یا الٰہی مرے نالے کا اثر پیدا ہو
شبِ ہجراں کی سیاہی سے سحر پیدا ہو

ہم سے پائی نہیں جاتی کمر اس کی اے لطف
تو ہی کچھ راہ بتا دے تو کمر پیدا ہو

ڈھونڈتے پھرتے ہیں ہم خاکِ کفِ پا کو تری
طرفہ اکسیر ہے یہ خاک اگر پیدا ہو

کھینچ کر تیغ کو آ پہنچے جو قاتل سر پر
سینہ کر دیجیے سپر گر نہ سپر پیدا ہو

مائلِ گریہ میں یاں تک ہوں کہ اعضا پہ مرے
جس جگہ داغ دیں واں دیدۂ تر پیدا ہو

وضع ایسی نہ بنا اپنی کہ جس سے ظالم
دل میں لوگوں کے تری وضع سے ڈر پیدا ہو

کشتۂ رنگِ حنا ہوں میں عجب اس کا کیا
کہ مری خاک سے مہندی کا شجر پیدا ہو

ابر میں چاند چھپانے لگے اپنے منھ کو
ابھی پردے سے جو وہ رشکِ قمر پیدا ہو

ہو جو کشتہ تری تیغِ نگہ پنہاں کا
نہ کہیں لاش ملے اس کی نہ سر پیدا ہو

قدر کر قدر مرے پارۂ دل کی اے چشم
ہے یہ وہ لعل کہ با خونِ جگر پیدا ہو

منزلِ مرگ وہ منزل ہے کہ جس منزل میں
دل میں رستم کے بھی یک بار خطر پیدا ہو

دُرِ معنی کو مرے دیکھ کے حیران رہے
گر زمانے میں کوئی اہلِ نظر پیدا ہو

مصحفیؔ اب کی میں لکھتا ہوں غزل اک ایسی
جس کے ہر حرف سے انداز دگر پیدا ہو

۲۸۵

وہ نہیں میں جسے مرنے کا خطر پیدا ہو
میں تو لوں مول اُسے موت اگر پیدا ہو

نخلِ ماتم ہے مری آہ ثمر اس کا ہے دل
نخلِ ماتم سے سنا ہے کہ ثمر پیدا ہو؟

مجھ کو پھر فکرِ دہن اس کی کرے ہے حیراں
سو خرابی سے اگر موئے کمر پیدا ہو

زندگی تیغ سے ہے شمع کے مانند مری
کاٹیں اک سر کو تو پھر دوسرا سر پیدا ہو

سلسلہ رونے کا میرے نہیں ہوتا برہم
اشک رہ جائے تو پھر لختِ جگر پیدا ہو

یہ بھی قسمت ہے کہ لے جاویں پلک نامۂ غیر — اپنی قسمت سے کبوتر کا نہ پر پیدا ہو
کیا دوا ہووے یہ بیمارِ تبِ ہجراں کی — گر کہیں مصرِ محبت میں شکر پیدا ہو
کس طرح سوزِ غمِ عشق چھپاوے جس کے — سانس لیتے ہوئے سینے پہ شرر پیدا ہو
اس کا کوچہ بھی عجب بھول بھلیاں ہے جہاں — نہ نکلنے کی ملے راہ، نہ در پیدا ہو
درگذر قتل سے میرے کہ پشیماں ہوگا — سخت مشکل ہے کہ پھر مجھ سا بشر پیدا ہو
قصد میں جو ترے کوچے کے گھر اپنا چھوڑے — یا الٰہی نہ اُسے زادِ سفر پیدا ہو
گاڑ دیویں مجھے جس خاک میں با چہرۂ زرد — پھر عجب کیا ہے گر اس خاک سے زر پیدا ہو

مصحفی کے تئیں کیا دوگے مری جاں جواب
روزِ محشر جو وہ با دیدۂ تر پیدا ہو

۲۸۶

تا چند رکھوں دل میں گلستاں کی ہوس کو — ہے جی میں کہ دوں آگ لگا اپنے قفس کو
کیا قافلہ جاتا ہے چلا بے خبرانہ — ہرگز کوئی سنتا نہیں فریادِ جرس کو
آیا جو خیال اس کا مرے دل میں بہ دزدی — کیا خوابِ اجل لے گئی اس رات عسس کو
افسوس کہ در تک یہ فقیر آنے نہ پاوے — مجلس میں تری بار ملے ناکس و کس کو
ہے جاذبِ اربابِ ہوس لذتِ دنیا — چارا نہیں زنہار مٹھائی سے مگس کو
اے شرم تو دے اب مجھے اک آہ کی رخصت — تا چند میں سینے میں کروں ضبط نفس کو
عاشق کے تئیں کھینچے ہے معشوق کی گرمی — لیتا ہے اُٹھا کاہ رُبا دور سے خس کو
فتنے نے کہا دیکھ کے بوٹا سا قد اس کا — لا دے گا قیامت یہی دو چار برس کو

اے شاہِ نجف مصحفی کی ہے یہ تمنا
اِن آنکھوں سے دیکھوں ترے روضے کے کلس کو

۲۸۷

سے منھ پھیر لیا غیر کے دکھلانے کو — اس نے یہ چھیڑ نکالی مرے ترسانے کو
کیا جلے خاک کہ آنے نہیں دیتا کوئی — شعلۂ شمع کے نزدیک بھی پروانے کو

پھاڑ کر اپنا گریباں ابھی مجنوں کی طرح — جی میں آتا ہے نکل جائیے ویرانے کو
عشق مجنوں سے یہ افسانہ نہیں کم لیکن — کون سنتا ہے مرے درد کے افسانے کو
جو گذرتا ہے مرے دل پہ[1] جدائی میں تری — آگہی اس سے ہے[2] اپنے کو نہ بیگانے کو
وو ہیں اٹھ چلتے ہو اک بات کے کہتے صاحب — کتنے چالاک ہو تم غیر کے گھر جانے کو
مصحفی کعبے میں اب دل نہیں لگتا اپنا
ہم بھی اٹھ جاویں گے یاں سے کسی بت خانے کو

۲۸۸

پھر عشق کا ان روزوں آزار ہوا مجھ کو — جینا ترے ہاتھوں سے دشوار ہوا مجھ کو
پھر فصل بہار آئی، زنجیر جنوں ٹوٹی — ہے شرط خبر سودا سرشار ہوا مجھ کو
میں خوں میں جو تڑپوں ہوں اس کا بھی تو باعث ہے — اے ہم نفساں کچھ تو اسرار ہوا مجھ کو
پلکوں سے بلائیں لیں میں اپنی ہی آنکھوں کی — جس وقت ترا پیارے دیدار ہوا مجھ کو
مژگاں نے تری، چھریاں اس دل پہ چلائیں اور — سرمہ تری آنکھوں کا تلوار ہوا مجھ کو
میں اپنے تئیں درخور زنہار نہ پایا پھر — مجلس میں تری پیارے جب بار ہوا مجھ کو
اے مصحفی اک بت سے پھر آنکھ لڑی میری
ہر تار گریباں کا زنار ہوا مجھ کو

۲۸۹

بات کو میری الگ ہو کے نہ شرماؤ، سنو — کچھ کہا چاہوں ہوں میں تم سے، ادھر آؤ، سنو
میں تو جانے کا نہیں روبرو اس کے یارو — کچھ وہ گر تم سے کہے ہے تو تمھیں جاؤ، سنو
چھیڑنے کو مرے گر آپ کا جی چاہے ہے — بے ادب ہوں میں، مرے حق میں جو فرماؤ، سنو
بات بھی مانو کسی کی، کوئی یہ بھی ضد ہے — اپنے عاشق کے تئیں اتنا نہ ترساؤ، سنو
گل صنوبر کا اگر قصہ ہے تم پاس میاں — پڑھنے والا بھی تو موجود ہوں میں لاؤ، سنو
اے دل و دیدہ مآل اس کا برا ہی سمجھو — دیکھ کر اس کے تئیں اتنا نہ للچاؤ، سنو

---

[1] آصفیہ: جی میں   [2] آصفیہ: نہ اپنے کو نہ بیگانے کو

مصحفیؔ بات تو کہنے دو ذرا قاصد کو
پہلے ہی حرف میں تم اتنا نہ گھبراؤ سنو

۲۹۰

سدھاری قوتِ دل، تاب اور طاقت سے کہہ دیجیو — ہوئے ہیں ناتواں ہم، بسترِ راحت سے کہہ دیجیو
موا بھی میں تو اے یارو، جو یاروں سے مرے ہوویں — سلام شوق اُس کا تم مری تربت سے کہہ دیجیو
گر[1] اے قاصد تو اُس کے روبرو جاوے اشارے سے[2] — دعا میری بھی اُس معشوقِ کم فرصت سے کہہ دیجیو
سنو اے یارو، اک معشوق ہر جائی کے جلوے نے — پھرایا در بدر میرے تئیں غربت[3] سے کہہ دیجیو
بیاں جو جو کہ صورت تجھ سے کی ہے میں نے اے قاصد — تو اُس کے کان میں جھک کر اسی صورت سے کہہ دیجیو
بھلا اُس کا تو دل خوش ہوئے گا اس بات کو سُن کر — نہ پہنچے مدّعا کو اپنے ہم، حسرت سے کہہ دیجیو

ہوا دیوانہ، تھا وہ مصحفیؔ تیرا جو سودائی
صبا گر اس گلی میں جائے، جمعیّت سے کہہ دیجیو

۲۹۱

گو کہ زنجیروں میں جکڑیں، روک اس کی کس سے ہو — وہ وہیں جاتا ہے آخر، لاگ جس کی جس سے ہو
جی میں آتا ہے کہ گُل چھلّے کے کھاؤں اس قدر — جو مرا ساعد مشابہ دستۂ نرگس سے ہو
میں تو بندہ ہوں فقط اس کی نگاہِ لطف کا — کام کیا ہے مجھ کو گر وہ آشنا جس تس سے ہو
وہ نہیں ہوں میں، کروں نظارۂ خوباں کو ترک — حرکت ایسی ہاں اگر ہو تو کسی بے حس سے ہو
دید کا ملتا جسے ہو دورگردی میں مزہ — چاہیے وہ شخص باہر حلقۂ مجلس سے ہو
اب تو میں دل پر دیا یارو قرار وصلِ یار — گو کہ دل، بے دل ہے پر یہ کام شاید اس سے ہو

میں بظاہر حد پریشاں حال پاتا ہوں تمھیں
ان دنوں میں تم تو کچھ میاں مصحفیؔ مفلس سے ہو

۲۹۲

خریدار اپنا ہم کو جانتے ہو — بھلا اتنا تو تم پہچانتے ہو

۱؎ آصفیہ: جو اے ۲؎ آصفیہ: اشارے میں ۳؎ آصفیہ: عزت

بنے گا چہرہ یہ کس کا مہ و مہر[1]   جو تم بیٹھے صباحت چھانتے ہو
اُٹھو اے زخمیانِ کوچۂ یار   ق   عبث کیوں خون میں ماٹی سانتے ہو
وہ آنے کا نہیں اب گھر سے باہر[2]   تُم اُس قاتل کو کم پہچانتے ہو
یکایک کر گذرتے ہو وہی جان   تم اپنے جی میں جو کچھ ٹھانتے ہو
غرض ہو آشنا اپنی ہی ضد کے[3]   کسی کی بات کو کب مانتے ہو

گیا ہے قافلہ میاں مصحفیؔ اب
عبث دامن کو تم گردانتے ہو

۲۹۳

گرچہ اے دل عاشق شیدا ہے تو   لیک اپنے کام میں یکتا ہے تو
عاشق و معشوق کرتا ہے جدا   اے فلک یہ کام بھی کرتا ہے تو
لاکھ پردے گر ہوں تیرے حسن پر   کوئی پردوں میں چھپا رہتا ہے تو
حال دل کہنے لگوں ہوں میں، تو شوخ   مجھ سے یوں کہتا ہے: "کیا بکتا ہے تو"
پاس بیٹھا اُس کے میں رویا کیا   یوں نہ پوچھا مجھ سے: "کیوں روتا ہے تو"
رات دن تو ہے مری آغوش میں   میں ترا ساحل، مرا دریا ہے تو
بزم میں اس تند خو کی دوڑ دوڑ   کام کیا کیوں کس لیے جاتا ہے تو

واں نہیں مطلق ترا مذکور بھی
مصحفیؔ کس بات پر بھولا ہے تو

۲۹۴

پیکاں ترا جگر کے اگر متصل نہ ہو   اغلب کہ بعد مرگ بھی تسکین دل نہ ہو
دامن جھٹک کے چلتے ہو تم میری خاک سے   ڈرتا ہوں اس سے شعلہ کوئی مشتعل نہ ہو
اے دل بھلا روا ہے گراں جانی اس قدر   چل دور ہو کہیں، مری چھاتی کی سل نہ ہو
کہتے ہیں جو کہ مردمک چشم آفتاب   مجھ کو گماں ہے یہ ترے عارض کا تل نہ ہو

۱؎ نسخۂ الف: بنے گا چہرہ یہ کس مہر و مہ کا   ۲؎ آصفیہ: آئے گا نہیں   ۳؎ آصفیہ: کی خو کو جانتے ہو

ہے موسمِ بہار کا آغاز، قہر ہے ... اب بھی اگر چمن میں ہوا معتدل نہ ہو
جس کو میں ہو گذار پری طلعتانِ ہند ... وہ کوچہ کیوں کے روکشِ چین و چگل نہ ہو
تصویر تیری کہتی ہے یوں آفتاب سے ... کیا ڈر ہے گو میں خوب ہوں تو منفعل نہ ہو
اے ابر تو بہار، برس اس سے دور دور ... تربت کی میری خاک کہیں اور گل نہ ہو

تو جانیو یہ اس کا ہی زخمی ہے مصحفی
جس زخمِ صید خوردہ کے پہلو میں دل نہ ہو

۲۹۵

رہے مے خانے کے در پر پڑا دن رات کاہے کو ... بطالت میں کوئی ضائع کرے اوقات کاہے کو
ہزاروں بات ہیں دنیا میں مہر و لطف کی لیکن ... تو ہو آزردہ جس میں کیجیے وہ بات کاہے کو
پری کا رو و مو تجھ میں بنایا تھا جو صانع نے ... بنا دی ساتھ اس کے پھر پری کی گات کاہے کو
مرے گریہ نے کی سارے جہاں کی خانہ ویرانی ... ہوئی دنیا میں ایسی طرح کی برسات کاہے کو

اگر دیکھا تھا رخ اس کا تو اِن آنکھوں نے دیکھا تھا
ہوا[1] اے مصحفی دل موردِ آفات کاہے کو

۲۹۶

پہلو سے مرے، یار کا پیکاں نہ نکالو ... ہیں جاں بہ لب آپ ہی ہوں مری جاں نہ نکالو
لے جا کے مجھے یار کے کوچے میں کرو دفن ... تابوت مرا سوئے بیاباں نہ نکالو
سچ روز نکالو نئی تم اپنی صد افسوس ... اور دل سے مرے، وصل کا ارماں نہ نکالو
ڈرتا ہوں نہ لگ جائے نظر تم کو کسی کی ... سر غُرفے سے باہر تو مری جاں نہ نکالو
یک ظلم کا ہووے گا مرا دل متحمّل ... تلوار نکالو تو نمک داں نہ نکالو
ملحد ہوں اگر میں تو بھلا اس سے تمھیں کیا ... منھ سے یہ سخن گبر و مسلماں نہ نکالو
قدغن ہے کہ اس وادیِ پُر خوف و خطر میں ... پانْو سے کوئی خارِ مغیلاں نہ نکالو

چین اس سے ہی ہے مصحفیِ خستہ کے دل کو
رہنے دو خمِ زلفِ پریشاں نہ نکالو

---

[1] ن ا : ہنوز

۲۹۷

گرچہ تم تازہ گلِ گلشنِ رعنائی ہو — پھر بھی یہ عیب ہے[1] اِک تم میں کہ ہرجائی ہو
روٹھ کر بیٹھ رہوں میں وہ منانے آوے — کاش اتنا مجھے مقدورِ شکیبائی ہو
آمد و شد سے تو بدنام ہوں میں اُس کو میں — مجھ کو یہ ڈر ہے کہیں اور نہ رسوائی ہو
موسمِ گل مگر آیا ہے کہ اِس رُت بَن بَن — لوگ جاتے ہیں بیاباں کو تماشائی ہو
ہم کو جو غیرِ خدا کہتے ہیں، اندھے ہیں وہ لوگ — کیا نہ سوجھے انھیں اتنا بھی جو بینائی ہو
بے ستوں سے نہیں تیشے کی صدا آتی آج — پاس فرہاد کے شیریں نہ کہیں آئی ہو
خال و خط کا ہی تصوّر تمھیں رہتا ہے مدام
مصحفی تم بھی عجب طرح کے سودائی ہو

۲۹۸

بالوں کو سنوارو ہو، پھوٹوں[2] کو بناتے ہو — ہر روز نئے نقشے تم ہم کو دکھاتے ہو
نت جاؤں ہی جاؤں تم کرتے ہو جو آتے ہو — یہ بھی کوئی آنا ہے، جاؤ بھی جو جاتے ہو
میں کشتۂ گیسو ہوں، سنبل کو یہاں بو دو — تربت پہ مری یارو کیوں پھول چڑھاتے ہو
کیا خوں کی مرے رنگت مہندی سے یہاں کم ہے — ہاتھوں کے تئیں اپنے، فندق جو لگاتے ہو
مت گرم ملو اتنا دشمن سے مرے ہر دم — کہنا بھی مرا مانو، کیوں جی کو جلاتے ہو
وہ بات تمھاری کو کوئی دھیان سے سُنتا ہے،
میاں مصحفی تم ناحق کیوں مغز پھراتے ہو

۲۹۹

اک بات میں کہوں، اگر آزردہ تو نہ ہو — ہر اک کے[3] اس طرح سے میاں روبرو نہ ہو
اس نوبہار میں تو طرحِ گُل کے اے نسیم — یوں چاہیے کہ زخمِ دل اپنا رفو نہ ہو
جی چاہتا ہے دل کو کروں اپنے چاک چاک — اس واسطے کہ اس میں تری آرزو نہ ہو

---

[1] آصفیہ: پر یہی عیب ہے اک الخ [2] الف: پٹیوں [3] الف: ہر اک سے

اُس حسنِ لایزال کا عالم ہی اور ہے — یہ حسن وہ نہیں کہ کبھو ہو کبھو نہ ہو
تیری قسم ہے، اپنا تو رُک جائے جی وہیں — یک دم جو درمیاں میں تری گفتگو نہ ہو
عاشق کا چاکِ جیب رفو ہو سکے و لے — چاکِ جگر بہ سوزنِ عیسیٰ رفو نہ ہو
عالم کو اِک ہلاک کیا اُس نے مصحفی
دنیا میں اِس قدر بھی کوئی خوبرو نہ ہو

۳۰۰

جس گل کے بیچ مہر و محبّت کی بو نہ ہو — یارب وہ گل شگفتہ چمن میں کبھو نہ ہو
سرگشتہ میری طرح سے پھرتا ہے آسماں — ڈرتا ہوں میں، اسے بھی تری جستجو نہ ہو
اس ناتواں پہ حیف ہے تلوار کھینچنی — جس کے بدن میں ایک بھی قطرہ لہو نہ ہو
تیری ہی ذات سے تو ہے وابستہ یہ طلسم — ہم ہوویں پھر کہاں، کہ اگر ہم میں تو نہ ہو
سونگھوں ہوں جا کے مثلِ صبا وقتِ صبح دم — بستر پہ میرے یار کے پھولوں کی بو نہ ہو
حق نے دیا ہے دل کو مرے عشق دائمی — یہ عشق وہ نہیں کہ کبھو ہو کبھو نہ ہو
کیا دور ہے جو عکس ترا آئینے کے بیچ — اے شرمگیں، حیا سے ترے روبرو نہ ہو
یارب وہ زخم دیجیو مجھے اُس کی تیغ کا — جس زخم پر کہ منّتِ دستِ رفو نہ ہو
مارے حیا کے خاک ہی میں تو تو مل گیا
اتنا بھی مصحفی کوئی بے آرزو نہ ہو

۳۰۱

اگر تم آؤ ہمیں سرفراز کرنے کو — تو ہم بھی رکھتے ہیں اک دل نیاز کرنے کو
حباب وار نہ بحرِ جہاں کا کچھ دیکھا — مگر ہم آئے تھے یاں چشم باز کرنے کو
جہاں میں کون سپید و سیہ کا فرق کرے — شعور چاہیئے ہے امتیاز کرنے کو
دیت شہید کی میرے یہ ہے کہ بعد از قتل — تو دھو کے ہاتھ پھر آوے نماز کرنے کو
گلی میں اُس کی ہوئی خلق یاں تک آسودہ — کہ ہم کو جا نہ ملی پا دراز کرنے کو
سکھایا جس نے میاں تم کو مجھ سے یہ پرہیز — کہا نہ غیر سے کیوں احتراز کرنے کو

برنگِ شعلہ کہ پتھّر کو موم کر دیوے
اِک آہِ گرم ہے بس، دل گداز کرنے کو
موافقت ہو جو طالع کی اُس کی مجلس میں
تو ہم بھی ٹھہریں جس تس سے ساز کرنے کو
سزا ہے مصحفی اپنی، جو اب تعب کھینچیں
کہ یاں ہم آئے نہ تھے عیش و ناز کرنے کو

۳۰۲

رہ گئے دیکھتے ہی ہم در کو
روٹھ کر تم بھلے گئے گھر کو
ٹھہرو، اے قاصدانِ ملکِ عدم
ہے ہمارا بھی قصد اُودھر کو
سوکھ کر رہ گیا ہے کاغذ وار
مرضِ رشتہ ہے جو مسطر کو
ہم سے وہ بے سبب الجھتی ہے
ٹک تو سمجھاؤ زلفِ ابتر کو
جب کہ سب ملک و مال چھوڑ گیا
تب فراغت ہوئی سکندر کو
دل نہیں، رکھ دیا ہے کیا جانے
میرے سینے میں کس نے اخگر کو
گر لبِ جو کا شوق ہے تو صنم
دیکھ عاشق کے دیدۂ تر کو
وہ جو عاشق ہیں اپنے ہاتھوں سے
پھینک دیتے ہیں کاٹ کر سر کو
مصحفی قتل گاہ عشق کے بیچ
نہیں تکلیف دستِ خنجر کو

۳۰۳

ازبس بھلا لگے ہے تو میرے یار مجھ کو
بے اختیار تجھ پر آتا ہے پیار مجھ کو
صیاد کا برا ہو، جس کے تغافلوں نے
کنجِ قفس میں رکھا فصلِ بہار مجھ کو
جاؤں کدھر کو یارو، مانندِ صیدِ خرگہ
مژگاں نے کر رکھا ہے اس کی شکار مجھ کو
اس رفتگی پہ مجھ سے کرتا ہے تو تغافل
ڈانٹے ہے تس پہ الٹا پھر بار بار مجھ کو
میرا قصور کیا ہے، صانع کو چاہیے تھا
مقدارِ حسن دیتا صبر و قرار مجھ کو
فتنہ ہے یا پری ہے جادو ہے یا بلا ہے
آنکھوں سے یہ کیا ہے کس کی دوچار مجھ کو
اے مصحفی تصوّر اس کا جو سامنے ہے
آتا نہیں شبِ غم یک دم قرار مجھ کو

۳۰۴

یاد آئے جو ترے موے پریشاں مجھ کو — صبح تک نیند نہ آئی شبِ ہجراں مجھ کو
کچھ بھی معلوم نہیں زحمتِ زنداں مجھ کو — ہے تری یاد میں زنداں بھی گلستاں مجھ کو
اس حیا پر بھی مرے دل میں کھبی جاتی ہیں — چوری چوری سے جو دیکھیں ہیں وہ انکھیاں مجھ کو
ان دنوں شہر سے جی سخت بتنگ آیا ہے — لے چل اے جوشِ جنوں سوے بیاباں مجھ کو
باغباں، روزنِ در سے تو ذرا جھانکنے دے — کہ نہیں رخصتِ گلگشتِ گلستاں مجھ کو
جرسِ ناقۂ لیلیٰ کی طرح دست بدست — ساتھ پھرتا ہے لیے یہ دلِ نالاں مجھ کو
یاں[۱] جو یک تار بھی باقی نہ رہا دامن کا — کون دکھلا کے گیا چاک گریباں مجھ کو
کام کیا تھا مجھے جلنے سے شبِ ہجراں کے — بے کسی تو نے کیا شمعِ شبستاں مجھ کو
کس کے گیسو کا پڑا اس پہ الٰہی سایہ — سنبل آتا ہے نظر سخت پریشاں مجھ کو
ہیں جو کچھ ہوں سو ہوں کیا کام ہے ان باتوں سے — کوئی کافر کہے یا کوئی مسلماں مجھ کو
جھانوے جب کبھی کرتا ہے تو اے شوخ ادا — مار ڈالے ہے تری جنبشِ مژگاں مجھ کو[۲]
کس کے مجروح گلستاں میں ہیں مدفوں جو ہنوز — غنچے آتے ہیں نظر صورتِ پیکاں مجھ کو

مصحفی گلشنِ گیتی سے میں یہ پھل پایا
کہ طرح گل کی، ملے زخم نمایاں مجھ کو

۳۰۵

خوار رکھتا ہے اب تلک ہم کو[۳] — دیکھ سکتا نہیں فلک ہم کو
دیکھ آنکھوں کو کہتے ہیں بادام — نہ ملیں ایسی کیوں پلک ہم کو
کوند بجلی کی تھی کہ چھپ بھی گئی[۴] — دو ہیں دکھلا کے اک جھلک ہم کو
ہے وہی یہ فلک کہ طفلی میں — نت دکھا بارہا فلک ہم کو

مصحفی سر فرو نہیں لائے[۵]
سجدہ کرتے ہیں یوں ملک ہم کو

---

۱ ن ۲: یہاں اک تار بھی ۲ رامپور ن ۱: یہ شعر ندارد ۳ رامپور ن ۲: میں ردیف مجھ کو ۴ آصفیہ: چھپ ہی گئے
۵ نسخۂ الف: لاتا

۳۰۶

خاک میں مل گئے ہم، یار کا چلنا دیکھو
اُس کی ٹھوکر سے وہ دامن کا اُچھلنا دیکھو

خون سے ہاتھ وہ دھوتا ہے کسی کے گویا
مہندی لگوائے پر ان ہاتھوں کا ملنا دیکھو

چاند جوں چیر کے بادل کو کرے ہے جلوہ
اس کے بالوں سے رخ اس کے کا نکلنا دیکھو

ہاتھ چھاتی پہ رکھو تم مری اے راحتِ جاں
اپنے ہاتھوں سے، مری چھاتی کا جلنا دیکھو

خاک پر چاروں طرف لوٹے ہے سیماب کی طرح
اس کے کوچے میں مرے دل کا مچلنا دیکھو

سوتے کیا دیکھتے پھرتے ہو کنوئیں کے پیارے
آ کے ان چشموں سے چشموں کا اُبلنا دیکھو

کون اس باغ میں آیا ہے مقیمانِ چمن
آج پھولوں کا تو ٹک رنگ بدلنا دیکھو

شمع پر جلتے ہوئے رات یہ کہتا تھا پتنگ
شمع تو جلتی ہے پر میرا بھی جلنا دیکھو

نشۂ مے میں چھکا آئے ہے مے خانے سے
مصحفی کا کوئی اس وقت میں چلنا دیکھو

۳۰۷

گریہ دل کو نہ سوئے چشم بہاؤ
ڈوبتی ہے بھنور میں جا کر ناؤ

نہ گلی اپنی واں کبھی کھچڑی
نت پکاتے رہے خیالی پلاؤ

دل ہے اے نالہ جوں کبابِ ورق
آنچ کم دے، یہ کھا نہ جائے تاؤ

بوسہ لیتے میں کاٹ کھاتے ہو
کیا تمھارا بُرا پڑا ہے سبھاؤ

جی پہ یاں بن رہی ہے یہ تو کہو
آج کیدھر چلے ہو کر کے بناؤ

کیوں کے رکھوں قدم گلی میں تری
واں تو پڑتا نہیں ہے اپنا ہواؤ

آتشِ معدہ کو نہیں سیری
جُوں جہنّم کرے ہے لاؤ ہی لاؤ

دل جو میں گم کیا تو تم کو کیا
یارو اس بات کا کرو نہ چُواؤ

تھی[1] شبِ وصل، پر خیال کے ساتھ
ہم نے دل سے[2] نکالے کیا کیا چاؤ

وہ دل ہے تعلّقے میں ترے
آہ اُوجڑ کر، اس کو خواہ بساؤ

مرہمِ لطف، منھ نہ موڑیو تو
ابھی آلے ہیں سب جگر کے گھاؤ

یہ زمیں بھی ہے طرفہ معنی خیز
مصحفی اک غزل تو اور سناؤ

---

۱ نسخۂ الف: ہے   ۲ الف: ہم سے دل نے

۳۰۸

آج اس نے کیا ہے اپنا بناؤ
دیکھیں کس کس کے دل کے نکلیں چاؤ

میں تو ملتا نہیں ہوں اُس سے ولے
نہیں جاتا ہنوز دل کا لگاؤ

وادیٔ عشق میں نہ جاؤ کہ واں
ہر قدم پر ہیں سیکڑوں ستھراؤ

جگر اس کا سراہیئے جس نے
تیغ پر تیغ کھائی گھاؤ پہ گھاؤ

میری اس کی یونہیں رہی چوپڑ
میں نے برسر کیا، کیا جو وہ داؤ

چور زخموں میں ہوں میں اے ساقی
مجھ کو اس دم جو ہو شراب پلاؤ

اے فلک مان میرے کہنے کو
مجھ سے آزردہ دل کو تو نہ ستاؤ

جب لکھے ہیں میں وصف زلف بتاں
ہو گئے ہیں سیاہ تاؤ کے تاؤ

جی میں آتا ہے ایسے جاڑے میں
کہیں جا بیٹھے لگا کے الاؤ

پائنتی میں پڑا رہا اُس کی
نہ کہا اُس نے اُٹھ کے پانو دباؤ

مصحفی تا کہ میں بایں تقریب
اپنے دل کے نکال لیتا چاؤ

۳۰۹

میرے ملنے سے تمھیں حظ نہ اگر ملتا ہو
دل ملاؤ ادھر اپنا ہی جدھر ملتا ہو

گو کہ یک بار کرے خوے جدائی[۱] وہ غریب
تجھ سے اے جان جو ہر شام و سحر ملتا ہو

کچھ میں ناداں ہوں؟ دوں تب رگ گل سے نسبت
جب رگ گل سے ترا موے کمر ملتا ہو

کیا تماشا ہو میں آجاؤں وہیں غیر کے ساتھ
عید کے دن تو جب اے رشک قمر ملتا ہو

رسم اقلیم عدم طرفہ ہیں دیکھی، جز خاک
واں جو رہنے کو کسی شخص کے گھر ملتا ہو

یارو دیکھو تو جہاں سے یہ بگولا اٹھا
خاک میں واں نہ کوئی خاک بسر ملتا ہو

مصحفی خاک کریں معنئ رنگیں کی تلاش
جب ہمیں قوت بہ صد خون جگر ملتا ہو

---

۱ آصفیہ: تجھ سے جدائی الخ

۳۱۰

نہ تنہا اضطرابِ دل نے شب رسوا کیا مجھ کو — برا ہو شوق کا جو کھینچ کر واں لے گیا مجھ کو
ستانے سے غریبوں کے، ترے کیا ہاتھ آوے گا — خدا سے ڈر ستا مت اس قدر اے بے وفا مجھ کو
کروں تسخیر اس رشکِ پری کو کس طرح یا رب — نہ افسوں یاد ہے مجھ کو نہ آتی ہے دعا مجھ کو
بہر صورت دل اپنے کو پریشاں ہی میں پاتا ہوں — خدا جانے لگی ہے کس کی زلفوں کی ہوا مجھ کو
ابھی یارو جہاں سے ہو کے میں نومید آیا تھا[1] — تماشا دیکھیو تم پھر وہیں دل لے چلا مجھ کو[2]
غبارِ ناتواں ہوں، گر طرف گلشن کے تو جاوے — بھلانا دل سے مت اُس وقت اے بادِ صبا مجھ کو
کروں کیا لے کے اے ہمدم، میں گل کو ہاتھ میں اپنے — کہ اس بن خوش نہیں آتا ہے گل کا سونگھنا مجھ کو
ہوس ملنے کی ہیں کیوں کر کروں اُس ماہ سیما کی — غضب یہ ہے نہیں ہوتا میسّر دیکھنا مجھ کو
ارادہ گر کروں شب کو تو وہ[3] ملتا نہیں مجھ سے — جو جاؤں دن کو تو آتی ہے[4] لوگوں سے حیا مجھ کو
نہ دن کو چین، نے راتوں کو نیند آوے معاذاللہ — کیا ہے اس کی چاہت نے گرفتارِ بلا مجھ کو
عجب کیا ہے جو میرا دردِ دل تسکین پا جاوے — پلا دے گر وہ اپنے ہاتھ سے آکر دوا مجھ کو
دم اس کی آشنائی کا تو بھرتا ہوں پہ یہ ڈر ہے — کہ سن کر اس سخن کو، کیا کہیں گے آشنا مجھ کو

کہوں کیا تجھ سے میں اے مصحفی احوالِ زار اپنا
غرض پھر بیٹھے بیٹھے شوق اِک بُت کا ہوا مجھ کو

۳۱۱

ساتھ وسعت کے ہے ہر چند جہاں رہنے کو — پر ہمیں تو نہیں ملتا ہے مکاں، رہنے کو
تیرے کوچے کے سوا، اپنا ٹھکانا ہی نہیں — جاگہ تجویز کریں اور کہاں رہنے کو
کیوں کے حیراں نہ رہیں ہم کہ خدا نے ہم کو — دیں ہیں جوں آئینہ آنکھیں نگراں رہنے کو
جوں مہِ عید دکھاتے ہو منہ اپنا سرِ ماہ — تم بھی اس بت پہ قیامت ہو نہاں رہنے کو
تیرے کوچے میں رہیں کیوں کہ کہ ہے جائے خطر — جی تو چاہے ہے بہت اپنا یہاں رہنے کو

---

[1] نسخہ الف : ہوں
[2] نسخہ الف : تماشا دیکھیو پھر دل وہیں پر الخ
[3] الف : واں
[4] آصفیہ : لوگوں سے آتی ہے

مصحفی منزلِ ہستی ہے سرائے فانی
نہیں آیا کوئی یاں پیر و جواں رہنے کو

۳۱۲

کب تک مری آنکھوں سے رواں خونِ جگر ہو
اے نالۂ جاں سوز کہیں تجھ میں اثر ہو

مانندِ صبا، خاک بھی جب ہاتھ نہ آوے
آخر کو ہم اس کوچے[1] سے گئے خاک بسر ہو

تو ذبح تو کرتا ہے مجھے، پر یہی ڈر ہے
یہ دستِ حنائی نہ ترا خون سے تر ہو

فریادی ہوں میں، تم بھی مری داد کو پہنچو
اے نالہ و فریاد و فغاں آج کدھر ہو

یہ حق میں مرے کس نے دعا دی[2] تھی الٰہی
عاشق ہو تو اس کی نہ شبِ ہجر سحر ہو

یاں تک ہوں ترے حسن سے محظوظ کہ من بعد
دیکھوں نہ میں اس کو جو پری پیشِ نظر ہو

لے جائیو میت کو مری پردۂ شب میں
ق ماتم میں مرے تا نہ کسی کی مژہ تر ہو

اے مصحفی یاروں کو یہی کیجیو وصیت[3]
جس وقت ترا عالمِ فانی سے گذر ہو

ہ

۳۱۳

مقدور ہو تو لاگ نہ رکھیے کسو کے ساتھ
جوں شمع عمر کاٹیے، پر آبرو کے ساتھ

جس جس طرف پھرے ہیں آپ مغبچے لیے
مے خوار بھی لگے ہی پھرے ہیں سبو کے ساتھ

تشبیہ جس سے یار کے عارض کو دیجیے
گل کون سا ہے باغ میں اس رنگ و بو کے ساتھ

ہرگز نہ دیکھ رشتہ و سوزن کو خوش ہوا
زخمِ جگر کو لاگ رہی نت رفو کے ساتھ

شاعر جو مو کہیں ہیں یہ ان کا خیال ہے
نسبت تو اس کمر کو نہیں کچھ بھی مو کے ساتھ

---

[1] نسخہ الف: کو میں
[2] نسخہ الف: دعا کی ہے   آصفیہ: دعا کی تھی
[3] الف: نصیحت

بوسہ دیا نہ تم نے میاں، مصحفی کو حیف
آخر وہ اس جہاں سے گیا آرزو کے ساتھ

۳۱۴

روز کی خارا تراشی، سخت مجبوری ہے یہ — عاشقی کا ہے کو ہے فرہاد، مزدوری ہے یہ
بھید کیا پاوے مریضِ عشق کا یارو طبیب — تن کی رنجوری نہیں کچھ، دل کی رنجوری ہے یہ
دے کے دل بوسہ لیا میں نے تو کیا اس کا عجب[1] — جانتے ہو تم کہ اس سودے کی دستوری ہے یہ
شمع پر جلتے ہوئے پروانہ یوں کہنے لگا — وصل کی شب ہے کہ یارب شامِ مہجوری ہے یہ
بات کا میری نہیں یک بار بھی دیتا جواب — آج کل تو اس بت کافر کی مغروری ہے یہ
شب کو جب گھر پر ہمارے ماہ کرتا ہے طلوع — ہم سمجھتے ہیں کہ گویا شمع کافوری ہے یہ

مصحفی کچھ ریختہ ہی میں نہیں استادِ وقت
فارسی میں بھی نظیریؔ نشا پوری ہے یہ

۳۱۵

اس کو پیوند ہوا ہے جگرِ چاک کے ساتھ — اپنی بنبھنے کی نہیں اب دلِ غمناک کے ساتھ
جستجو میں تری پھرتا ہے جدھر وہ دن رات — دل بھی پھرتا ہے مرا گردشِ افلاک کے ساتھ
باغباں کاٹیو مت، موسمِ گل میں اس کو — رگِ جاں کو مری، نسبت ہے رگِ تاک کے ساتھ
اے صبا آپ زمیں پر یہ نہیں رہنے کی — تجھ کو کاوش ہے عبث میری کفِ خاک کے ساتھ
حسنِ پاکیزہ کے طالب وہ رہے جیتے جی — جن کی بھر عمر کٹی یاں نظرِ پاک کے ساتھ
اپنی رفتار پہ نازش ہے بہت فتنے کو — چل سکے گا وہ تری قامتِ چالاک کے ساتھ

مصحفی کیا کوئی محبوب نہ تھا دنیا میں
دوستی تو نے جو کی اس بتِ سفاک[2] کے ساتھ

۳۱۶

مرغانِ باغ کی تو خوش آوازیاں تو دیکھ — کیا گا رہے ہیں، زمزمہ پردازیاں تو دیکھ

---

[1] نسخۂ الف: عجیب اس کا تو کیا
[2] آصفیہ و نسخۂ الف: بے باک

کب سے پتنگ گرتے ہیں شعلے پہ آن آن	اے شمع ٹک انھوں کی تو جاں بازیاں تو دیکھ
کیا کیا سخن فریب کے نکلے ہیں ان سے جان	تو اپنے لعل لب کی فسوں سازیاں تو دیکھ
فرہاد و قیس یوں گئے، میرا سو یہ ہے حال	عشقِ بتاں کی خانہ براندازیاں تو دیکھ
چوسر ہے اک حریف سے، اُٹھ کر کہاں چلا
اے مصحفیؔ مری بھی تو دو بازیاں تو دیکھ

۳۱۷

کچھ زلف ہی الجھتی نہیں ہے صبا کے ساتھ	لڑتی ہیں تیری پلکیں بھی کافر ہوا کے ساتھ
اس آشنا کا دشمن جاں دوست ہو گیا	دیکھا جو میں نے اس کو کسی آشنا کے ساتھ
بر سر اب حنا سے بھی کرنے لگا وہ شوخ	جانا کہ خون دل کو ہے نسبت حنا کے ساتھ
عالم یہ کچھ ہے اپنی دعا کا کہ ان دنوں	فریاد بھی بلند ہے دست دعا کے ساتھ
گو میں بتوں میں عمر کو کاٹا تو کیا ہوا	نسبت مری درست رہی ہے خدا کے ساتھ
رخسار کا تو ذکر ہی کیا، میں ہوں اک شریر	تولوں نہ روئے گل کو تری پشت پا کے ساتھ
اتنا جو جی ہی جی میں مگن ہے تو مصحفیؔ
کیا پھر لڑی ہے آنکھ کسی خوش ادا کے ساتھ

۳۱۸

پہنا ہے یوں وہ تکمۂ گوہر گلے کے ساتھ	گویا کہ ہے بعینہٖ اختر گلے کے ساتھ
نامہ تو باندھتا ہوں پہ ڈرتا ہوں تر کرے[۱]	نامے کو میرے[۲] خوں میں، کبوتر گلے کے ساتھ
جن طائروں کو ہے دم خنجر کی آرزو	کنج قفس میں ملتے ہیں شہپر گلے کے ساتھ
گردن کشی نہ کر کہ ہزاروں کو چرخ نے	ڈبوا دیا ہے باندھ کے پتھر گلے کے ساتھ
پیدا گلو بریدہ ہوئے ہم، مگر ہوئی	ماہی کی طرح خلقت خنجر گلے کے ساتھ
عاشق کے جب گلے کو بنا کر کیا درست	لکھی قضا نے نسبت خنجر گلے کے ساتھ
صندل سے جیسے سانپ لپٹتا ہے اس طرح	لپٹی ہی جا ہے زلف معنبر گلے کے ساتھ

۱؎ نسخہ الف: گر پڑے ۲؎ نسخہ الف: نامے کو

میں ہوں وہ صیدِ حلق بریدہ کہ مصحفی
جس کے لگے نہ خون کا ساغر گلے کے ساتھ

۳۱۹

شبنم ہوئی پانی ترے دنداں کی طرف دیکھ — گل آگ پہ لوٹا، لب خنداں کی طرف دیکھ
درہج[1] سینے کی اپنے ہی تو کیا دیکھے ہے ظالم — میرے بھی ذرا چاک گریباں کی طرف دیکھ
کچھ دل میں اثر کر جو گئی بے کسی ان کی — رویا میں بہت گور غریباں کی طرف دیکھ
ہے دل میں ہمارے جو بھری اس کی محبت — رو دیتے ہیں ہم دور سے درباں کی طرف دیکھ
عاشق کے جگر پر ترے، یوں چلتی ہیں چھریاں — تو اپنی ذرا جنبش مژگاں کی طرف دیکھ
دعویٰ تجھے رونے کا ہے اے ابر بہاری — تو آ کے مرے دیدۂ گریاں کی طرف دیکھ
جب سیر بیاباں کو میں جاتا ہوں تو مجھ کو — آ جاتی ہے وحشت سی، بیاباں کی طرف دیکھ
کیا محو ہے رفتار کا تو آبِ رواں کی
اے مصحفی اُس سرو خراماں کی طرف دیکھ

۳۲۰

کیا سبزہ ہے سیراب، بیاباں کی طرف دیکھ — سبزے کی طرف اور گل و ریحاں[2] کی طرف دیکھ
مغرور نہ ہو چاکِ گریباں پر اپنے — اے گل تو مرے چاکِ گریباں کی طرف دیکھ
اس کشتے پہ ہے جائے ترحّم جو تڑپ کر — رہ جائے ترے خنجر برّاں[3] کی طرف دیکھ
کرتا ہوا پھرتا ہے تو کیا سیر چراغاں — کافر مرے داغوں کے چراغاں کی طرف دیکھ
کیا میری پریشانی میں کرتا ہے تامّل — تو اپنی تو اس زلف پریشاں کی طرف دیکھ
اے وائے کہ رستے ہی میں حیران کھڑا ہے — کبک دری اس سروِ خراماں کی طرف دیکھ
اے مصحفی کیا غم ہے کہ جو یار بھی تیرا
روتا ہے ترے دیدۂ گریاں کی طرف دیکھ

---

[1] آصفیہ: سج　[2] نسخۂ الف: گل ریحاں　[3] نسخۂ الف: خنجر مژگاں

٣٢١

اس اشک کے قطرے کی مرے جلوہ گری دیکھ
صدقے میں ترے، ٹک ادھر اے رشک پری دیکھ

لوٹے ہے سدا خوں میں پڑی رشک کے مارے
گلشن میں رگ گل تری نازک کمری دیکھ

لالہ کے خیاباں میں نہ یوں پاؤں رکھ اپنا
یہ خون شہیداں ہے، نسیم سحری دیکھ

وہ نخل ہوں میں باغ زمانہ میں کہ جس کے
آوے نہ کبھی پاس کوئی بے ثمری دیکھ

صیاد نہ رکھ میرے تئیں کنج قفس میں
میں صید زبوں ہوں، مری بے بال و پری دیکھ

نالے کو مرے طعنہ نہ دے بے[1] اثری کا
اے آہ سحر اپنی بھی ٹک بے اثری دیکھ

جب ناز سے ہوتا ہے تو گلشن میں خراماں
گل کہتے ہیں سارے ادھر اے کبک دری دیکھ

تو ہے وہ گل تازہ گلستان جہاں میں
گل کھائیں ہیں آنکھوں میں جسے حور و پری دیکھ

لکھتا ہے غزل اور بھی اک مصحفی اس وقت
رفتار کو خامے کی ٹک اے کبک دری دیکھ

٣٢٢

راتوں کو ستاروں کی[2] ذرا جلوہ گری دیکھ
کیا چمکے ہیں[3] غافل یہ عقیق جگری دیکھ

جاتا ہے لیے اشک مرا لخت جگر کو
اور مجھ سے یہ کہتا ہے مری نامہ بری دیکھ

غنچے کی گلابی کو کہیں ٹھیس نہ لگ جائے
یوں پاؤں نہ رکھ اپنا، نسیم سحری دیکھ

نازاں ہے تو رفتار پہ کیا اپنی ہی اتنا
رفتار کو اس کی بھی ٹک اے کبک دری دیکھ

آزاد کیا میرے تئیں کنج قفس میں
صیاد نے آخر مری بے بال و پری دیکھ

کیا آئینہ دیکھے ہے، ذرا میری طرف دیکھ
صدقے تری آنکھوں کے میں اے رشک پری دیکھ

ان بزم نشینوں کو نہیں کچھ خبر اپنی
کیا بادہ پلائے ہے ذرا بے خبری دیکھ

ہر اشک کے قطرے سے جدی آنکھ لڑی ہے
اس دیدۂ گریاں کی پریشاں نظری دیکھ

آیا جو جنوں مجھ کو تو میں تجھ سے کہوں گا
اے مصحفی اس وقت مری جامہ دری دیکھ

---

[1] نسخۂ الف: بے ثمری   [2] الف: ستارے کی   [3] الف: کیا جھمکے ہے

۳۲۳

اس نے جو جو کچھ کہا شب ہم کو گھر میں بیٹھ بیٹھ — ہم نے وے باتیں سنیں سب پشت در میں بیٹھ بیٹھ
ہم وہ عاشق ہیں جنھوں نے شاہ راہ شوق پر — عمر کھو دی، انتظارِ نامہ بر میں بیٹھ بیٹھ
جی سے جانا نجد تک اس کو جو مشکل ہو گیا — ناقۂ لیلیٰ گیا اتنے سفر میں بیٹھ بیٹھ
وے بھی کیا دن تھے کہ جب جا بجا تھیں وہ زلفیں الجھ — ان کو سلجھاتے تھے ہم دو دو پہر میں بیٹھ بیٹھ
شہر کے جتنے تھے کوچے رشکِ گلشن ہو گئے — بس کہ میں رویا لہو ہر رہ گذر میں بیٹھ بیٹھ
بزم سے اٹھتا ہوں تو کہتی ہیں تاکیداً مجھے — یار کی آنکھیں ہر انداز نظر میں بیٹھ بیٹھ
کر کے یاد انداز اٹھنے بیٹھنے کا یار کے — شعلہ اٹھ اٹھ کر، گیا میرے جگر میں بیٹھ بیٹھ
اُس نے دکھلایا ہمیں اپنے تئیں سو سو طرح — گاہ غُرفے میں کھڑے ہو، گاہ در میں بیٹھ بیٹھ

لطف کیا ملنے کا اب، اُس نے تو اپنی مصحفی
قدر کھو دی صحبتِ ہر بے ہُنر میں بیٹھ بیٹھ

۳۲۴

پیچ پگڑی کا کھل رہا ہے کچھ — اُس کی اس دم عجب اَدا ہے کچھ
دل مرا "زُلف زلف" کہتا ہے — اِس کو سودا سا ہو گیا ہے کچھ
ان کی فہمید کا ہوں دیوانہ — یار کچھ سمجھے ماجرا ہے کچھ
تیر مجھ پر لگا کے یوں بولا — اپنا انداز ہی جدا ہے کچھ
سرو کب قد کو تیرے پہنچے ہے — گو کہ قد سے ترے بڑا ہے کچھ
ادھر آؤ تو مہربان کہیں — آپ سے ہم کو بھی گلہ ہے کچھ
جب سے قاصد گیا ہے اس کی طرف — جی ادھر ہی کو لگ رہا ہے کچھ

مصحفی یار کچھ سمجھتے ہیں
عشق سے اپنا مدعا ہے کچھ

۳۲۵

دل ہے پہلو میں کہ اک دشمنِ جاں کاہ ہے یہ — جس طرف جاؤں میں اُٹھ کر، مرے ہمراہ ہے یہ

کہو[1] لے جاکے کوئی مجھ کو بتاں کے آگے — اس پہ[2] تم رحم کرو، بندۂ اللہ ہے یہ
چاہ میں اس کی جو جی اپنا چلا جاتا ہے — میں بھی حیران ہوں اس میں کہ عجب چاہ ہے یہ
کسی حالت میں نہ ہو یاد خدا سے غافل — اپنے نزدیک نشانِ دلِ آگاہ ہے یہ
نہ فقط دل ہی مرا آہ نے میری پھونکا — گھر کو کتنوں کے جلاوے گی اگر آہ ہے یہ
شیخ کعبے کو تو جا، جاؤں میں بت خانے کو — کہ تری راہ ہے وہ اور مری راہ ہے یہ
خانہ جنگی کا ارادہ ہے اگر تم کو میاں — آ ڈلے تیغ و سپر، بندۂ درگاہ ہے یہ
گھر سے آوے نے نکل اے ماہ جو وہ زہرہ جبیں — تو ابھی تجھ کو دکھا دوں کہ مرا ماہ ہے یہ

مصحفی دل کے کہے میں تو نہ چلنا بے ہوش
تجھ کو سو بار کہا میں، ترا بدخواہ ہے یہ

۳۲۶

دل کو ہے ربط اس ابروئے خمدار کے ساتھ — جوں سپاہی کے تئیں عشق ہو تلوار کے ساتھ
کبک نے بھی جو کیا ناز بہ رفتار تو کیا — اس کو نسبت ہے کب اس شوخ کی رفتار کے ساتھ
خیر خواہوں میں تم اپنے ہمیں کب گنتے ہو — گرم جوشی ہے سدا آپ کو اغیار کے ساتھ
شکوہ تیرا نہیں کرتا میں کسی کے آگے — گفتگو ہے مجھے اپنے ہی دل زار کے ساتھ
مرگیا آتے ہی گل صحنِ چمن میں بلبل — عیش کرنا نہ لکھا تھا گل و گلزار کے ساتھ
گو بہار آتی ہے گلشن میں ولے تو صیاد — گل کا مذکور نہ کر مرغ گرفتار کے ساتھ
آرزو میں تری، اے زہرہ جبیں یاروں کی — آنکھیں رہتی ہیں لگی رخنۂ دیوار کے ساتھ
کیا خبر ہے تجھے بے درد کہ کیا کرتی ہے — تیرے مژگاں کی انی اس دل افگار کے ساتھ

مصحفی ابر بہاری کو ہوا ہے سودا
شرط بدتا ہے مرے دیدۂ خوں بار کے ساتھ

۳۲۷

ہے مزا سیر چمن کا تو فقط یار کے ساتھ — پھر تو کیا لطف ہے آیا جو وہ دو چار کے ساتھ

---

[1] نسخہ الف: کہے، آصفیہ: کہیئے   [2] نسخہ الف: ٹک

قصۂ کوتہئ عمر جو چھیڑا اس نے
شمع بھی روئی سحر تک ترے بیمار کے ساتھ[۱]

سانس بھی کشتہ ترا ہائے نہ لینے پایا
ہوگئی جان ہوا ایک ہی تلوار کے ساتھ

ہے یقیں مجھ کو کہ اے سرو خراماں میرے
جان جاوے گی کسی دن تیری رفتار کے ساتھ

کوچہ یار میں رہنے سے نہیں اور حصول
عشق ہے مجھ کو اک اس کے در و دیوار کے ساتھ

دوستاں بہر خدا شور پہ لاؤ نہ مجھے
گل کی باتیں نہ کرو اس جگر افگار کے ساتھ

اس کے کوچے کی طرف دیدہ ہوئے رہبر دل
جیسے دلّال ہو سودے میں خریدار کے ساتھ

آئینے کا ہے یہ منھ تیرے مقابل ہووے
ہم سری کر نہ سکا مہ ترے رخسار کے ساتھ

مصحفی مصر محبّت کی کروں کیا تعریف
کون سا شہر ہے اس گرمئ بازار کے ساتھ

۳۲۸

تو مری تربت پہ آیا واہ واہ
خاک میں مجھ کو ملایا واہ واہ

ہے گریباں چاک اور آنکھوں میں اشک
عشق نے یہ دن دکھایا واہ واہ

ہم رہے بیرونِ در اور غیر کو
تو نے خلوت میں بلایا واہ واہ

آخر آخر تو نے اے چرخ کہن
بے گنہ مجھ کو ستایا واہ واہ

مصحفی آیا تھا کل وہ میرے گھر
خوب میں نے بھی رِجھایا واہ واہ

۳۲۹

صحبت ہے ترے خیال کے ساتھ
ہے ہجر کی شب وصال کے ساتھ

اے سرو رواں ٹک اک ادھر دیکھ
جی جاتے ہیں تیری چال کے ساتھ

ہے تیغ و کماں کی سی نسبت
ابرو کو ترے، ہلال کے ساتھ

مت زلف کو شانہ کر، مرا جی
وابستہ ہے بال بال کے ساتھ

دل اپنا ہنوز سادگی سے
پیچیدہ ہے زلف و خال کے ساتھ

---

[۱] نسخۂ الف: یہ شعر ندارد، آصفیہ سے اضافہ

مہمان تھا کس کا تو شب[1] اے ماہ   ق   آتا ہے جو اس ملال کے ساتھ
رخساروں نے کچھ عرق کیا ہے   کچھ چشم ہے انفعال کے ساتھ
میں شیر ہوں بیشۂ سخن کا   صحبت ہے سگ و شغال کے ساتھ

اکسیر ہے مصحفؔی کا ملنا
یعنی کہ وہ ہے کمال کے ساتھ

۳۳۰

عشق کیا، اک ذلّت و خواری ہے یہ   جاننا کیا ہے، گرفتاری ہے یہ
مجھ سے آنکھ اس شوخ کی ملتی نہیں   یا الٰہی کیسی بے زاری ہے یہ
کیا کروں اس چشم گریاں کا علاج   اب تو کچھ ناسور سی جاری ہے یہ
ایک تو جاتا رہا ہے دل مرا   تس پہ غم خواروں کی غم خواری ہے یہ
لے گیا کاجل چرا دزدِ حنا   آپ کی آنکھوں کی بیداری ہے یہ
جان رک رک کر ہی ہوتی ہے خفا   جی چکے بس ہم جو ناداری ہے یہ

بے زری کہتے ہیں جس کو مصحفؔی
کوئی بیماری سی بیماری ہے یہ

۳۳۱

ہر روز رہا مجھ سے شب تار کا وعدہ[2]   پر ایک بھی سچا نہ ہوا یار کا وعدہ
درباں کی یہ قدغن ہے[3] تو کس طرح نبھے گا   یہ در کا اشارا، پس دیوار کا وعدہ
دل لے گیا، بوسے کو کہا کل تجھے دوں گا   سودے میں ہو جس طرح خریدار کا وعدہ
مر جائے جو رفتار تری دیکھ کے اس سے   پھر روز قیامت پہ ہے رفتار کا وعدہ
حال اس کا زبوں دیکھ کے اپنی یہ دعا ہے   آجائے شتابی ترے بیمار کا وعدہ
چلتا نہیں مجھ ساتھ وہ بازار تلک بھی   ہے غیر سے سیر گل و گلزار کا وعدہ

---

[1] آصفیہ: شب تو
[2] تمام خطی نسخوں میں یہ غزل ردیف الف میں درج ہے، ہم نے اسے ردیف الہا میں منتقل کر دیا ہے۔
[3] نسخۂ الف: تو پھر کیوں کے نہ بہکی

پھڑکے ہے وہ بے طرح سے کچھ کنج قفس میں　　آیا ہے مگر مرغ گرفتار کا وعدہ
میں دل زدہ مقتل کی طرف کیوں کے نہ جاؤں　　گردن سے مری ہے کسی تلوار کا وعدہ
آنے دو اسے چلتے ہو گر سیر چمن کو
تھا ہم سے میاں مصحفی زار کا وعدہ

ی

۳۳۲

اس پردگی سے کیوں کے وہ آنکھیں لڑا سکے　　جو پردۂ مجاز[1] سے باہر نہ آ سکے[2]
واں باریابِ جلوہ اُسی کی نگاہ ہو　　آنکھوں سے اپنی جو کوئی پردہ اُٹھا سکے
آئینہ محیطِ جہاں اس قدر نہیں　　اس آئینے میں حُسن ترا کیا سما سکے
حرزِ بدن ہو جس کا ترا حفظ معنوی　　آتش جلائے اس کو نہ پانی بہا سکے
تکلیفِ بار[3] عشق اگر دیجیے عرش کو　　واللہ وہ بھی تاب تحمّل نہ لا سکے
یاں ذرے ذرے میں ہے وہ خورشید جلوہ گر　　بینائی یہ کہاں جو کوئی اس کو پا سکے
حیراں ہے عقل اپنی طلسم فلک کے بیچ　　ایسا طلسم اور تو کوئی بنا سکے[4]
بازار مصر میں جو زلیخا صفت کوئی　ق　سر بیچ کر نہ اپنا اگر جی چلا سکے
اتنا تو چاہیے کہ طرح پیرزال کی　　اک ریسماں تو قیمت یوسف میں لا سکے
تو عاشقی کا نام عبث لے ہے مصحفی
عاشق تو وہ جو جان کو اپنی کھپا سکے

۳۳۳

مستی کو مل کے غیر کے گھر آپ کل گئے　　ہم روسیاہ آ کفِ افسوس مل گئے
اس فتنۂ زماں کے مقابل جو شور حشر　　آیا تو آہ اس کے وہیں پانو جل گئے

---

[1] نسخۂ الف و آصفیہ: نازِ عشق　[2] نسخۂ الف: باہر نہ جا سکے　[3] نیز نجار بمعنی قنات
[4] نسخۂ الف: اور تو کوئی اس کو پا سکے

یارب وہ گل کہاں ہیں[1] جو فصل بہار میں
صحرا کو جیب پھاڑ[2] کے اپنی نکل گئے

پھسلے تھے بزم بادہ میں آتے ہی شیخ جی
بارے ہوئی یہ خیر کہ گر کر سنبھل گئے

کیا خو بری پڑی ہے یہ طفلانِ اشک کی
دیکھا جب اچھی چیز کو، اس پر مچل گئے

پھینکے جو شب میں شمع پہ اک مشت برگ گل
گرتے ہی اس پہ جوں پر پروانہ جل گئے

کیوں کر لکھوں نہ ان کو کہ بے خواست مصحفیؔ
پھر اس زمیں میں مجھ سے کئی شعر ڈھل گئے

۳۳۴

نالے سے میرے کوہ و بیاباں دہل گئے
وحشی گھروں کو چھوڑ کے اپنے نکل گئے

لڑکے جواں ہوئے، تو جواں پیر ہو چلے
کیا دیکھتا ہے یاں کے تو نقشے بدل گئے

گل گیر نے جو بوسہ لیا روئے شمع کا
پروانے رات آتش غیرت سے جل گئے

کچھ بات درمیاں میں جو رنجش کی آ گئی
یک بار ڈھب پہ چڑھ کے مرے وہ نکل گئے

اے سرو خوش خرام کوئی یہ بھی چال ہے
پاؤں تلے ترے دل عشاق مل گئے

دل جا چکا ہے کب کا، یہ ہوش و حواس ہیں
سن لیجیو تم کہ یہ بھی میاں آج کل گئے

بستر سے غم کے پھر نہ اٹھا گر کے مصحفیؔ
بیمار اس طرح کے سنے ہیں سنبھل گئے

۳۳۵

لیلیٰ کا محمل اس کے محافے سے دور ہے
یہ بات تو کچھ اپنے قیافے سے دور ہے

اوروں کے خط تو لکھتے ہی سرنامہ ہو گئے
میرا ہی خط ہے وہ جو لفافے سے دور ہے

نافے سے مشک زلف کو نسبت نہ دیجیے
نافے کی کیا ہے قدر، وہ نافے سے دور ہے

میں ملتجی ہوں اک قدح بنگ کے لیے
ساقی کا ہاتھ اب تئیں صافے سے دور ہے

ان قافیوں میں تو نے، صد احسنت مصحفیؔ
ایسی غزل کہی کہ قیافے سے دور ہے

---

۱ الف: ہے
۲ پھاڑ کر

۳۳۶

لے گئے دل کو مرے چھین کے بالے والے
کر گئے مجھ پہ ستم شالے دوشالے والے

ساتھ معشوقوں کے یوں نالہ کشاں ہیں عشاق
جوں سواری میں کہیں چلتے ہیں بھالے والے

بزم میں ہوں گرم وہ خورشید کے، سو حلقۂ نور
ہال کیا اُن کو سمجھتے ہیں دو نالے والے

جس محلّے میں بسا جا کے تو اے خانہ خراب
اپنے گھر بیچ کے ڈھائیں گے قبالے[1] والے

مصحفیؔ میں یہ رسالہ جو کیا ہے موزوں
اس کو سمجھیں گے محبّت کے رسالے والے

۳۳۷

کیا غم ہے گر سحر وہ گئی چشم تر لیے
شبنم نے گل کے ساتھ تو شب عیش کر لیے

اس ماہ خانگی کے تجسّس[2] میں روز و شب
شوقِ نظارہ مجھ کو پھرا دربدر لیے

ہووے قبول چشم یہ تحفہ تو ہر گھڑی
پلکوں تک آنسو آتے ہیں لختِ جگر لیے

مر جاؤں میں قفس میں تو صیاد میرے بعد
پھر لو تو گلستاں میں مرے مُشتِ پر لیے

یہ اشک و لختِ دل نہیں، پھرتے ہیں اہلِ درد
بازارِ روزگار میں لعل و گہر لیے

اس تیغ زن کو اپنی تجسّس ہے تو یہاں
مدّت سے ہم بھی ہاتھ پہ پھرتے ہیں سر لیے

شہرِ عدم کو ہم تو چلے یاں سے مصحفیؔ
تم اب خوشی سے بیٹھے رہو اپنا گھر لیے

۳۳۸

با گیسوے آشفتہ جو تو باغ میں جاوے
سنبل ترے بالوں کے تئیں دیکھنے آوے

ہر چند کہ رکھتا ہے فلک پنجۂ خورشید
طاقت ہے کہ دامن کو ترے ہاتھ لگاوے

اپنی یہ دعا ہے رخ آرام نہ دیکھے
جو ہم کو شرارت سے رخ اپنا نہ دکھاوے

ہوں پیرِ جگر سوختگاں، چاہیئے آگر
پروانہ چراغی مری تربت پہ چڑھاوے

---

[1] آصفیہ: بیچ گئے دل کے الخ
[2] الف: تصوّر میں

ختم اس ہی پہ ہے مرتبہ تسلیم و رضا کا — جو تیغ تلے بیٹھ کے پھر سر نہ ہلاوے
کچھ کم بھی نہیں نفت سے یارو مرے آنسو — چاہے تو سمندر میں ابھی آگ لگاوے
اے مصحفی اُس نے تو کیا یار کوئی اور
کر جان مری تو بھی جو کچھ تجھ سے بن آوے

۳۳۹

بس کہ تھی حسن میں یوسف سے سوائی مہنگی — مصر میں جا تری تصویر بکائی مہنگی
کل گیا تھا میں ذرا حسن کے بازار تلک — چیز واں جو نظر آئی، نظر آئی مہنگی
آنکھیں ریتی سی نہ ٹپکیں جو ترے عاشق[1] کو — جامۂ سرخ کی ہو جائے رنگائی مہنگی
تو بھی بینا ہے جو سمجھے تو یہ سوداگر چک — اک نگہ پر نہیں سرمے کی سلائی مہنگی
قیمتِ مے جو میں پوچھی تو مرے ساقی نے[2] — جان کر اپنا خریدار بتائی مہنگی
اب کی برسات میں مے خانے ہوئے بس کہ خراب — مے کشی بستی میں پائی تو وہ پائی مہنگی
دل خریدار کا پھسلا ہی کیا اس پہ مدام — ہے جو ان آئینہ رویوں کی صفائی مہنگی

ق
قیمت سہل پہ ہاتھ آوے ہے کب اس کا ہاتھ — ان دنوں ہے وہ سرِ انگشت[3] حنائی مہنگی
سیر بازار نظر کو میں گیا تھا کہ وہاں — صورت اک چہرے کی نظروں، سو وہ پائی مہنگی
دل عوض اُس کے میں دیتا تھا ولیکن دل نے — جان بھی دیتے ہیں یہ کہہ کے چکائی مہنگی

کچھ گنہ چشم کا ہے اس میں نہ میری تقصیر — مجھ کو دلّال نے یہ جنس دلائی مہنگی

۳۴۰

سرخ ہیں مے سے وہ چشم نیم خواب نرگسی — یا یہ باغ حسن میں پھولا گلاب نرگسی
آنکھیں خوباں جہاں نے جب سے سیں رخ پر ترے — دیکھنے میں اپنے آیا آفتاب نرگسی
گر تو جا بیٹھے لب دریا پہ تیری دید کو — چشم ہو دریا سے سر کھینچے حباب نرگسی
روزن اُس جالی کے جو ہیں یک قلم نرگس کی شکل — حسن کی خاطر بنے ہیں وہ نقاب نرگسی

---

[1] نسخۂ الف : عاشق کے
[2] آصفیہ : مجھے ساقی نے
[3] یہ تین شعر نسخۂ رامپور (ن ۲) میں ندارد

معنوی نسبت ہے اس کی چشم و ابرو کو بہم
جز ہلالی کون دیوے یاں جواب نرگسی

ساقیٔ اُن آنکھوں کا جو ہو مست تو اس کے تئیں
ساتھ دو فنجاں کے دینا دو کباب نرگسی

مصحفیؔ گذرا تھا اک دن اس کے تئیں آنکھوں کا خیال
آئینے میں دل کے اب تک ہے حباب نرگسی

۳۴۱

جور فراق اور ستم آسماں بھی ہے
اس عشق میں نہیب دلِ نیم جاں بھی ہے

بے تلخیٔ خمار نہیں یہ شرابِ وصل
چاہت کے ساتھ کشمکش امتحاں بھی ہے

اس ماہ رو کی آج جو میں جستجو کروں
اس کام میں شریک مرا آسماں بھی ہے

بے صرفہ کیجیے نہ دلا، گفتگوے عشق[1]
کہتے ہیں ایسی باتوں میں جی کا زیاں بھی ہے

دیکھوں ہوں میں قفس میں جو مرغ اسیر کو
اتنا کہوں ہوں: "کچھ خبرِ آشیاں بھی ہے"

اکسیر پر رکھے تھی شرف جن کی خاکِ پا
دیکھو تو خاک پر کہیں اُن کا نشاں بھی ہے

شمشاد کو یہ کہہ کہ، ذرا دھج بدل کے آئے
قمری، چمن میں آج وہ سرو رواں بھی ہے

اے گل کنارہ کر تو کہ بلبل کی گھات میں
صیاد ہے ادھر تو ادھر باغباں بھی ہے

بیٹھا ہے شمع رو تری بالیں پہ مصحفیؔ
کم بخت کچھ تو کہہ ترے منھ میں زباں بھی ہے

۳۴۲

عجب پاکیزہ صورت اس بت کافر ادا کی ہے
غرض میں اور کچھ تو کیا کہوں، قدرت خدا کی ہے

نہ برگ لالہ اس کو لگ سکے نے برگ کاہی ہی
کف پا سے بھی افزوں کچھ نزاکت پشت پا کی ہے

درخت اس باغ کے سب جھومتے ہیں جیسے متوالے
نشہ ہے لالہ و گل تک یہ کیفیت ہوا کی ہے

نہ لگنے دیں کبھی شبنم کو ہرگز کان سے گل کے
ولیکن کیا کریں خاطر ہمیں بادِ صبا کی ہے

ہوئے ہیں خوں کئی کوچے میں اس قاتل کے ہاتھوں سے
گناہ اس کا ہے کیا اس میں یہ رنگینی حنا کی ہے

مرا اور اس کا خلطہ آج کل کا کچھ نہیں یارو
یہ الفت دوستی جو کچھ کہ ہے سب ابتدا کی ہے

---

[1] آصفیہ: گفتگوے عیش

تمھاری ایک میں کہتا نہیں، ورنہ جدھر دیکھو ۔۔۔ زمانے میں تو اب تک رسم یہ مہر و وفا کی ہے
سزاوار تغافل کون سے دن تھا میں سودائی ۔۔۔ ان آنکھوں کی نہیں تقصیر یہ شوخی حیا کی ہے
خیال اس مانگ کا یہ ہے تو کب جینا ہوا میرا ۔۔۔ ہے آدھی رات اور سر پر مرے آفت بلا کی ہے

نہ نام عشق لے اے مصحفی میں تجھ سے کہتا ہوں
کہ ان باتوں میں اے کم بخت تیری ہی بلا کی ہے

۳۴۳

سر ہر خار سے دامن کو جھٹکتے آئے ۔۔۔ ہم تو اس دشت میں سو جاگہ[۱] اٹکتے آئے
نہ ملا ہم سے دل گم شدہ ہر چند کہ ہم ۔۔۔ وادیٔ عشق میں ہر گام بھٹکتے آئے
کتنے پیچھے رہے، محمل کے جرس کے مانند ۔۔۔ کتنے دل ساتھ ہی محمل کے لٹکتے آئے
کون کہتا ہے گئے شاد گلی سے تیری ۔۔۔ ہم تو ہر گام پہ واں سر کو ٹپکتے آئے

نہ ملی کوے بتاں کی کوئی اک سیدھی راہ
مصحفی یاں جو ہم آئے تو بھٹکتے آئے

۳۴۴

کب اس طرف وہ بت کج کلاہ آتا ہے ۔۔۔ گدا کے گھر میں کہیں بادشاہ آتا ہے
دو چند ہوتی ہے پھر چاندنی شب مہ میں ۔۔۔ جو بے نقاب ہو وہ رشک ماہ آتا ہے
اُچھل پڑیں ہیں وُوہیں ساکنانِ وادیٔ عشق ۔۔۔ جب اس طرف کوئی گم کردہ راہ آتا ہے
سُنا ہے میں نے کہ پھر آج کل گلی میں تری ۔۔۔ بہ زیر تیغ کوئی بے گناہ آتا ہے
کٹے گی کیوں کے شب اس کی مریض غم کو ترے ۔۔۔ نہ نالہ آتا ہے اور نے کراہ آتا ہے
مرے بھی دیدۂ خوں بار کیا برستے ہیں ۔۔۔ مقابل ان کے جب ابر سیاہ آتا ہے
وہ آوے، اُس کا تو مذکور کیا ہے، ہاں مجھ تک ۔۔۔ خیال اُس کا مگر گاہ گاہ آتا ہے

مری تو آنکھیں بھر آتی ہیں مصحفی کو دیکھ
جب اُس گلی سے بہ حالِ تباہ آتا ہے

---

[۱] آصفیہ: سو جا پہ

۳۴۵

نہیں بندگی میں تو کچھ راہ اس کی　　نکلتی نہیں دل سے کیوں چاہ اس کی
بھلا بام پر چڑھ تو آیا تو لیکن　　ہوئی رو کشی تجھ سے اے ماہ اس کی
دل اپنا میں کیوں دوں ترے غم کے ہاتھوں　　نہ ہو اس کو خواہش ہی ہر گاہ اس کی
گدا کو کرے شاہ، چاہے تو پل میں　　عجب لا اُبالی ہے درگاہ اس کی
رہے آرسی سامنے ہی نظر کے　　میں صورت بھی دیکھوں نہ اے آہ اس کی
کہو ہو جو تم مصحفی سے تو ٹل جا　ق　اطاعت کروں گا میں اے واہ اس کی

وہ اتنا برا ہے کہ ہر دو جہاں میں
نہ دکھلاوے صورت بھی اللہ اس کی

۳۴۶

میر کیا چیز ہے، سودا کیا ہے　　مجھ کو اِن لوگوں کی پروا کیا ہے
یہ اگر عرصے میں آئے زیں پیش　　دیکھ تو میرا بھی شہرا کیا ہے
اے صبا شمعِ سحر کو نہ ستا　　اب بجھی جائے ہے عرصہ کیا ہے
گر کیا قتل کسی کو تو کیا　　چلو اس بات کا چرچا کیا ہے
ایک دن اس کے میں در تک جو گیا　ق　یہ سمجھ، دیکھوں تو ہوتا کیا ہے
تھے کئی شخص بہم حرف زناں　　میں کہا اُن سے، یہ غوغا کیا ہے
سن کے واں سے جو نکل آیا ایک　　وہ مجھے دیکھ کے کہتا کیا ہے
آپ جو دیر سے اس جا ہیں کھڑے　　یہ کہیں آپ نے بیچا کیا ہے

مل گئے خاک میں ہم اب تو کہہ
مصحفی تیری تمنا کیا ہے

۳۴۷

گر ابر گھرا ہوا کھڑا ہے　　آنسو بھی تُلا ہوا کھڑا ہے

حیران ہے کس کا جو سمندر — مدّت سے رکا ہوا کھڑا ہے
ہے موسمِ گل، چمن میں ہر نخل — پھولوں سے لدا ہوا کھڑا ہے
شمشاد برابر اس کے قد کے — دہشت سے بچا ہوا کھڑا ہے
ہے چاک کسی کا جیب و داماں — کوئی خستہ لٹا ہوا کھڑا ہے
تو آکے تو دیکھ، در پہ تیرے — کیا سانگ بنا ہوا کھڑا ہے
خلوت ہو کبھو تو یوں کہے وہ — ق کوئی در سے لگا ہوا کھڑا ہے
میں: "خیر ہے" گر کہوں تو بولے: — "وہ دیکھ چھپا ہوا کھڑا ہے!"
خونیں کفنِ شہیدِ اُلفت — دولھا سا بنا ہوا کھڑا ہے[1]
تیرا ہی ہے انتظار اس کو — ناقہ تو کسا ہوا کھڑا ہے

اے جان نکل کہ مصحفی کا
اسباب لدا ہوا کھڑا ہے

۳۴۸

مُنہ خنجرِ قاتل پہ رکھوں، بے ادبی ہے — ہر چند کہ پانی کی مجھے تشنہ لبی ہے
شیریں تو ذرا جانب فرہاد گذر کر — کہتے ہیں کہ پتھر تلے واں لوتھ دبی ہے
جس روز سے دیکھا ہے تری مانگ کا جلوہ — اس روز سے عاشق کی دعا نیم شبی ہے
پہنچا نہ فلک رتبۂ انساں کو کہ اب تک — اس دودۂ آدم کی شرافت نسبی ہے
نکلے ہے میری خاک سے نت دستِ تمنّا — یاں خاک ہوئے پر بھی یہ ساغر طلبی ہے
عالم نہیں[2] جاتا ہے ہنوز، اُس کی صفا — آئینۂ دل یا کہ یہ شیشہ حلبی ہے

اے مصحفی جس دم کہ پیا بھنگ کا پیالہ
پھر کام میں اپنے وہ شرابِ عنبی ہے

۳۴۹

گو کہ مخلِّ ہمدمی چرخِ جفا طراز ہے — ہم کو تو اب تلک وہی بندگی و نیاز ہے

---

[1] نسخۂ الف و آصفیہ : یہ شعر ندارد — [2] نسخۂ الف : جاتا ہوا

کیوں کہ شب فراق سے ہووے گی میری جاں بری — داغ یہ سینہ سوز ہے، درد یہ جاں گداز ہے
بے خود و مست کون ہے ہوش و تمیز ہے کسے — بزم شراب ہے یہاں کس کو یہ امتیاز ہے
وقتِ تکلّم اُس کا منھ دیکھ رہوں نہ کیا کروں — حرف ہے سو وہ ہے ادا، بات ہے سو وہ ناز ہے
آوے شبِ وصال اگر بعد ہزار جستجو — تو بھی نہ لب کو وا کرے تو وہ بہانہ ساز ہے
سمجھے تھے ہم کو جائے گی، جیسے گیا ہے روزِ وصل — کب ہمیں اس کی تھی خبر ہجر کی شب دراز ہے
دامن اٹھا کے چلتے ہو میرے مزار پر عبث — خاک میں تو میں مل گیا، کس سے اب احتراز ہے
صدقے گیا تھا، جان و دل ہم کو ہے تجھ سے کیا عزیز — جان بھی تیری نذر ہے دل بھی تری نیاز ہے

دورِ فلک نے مصحفی ہم پہ کیا ہے عرصہ تنگ
سجدہ کہاں کرے کوئی جا ہے نہ جا نماز ہے

۳۵۰

موسم گل ہے باغباں باغ کا در کھول دے — یا نہیں صیاد سے کہہ مرے پر کھول دے
کون کہے ہے کہ کر غرفہ مرے منھ پہ وا — جالی سے لے ہاتھ اُٹھا، راہِ نظر کھول دے
خندہ لب سے ترے لے جو اجازت، وہیں — غنچۂ تصویر کو، بادِ سحر کھول دے
اس کی درازی ذرا، میں بھی تو دیکھوں بھلا، — زلفِ مسلسل صنم، تا بہ کمر کھول دے
ہوں میں دعائے سحر، ہے مری حسرت ضرور — منھ پہ مرے اے فلک، بابِ اثر کھول دے
غمزۂ رہزن ترا کہتا ہے سورج سے یوں — خیر جو چاہے ہے تو، تیغ و سپر کھول دے
ہم پہ تو کھلتا نہیں، بھید دہن کا ترے — ہے یہ معمّا اسے، تو ہی مگر کھول دے
گر نہ اتارے مجھے گھر میں تو اپنے صنم — رہنے کو میرے لیے اور ہی گھر کھول دے

آج تو کچھ مصحفی غش میں ہے کب کا پڑا
بچنے کی امید ہو، آنکھیں اگر کھول دے

۳۵۱

آب ہو حسرت دل آہ بہی جاتی ہے — آرزو دل کی مرے دل میں رہی جاتی ہے
ہم نشیں گو کہ انھیں لاکھ طرح سمجھا دیں — کم نگاہوں کی کوئی کم نگہی جاتی ہے

مجھ کو حیرت ہے کہ جب خاک میں ملتے ہیں یہ لوگ کیوں کے ان سے ہوسِ تختِ شہی جاتی ہے
ہم تری بزم میں رہنے کے نہیں ہو کے ذلیل ہم سے [۱]ہر اک کی کوئی بات سہی جاتی ہے
گو طپانچے [۲]بھی لگاوے تجھے یہ بادِ صبا شاخِ گل! تیری کوئی کج کلہی جاتی ہے
سجدہ کرنے سے صفا وہ نہیں حاصل تو نہ ہو کچھ تو مانندِ نگیں رُو سیہی جاتی ہے
مصحفی فکرِ سخن ایسا کچھ آسان نہیں
جو غزل ہے سو وہ دِقّت سے کہی جاتی ہے

۳۵۲

پانوں کا رنگ لب سے ترے آشکار ہے اس رنگ آتشیں پہ قیامت بہار ہے
ہاں اے فلک خدا سے تو ڈر تو ستم نہ کر گردن مری بہ تیغِ تغافل دوچار ہے
حیراں ہوں اس قدر کہ شبِ وصل بھی مجھے تو سامنے ہے اور ترا انتظار ہے
تم اور ہو گئے ہو میاں ورنہ اب تلک دیکھو جو غور سے وہی لیل و نہار ہے
حیراں کھڑا رہے ہے اُسے ہو گیا ہے کیا آئینہ کس کے حسن کا آئینہ دار ہے
لالے کا پھول دیکھ کے کہنے لگا وہ شوخ: شاید کسی کا یہ جگرِ داغ دار ہے
بلبل کہے ہے گُل سے کہ اے گُل ذرا تو ٹھہر جلدی یہ تیری اپنا تو جی بھی نثار ہے
ہوتا ہے بادِ صبح کا تیار قافلہ ہم بھی تو چلنے والے ہیں کیا اضطرار ہے
تو سادگی تو دیکھ، کہ تربت پہ میری آ
پوچھے ہے مصحفی سے یہ کس کا مزار ہے

۳۵۳

شب نالہ ہائے گرم جو سوئے فلک چلے یک بار میری چشم سے آنسو ڈھلک چلے
وقفہ ہو اس قدر کہ رخِ مرگ دیکھ لوں آخر تو [۳]تم دکھا کے مجھے اک جھلک چلے
بارش ہوئی وہ دیدۂ گریاں کی اب کی سال چشموں کا ذکر کیا ہے کہ دریا چھلک چلے
وہ حور چہرہ سیرِ چمن کو ہو گر سوار باندھے پرا، رکاب میں حور و ملک چلے

---

۱ نسخہ الف: ہم نشیں ۲ الف: طپانچے ہی ۳ نسخہ الف: آخر تو وہ

عزم سفر ہے ہم کو بھی مدت سے مصحفیؔ
پر دیکھیے[۱] کہ قافلہ یہ کب تلک چلے

۳۵۴

زلف مشکیں ہو جہاں سنبل کی بو کیا چیز ہے — گل کو کہتا ہے ترا عارض کہ تو کیا چیز ہے
ہم وہ وارفتہ ہیں یارب جو سمجھتے ہی نہیں — شوق کہتے ہیں کسے اور جستجو کیا چیز ہے
تیغ کو لا، جی کی حسرت دے مرے جی سے نکال — پوچھ لیجیو اس گھڑی پھر، آرزو کیا چیز ہے
اور کیا تعریف کیجیے اس بت یک چشم کی — آگے یک چشمی کے تصویر دو رو کیا چیز ہے
جان تک ہوتا ہے پاسِ آبرو دانا کے تئیں[۲] — جان پر جب آبنے تو آبرو کیا چیز ہے
آنکھ کے کھلتے ہی دیکھا اس نے روے تیغ و تیر[۳] — زخم دل کیا جانتا ہے یہ، رفو کیا چیز ہے
اس کے جھنجھلانے میں نکلیں ہیں ہزاروں لطف ہائے
مصحفیؔ میں کیا کہوں، وہ تُند خو کیا چیز ہے

۳۵۵

نے تیر نہ تلوار، نہ خنجر نہ چھُرا ہے — اک جنبش مژگاں ہی میں یاں کام ادا ہے
سجدہ طرفِ کعبہ کروں، یا طرفِ دل — کعبے میں جو قبلہ ہے تو دل قبلہ نما ہے
کیا تجھ کو خوش آیا[۴] ہے قفس، مرغ قفس کو — اب گُل کی طرف سے یہی پیغام صبا ہے
رنگینیٔ دست اس کی جو مہندی میں ملی ہے — ہوتا نہیں معلوم یہ خوں ہے کہ حنا ہے
جز نالہ و فریاد و فغاں کوے بتاں میں — کوئی اور ہی اس درد محبّت کی دوا ہے
اک یار بھی آیا نہ ادھر ملک عدم کا — کیا قافلہ رستے میں کہیں بیٹھ رہا ہے
اس دل پہ چھڑک لاکے گلاب اپنے ہی ہاتھوں — یہ دیکھ کے صورت تری بے ہوش ہوا ہے
اے مصحفیؔ اک اور بھی لکھ ریختہ، یعنی
تو شاعرِ غرّا ہے تری فکر رسا ہے

---

[۱] آصفیہ : پر دیکھیں ہم
[۲] آصفیہ : انساں کے تئیں
[۳] الف : تیغ تیز
[۴] آصفیہ : آتا ہے

۳۵۶

سنتے تو ہیں اکثر کہ یہ عنقا ہے ہما ہے
کیا جانوں میں کیا چیز زمانے میں وفا ہے

اے نکہتِ گل تو نہ کہیں ہو جو مکدّر
اک میری کفِ خاک بھی ہمراہ صبا ہے

کیا جانیے کیا صبح کو احوال ہو میرا
پھر رات سے سودا تری زلفوں کا بندھا ہے

اک دردِ محبت ہے کہ جاتا نہیں، ورنہ
جس درد کی ڈھونڈھے کوئی دنیا میں دوا ہے

مضمون مرے خط کا وہ سفاک سمجھ کر
قاصد سے کہے ہے کہ یہ خط کس نے لکھا ہے

تکتا ہے تو کیا مرغِ چمن سامنے گل کے
کچھ سوچ بھی ہے تجھ کو، ترا ہوش گیا ہے

وارفتہ ہے اتنا ترے نظارے میں، اس دم ق
نے شرم کسی کی ہے اب اس کو نہ حیا ہے

ٹک دیکھ تو تو مصحفیِ خستہ کی جانب
کیا پیار کی نظروں سے تجھے دیکھ رہا ہے

۳۵۷

زبس نظروں میں ہیں ڈھنگ اس بلائے ناگہانی کے
نہ سوئے تا سحر ہم رات مارے بدگمانی کے

کریں گے یاد کیا اس بے وفا کو، اتنی چاہت پر
نہیں قاصد سے ہم شرمندہ پیغام زبانی کے

خدا لکھے نہ عشقِ ناگہاں دشمن کے طالع میں
کہ ہم مارے ہوئے ہیں اس بلائے ناگہانی کے

خبر آنے کی سن کر اس کے، اٹھ بیٹھے وہ بستر پر
اٹھا سکتے نہ تھے سر بھی جو مارے ناتوانی کے

ادائے لغزشِ پا اس کی جب لکھنے کو بیٹھے ہیں
قلم گر گر پڑے ہیں ہاتھ سے بہزاد ومانی کے

مجھے کہتے ہو چاہے ہے کسی کو پھر تو ان روزوں
مرا دل وہ نہیں، صدقے گیا اس بدگمانی کے

پڑا رہنے لگا جوں نقشِ پا، اب خاک پر یہ دل
اٹھائے اس نے بھی نقشے ہماری ناتوانی کے

اخیرِ عمر ہے اب آرزوئے عشق کیا کیجیے
ہوئی پیری نمودار اور گئے وہ دن جوانی کے

انھیں بھی مصحفی جس طرح ہو کر ڈالیے آخر
کچھ اک ایام باقی رہ گئے ہیں زندگانی کے

۳۵۸

ڈرتا ہوں صبا تجھ سے جو وہ زلف اکڑ جائے
قسمت سے ہماری کہیں کچھ پیچ نہ پڑ جائے

کرتا ہوں میں نالے تو وہ یوں کوسے ہے مجھ کو — نالوں کو ترے آگ لگے اور تو اجڑ جائے
کیا پانو کرے بند وہ پھر کوئے بتاں میں — اس کو میں قدم رکھتے ہی دم جس کا اکھڑ جائے
خمیازے پہ خمیازہ تو لیتا ہے پہ مجھ کو — یہ ڈر ہے کوئی چین کا ٹانکا نہ ادھڑ جائے
دیکھوں ہوں میں ہر چار طرف بزمِ بتاں میں — شاید کسی بے درد سے یہ آنکھ بھی لڑ جائے
ہو کر کے گُہر پوش تو آیا ہے چمن میں — جی دھڑکے ہے، پھولوں پہ کہیں اوس نہ پڑ جائے
دیکھے جو تری قدکشی اے سروِ خراماں[1] — شمشاد خجل ہو کے زمیں میں وُوہیں گڑ جائے

اے مصحفی کاغذ پہ ترے نوکِ قلم سے
ہے لطف جو ایسی ہی غزل اور بھی پڑ جائے

۳۵۹

اینٹھے کبھو خط اور کبھو وہ زلف اکڑ جائے — ڈرتا ہوں کہ آپس میں یہ صحبت نہ بگڑ جائے
صبحِ طرب انگیز ہے وہ ساعدِ سیمیں — روشن ہو ابھی گوش کی سیون[2] جو ادھڑ جائے
دیکھے ہے جو بے طرح کچھ آئینے میں ظالم — ڈرتا ہوں کہ تجھ سے ہی تری آنکھ نہ لڑ جائے
وارفتہ ہوں ایسا میں کہ کوچے میں بتاں کے — ٹھہراؤں جو ٹک دل کو تو پھر پانو اکھڑ جائے
گر برق گری آن کے معمورۂ دل پر — کیا کام ہے اس سے ہمیں جل جائے اجڑ جائے
ہے جنسِ ملاحت سے گراں ناقۂ لیلیٰ — ڈرتا ہوں کہ ناقہ نہ کہیں ریت میں گڑ جائے

لے کر ہی ٹلے بوسہ میاں تیرے لبوں کا
بوسے کی گدائی کو اگر مصحفی اڑ جائے

۳۶۰

اُس کی رفتار کا مذکور جب آ جاتا ہے — جی کی ہوتی ہے یہ حالت کہ رُندھا جاتا ہے
پوچھ مت صفحۂ ہستی پہ مثالِ انساں — ہے یہ وہ نقش کہ بنتے ہی مٹا جاتا ہے
ہے جو کاغذ پہ لکھا مطلبِ بے تابیٔ شوق — خود بخود نامہ ہوا بیچ، اُڑا جاتا ہے
دیکھ کر جامہ کتاں کا ترے بر میں اے ماہ — جوں کتاں اپنا تو دل ٹکڑے ہوا جاتا ہے

---

[1] ن الف: دیکھے جو ترا قد کبھی الخ
[2] ن ۲: گوش کی سیون

ہے تمھیں دُودِ سیہ کس کو دکھانا منظور — کاجل آنکھوں میں دو وقتی جو دیا جاتا ہے
شب مہتاب میں دیتا ہے جو تو مکھڑا کھول — آگے چہرے کے ترے چاند چھپا جاتا ہے
اب اگر دل کے تئیں لاکھ طرح سمجھاویں — اس کے بن دیکھے کوئی ہم سے رہا جاتا ہے
دل سے اٹھتا ہے دھواں آہ کا جب یک باری — آگے آنکھوں کے مری ابر سا چھا جاتا ہے

مصحفی سنیو کہ اس بحر میں اک مطلع اور
بہتر از مطلع خورشید لکھا جاتا ہے

۳۶۱

کون اس باغ سے اے بادِ صبا جاتا ہے — رنگ رُخسار سے پھولوں کے اُڑا جاتا ہے
شعلۂ شمع میں گرمی یہ کہاں سے آئی — اس کی گرمی سے تو فانوس جلا جاتا ہے
دل کے دھڑکوں کا یہ عالم ہے کہ بے منتِ دست — پُرزے ہو ہو کے گریباں اُڑا جاتا ہے
ربط پہلے جو ترے یاد کبھی کرتا ہوں — بیٹھے بیٹھے مجھے افسوس سا آ جاتا ہے
پوچھتا کوئی نہیں کب سے ترے کوچے میں — دل کسی کا ہے کہ پامال ہوا جاتا ہے
گئے وے دن کہ تمنّا ہمیں اک اشک کی تھی — اب تو ان آنکھوں سے دریا سا بہا جاتا ہے
شام کے وقت تو کوٹھے پہ جو آتا ہے کبھی — دیکھ کر تجھ کو یہ خورشید چھپا جاتا ہے
بے ادب کے تئیں مطلق نہیں صحبت کا شعور — شانہ کتنا تری زلفوں سے لگا جاتا ہے
یوں قدم رکھ نہ زمیں پر، تری رفتار سے آہ — دل کسی کا ہے کہ ماٹی میں ملا جاتا ہے

مصحفی عشق کی وادی میں گذر ہے کس کا
بھولا بھٹکا کوئی ایدھر کو بھی آ جاتا ہے

۳۶۲

کس منھ سے کریں ہم ہوس محمل لیلیٰ — فریاد میں ہے خود جرس محمل لیلیٰ
مرغ دل مجنوں کا نشاں ہم سے نہ پوچھو — ہووے گا اسیر قفس محمل لیلیٰ
ناقے کا قدم نجد میں پڑتا تھا جہاں تک — تھی نکہت گل ہم نفس محمل لیلیٰ
مجنوں ہے جہاں تو مجھے اودھر ہی کو لے چل — لیلیٰ سے یہ ہے ملتمس محمل لیلیٰ

کیا قافلہ اک راہ سے جاتا ہے عرب کا — محمل پہ ہے محمل بہ پس محمل لیلیٰ
فریاد کو مجنوں کی سنے کون، جہاں ہوں — لاکھوں دل نالاں جرسِ محمل لیلیٰ
اے مصحفی اس وادیِ پُر خوف میں ہم نے
ہر خار کو پایا عسسِ محمل لیلیٰ

۳۶۳

لاف گرمی ترے عارض سے جو گلشن مارے — آتشِ گل پہ صبا طیش سے دامن مارے
کیا ستم ہے کہ تو غرفے میں پھرے بال کھُلے — اور نظارہ ترا دیدۂ روزن مارے
دشمن و دوست کو اُلفت نے تری ایک کیا — ہاتھ پر ہاتھ نہ کیوں شیخ و برہمن مارے
تیری آنکھیں ہیں وہ رہزن کہ جنھوں نے کافر — قافلے لوٹ لیے، سیکڑوں رہزن مارے
سر کو اپنے میں کیا خاک رہِ سرو قداں — اس پہ شاید کوئی ٹھوکر دمِ رفتن مارے
پان و مسّی کی دھڑی دیکھے جو ہونٹوں پہ ترے — لافِ خوبی نہ لبِ جو گل و سوسن مارے
کشتنی اور بھی زنداں میں بہت ہیں لیکن — میں یہ چاہوں ہوں وہ پہلے مجھے گردن مارے
مصحفی چاہے تو اس سے بھی غزل گرم کہے
اس زمیں میں جو کوئی میری طرح گھن مارے

۳۶۴

غیر سے آنکھ نہ یوں وہ بتِ پُرفن مارے — اور جو مارے تو مجھے تیغ سے گردن مارے
کیا ستم ہے کہ جو گذرے ترے کوچے سے اُسے — چشمک اپنی ہی طرف دیدۂ روزن مارے
اس کی تربت پہ بنانا ہے چمن اے صیاد — جس کو یاں حسرتِ نظارۂ گلشن مارے
سختیِ عشق سے ہاتھ اپنا ہے پتھر کے تلے — اس کو سینے پہ کوئی کیا دمِ شیون مارے
سینے آوے جو گریباں ترے دیوانے کا — سر سے عیسیٰ کے وہ لے رشتہ و سوزن مارے
اے خوشا حال اُنھوں کا جو ترے کوچے میں — خاک پنڈے سے ملے بیٹھے ہیں آسن مارے
ہم تو اے غیرتِ لیلیٰ تری خاطر اب تک — قیس کی طرح پڑے پھرتے ہیں بن بن مارے
مصحفی کام مرا ضبط سے اب درگذرا — کب تلک غم میں کسی کے کوئی تن من مارے

٣٦٥

اس ظلم کی آفت کسی ہم فن پہ نہ ہووے
ہم پر جو مصیبت ہے وہ دشمن پہ نہ ہووے

اس ڈر سے میں تکتا نہیں روزن کی طرف بھی
واں آنکھ تری بھی کہیں روزن پہ نہ ہووے

کیا لطف سے دیکھوں میں ترے حسن کا عالم
سورج کی نظر گر ترے چلمن پہ نہ ہووے

منظور ہے گر عرس مرا کیجیے لیکن
انبوہ رقیباں مرے مدفن پہ نہ ہووے

جاتا نہیں اس ڈر سے میں شمشیر تلے بھی
احسان کسی کا مری گردن پہ نہ ہووے

دیکھے جو مرے داغ جگر بلبل بستاں
تو شیفتہ رعنائی گلشن پہ نہ ہووے

صد چاک ہے کیوں مصحفی خستہ کا سینہ
پوچھو تو، وہ عاشق کسی درزن پہ نہ ہووے

٣٦٦

نہ تو یہ آہ ہی ہم دوش اثر ہوتی ہے
نہ شب ہجر کی کم بخت سحر ہوتی ہے

ذبح کے وقت بھی قاتل سے میں کہہ دیتا ہوں
آستیں تیری مرے خون سے تر ہوتی ہے

تو جو بالیں سے مری اٹھ کے لگے ہے جانے
تیرے اٹھتے ہی قیامت مرے گھر ہوتی ہے

ہے شب ہجر، میں اٹھ اٹھ کے قلق کے مارے
دل کو دیتا ہوں تسلّی کہ سحر ہوتی ہے

سیکڑوں معنیٔ باریک نظر آتے ہیں
جب کبھی پیش نظر اس کی کمر ہوتی ہے

ہم کو درپیش ہے یاں تیغ تلے سر رکھنا
یہ مہم دیکھیے کس طرح سے سر ہوتی ہے

یہ بگولا نہیں اٹھتا ہے ترے کوچے سے
حسرت دل ہے کہ واں خاک بسر ہوتی ہے

مصحفی ربط یہ پہنچا ہے بہم اُس سے مجھے ق
کہ بہ یک خانہ ہی اوقات بسر ہوتی ہے

لیک آنکھوں ہی میں رہتا ہے تصوّر اس کا
کسی دن اُس سے جُدائی بھی اگر ہوتی ہے

٣٦٧

میں وہ نہیں ہوں کہ اس بُت سے دل مرا پھر جائے
پھروں میں اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے

نہ چھیڑ زلف کو اے شانے کیا کرے تو بھلا
یہ ناگنی جو تجھے کاٹ کر ذرا پھر جائے

خدا کرے نہ ملے اُس کو آشنا کوئی
اگر کسی سے کوئی ہو کے آشنا پھر جائے

ذرا جواب تو دے اٹھ کے اپنے سائل کو
یہ بے نصیب ترے آستاں سے کیا پھر جائے

روا ہے یہ کہ نہ آوے تو در تلک اپنے
دل ستم زدہ دے کر تجھے دعا پھر جائے

عجب[1] یہ کیا ہے جو دیکھے وہ گھور کر مجھ کو
لبوں پہ آ کے مرے نالۂ رسا پھر جائے

ہوا ہے دل مرا گم، پاوے سو بٹھا رکھے
فغانِ نالہ، منادی یہ جا بجا پھر جائے

وہ آفتاب جدھر رُو کرے، عجب کیا ہے
منھ اس طرف کو گل آفتاب کا پھر جائے

کرے اشارہ جو مژگان سرمہ سا کا وہ شوخ
تو دل کے گرد مرے، لشکر بلا پھر جائے

پھرا جو واں سے سو وہ زینہار پھر نہ گیا
گلی میں اس کی کوئی ہم سا بے حیا پھر جائے

ہوا ہے، ابر ہے، بھر ساقیا گلابی مے
نہ کر درنگ، مبادا کہ یہ ہوا پھر جائے

میں تلخ کام ہوں زہر فراق سے ایسا
کہ جیسے مردم بیمار کا مزا پھر جائے

نہ پلٹے تیغ تری سر سے تیرے عاشق کے[2]
یہ بات اور ہے، آئی ہوئی قضا پھر جائے

سناؤ اب کی غزل مصحفی اک ایسی بھی
کہ جس سے سن کے زبانوں پہ مرحبا پھر جائے

۳۶۸

دکھا کے در سے وہ مڑنے کی گر ادا پھر جائے
تو پارسائی سے پھر اپنی پارسا پھر جائے

بہ رنگ مارگزیدہ رہے وہ سوتا ہی
کسو کے سر پہ جو وہ کاکل رسا پھر جائے

وہ اضطراب ہے اس کے تئیں، جو آوے بھی
تو دے کے خط مجھے قاصد برہنہ پا پھر جائے

پیالے دیتے ہو بھر بھر کے سب کو تم، کیا ہو
مری طرف بھی اگر ہاتھ آپ کا پھر جائے

کریں ہیں غیر خبر اس کو میرے مرنے کی
کہ رستے ہی میں سے سن کر یہ ماجرا پھر جائے

وہ آفتاب جو آوے نکل تو اس کی طرف
خود آفتاب، گل آفتاب سا پھر جائے

جو دے سکے نہ رہِ عشق میں ہمارا ساتھ
ہمارے ساتھ نہ آوے وہ آشنا پھر جائے

---

[1] ن ۲: عجب تو کیا ہے

[2] ن ۲: نہ ہٹے تیغ تری سر سے ترے عاشق کے، (نیز یہ شعر ن ۲ میں دوسری غزل نمبر ۳۶۸ میں شامل ہے)

دیا ہے مجھ کو یہ برگشتہ طالعی نے اثر
کہ آ کے سر پہ مرے سایۂ ہما پھر جائے

ستم ہے یہ کہ پھریں ہم سے اک تو وے زلفیں
اور اُن کے ساتھ میاں ہم سے رخ ترا پھر جائے

ہوا کچھ اور ہی واں بندھ رہی ہے، دور نہیں
جو پچھلے پانو گلی سے تری صبا پھر جائے

ترے شہید کا کوئی نہیں، اسی کا خون
تری گلی میں مگر ہو کے[1] خوں بہا پھر جائے

پھروں میں آپ سے ممکن نہیں یہ، بے تقصیر
مزاج آپ کا مجھ سے اگر پھرا، پھر جائے

بکھیر دے جو وہ زلفوں کو اپنے مکھڑے پر
تو مارے شرم کے آئی ہوئی گھٹا پھر جائے

بدل کے قافیہ لکھ اک غزل اب ایسی اور
کہ جس کے پڑھتے ہی اے مصحفی ہوا پھر جائے

۳۶۹

غم اس کا کچھ نہیں گو مجھ سے اک جہاں پھر جائے
پہ یہ نہ ہو کہ مرا یارِ مہرباں پھر جائے

بیاں کروں خطرِ وادیِ محبت گر
تو راہ ہی میں سے یاروں کا کارواں پھر جائے

نقاب منھ سے نہ کھول اپنے، میری آنکھوں میں
خدا ہی جانے کہ اس وقت کیا سماں پھر جائے

برس تو ابرِ مژہ اس قدر کہ جس سے ذرا
گلوں کو تازگی ہو، رنگ گلستاں پھر جائے

روا ہے یہ کہ ترے آستاں پہ جو آوے
لگا کے منھ سے تری خاکِ آستاں پھر جائے

اگر مقابلِ ابروے یار ہو ارجن
تو ہاتھ اُس کے لگیں کانپنے، کماں پھر جائے

بعید کیا ہے جو قبلے سے تیرے منھ کی طرف
برنگِ قبلہ نما روے زاہداں پھر جائے

ہے جاے رحم یہاں اُس اسیرِ بےبس پر
قفس کو، دیکھ کے جو اپنا آشیاں پھر جائے

زمیں شگفتہ ہے، اب دوسری غزل کی طرف
کمیتِ خامہ کی اے مصحفی عناں پھر جائے

۳۷۰

جہاں سے جائے وہ جو تم سے اے بتاں پھر جائے
ستارے پھیر لیں منھ اس سے آسماں پھر جائے

سموم آہ مری رو کرے جدھر کو وہیں
گلوں کے چہرے پہ اک زردیِ خزاں پھر جائے

---

[1] ن ۲: گر بہرِ خوں بہا پھر جائے

تو در کو شوق سے رکھ بند، پر نہ اتنا بھی　　　کہ آوے جو کوئی وہ ہو کے بد گماں پھر جائے
سنہری حسن کی اس کے پڑے جو اس پہ جھلک　　　تو کچھ عجب نہیں گر رنگ زعفراں پھر جائے
جو تیرے حفظ میں ہو، اس کے قصد پر دشمن　　　کماں جو ہاتھ میں لے تو رُخِ کماں پھر جائے
گلی میں اس کی مجھے سب کہیں ہیں آتا دیکھ　　　نہ اپنی جان پہ کھیلے یہ نوجواں پھر جائے
گماں غلط ہے یہ اک آدھ کا، خدا نہ کرے　　ق　　کہ اپنی طرزِ سخن سے مری زباں پھر جائے[1]
ہزار بار میں پورنگ اس سے کاٹے ہیں　　　یہ تیغ وہ نہیں جو وقت امتحاں پھر جائے

پھریں نہ مصحفی ہم اس سے شرط عشق ہے یہ
ہزار اپنی طرف سے وہ دل ستاں پھر جائے

۳۷۱

جب جاتے جاتے اُس نے پردہ اٹھا دیا ہے　　　عالم کو رہ گذر میں عالم دکھا دیا ہے
ہر لحظہ جعد اس کی دل مانگتی ہے مجھ سے　　　کافر نے کس بلا کو پیچھے لگا دیا ہے
مذکور میں دہن کے لایا ہوں زلف کا ذکر　　　تھوڑی سی بات کو میں کتنا بڑھا دیا ہے
آیا ہے جب چمن میں نازک نہال میرا　　　ہر شاخ گل نے اپنے سر کو جھکا دیا ہے
اُٹھے ہیں سرگراں ہم خواب عدم سے ہم کو　　　یہ کچی نیند میں سے کس نے جگا دیا ہے
نے خط و نے کتابت، یارانِ رفتہ نے تو　　　یک بار اپنے جی سے ہم کو بھلا دیا ہے
گھڑیوں پہ آرہی ہے اب اپنی زندگانی　　　جوں شمع داغ غم نے ازبس جلا دیا ہے
بادِ صبا چمن میں آتی ہے گر کبھی تو　　　غنچوں[2] نے چٹکیوں میں اُس کو اڑا دیا ہے

گر مصحفی میں اس سے مانگا ہے کوئی ساغر
ساقی نے میری ضد سے شیشہ لڑھا دیا ہے

۳۷۲

نہ قاصد ہے نہ نامہ ہے نہ پیغام زبانی ہے　　　کئی دن سے ہمارے حال پر نامہربانی ہے
اگرچہ اوٹ تو دل لوٹ[3] ہونے کی نشانی ہے　　　ادا چتون کی اس کی پریوں خصم جانی ہے (کذا)

---

[1] ن ۲: یہ شعر ندارد　　[2] الف: غنچے نے　　[3] اصل: پوٹ

خلل سا آگیا ہے جلوۂ دامن درازاں میں
زبس رونے سے میرے تا کمر گلیوں میں پانی ہے

خرام اس کے میں ہے انداز آشوب قیامت کا
قیام اس کے میں اک ترکیب سرو بوستانی ہے

سر شب سے ہی سو رہتے ہو کیا تم ڈھانپ کر منہ کو
میاں کچھ شغل بھی لازم ہے، قصہ ہے، کہانی ہے

دیے آتا ہوں اپنا چاک جیب اُس گل کو یہ کہہ کر
کہ "لے جاتا ہوں میں" یہ مجھ دوانے کی نشانی ہے

قفس میں ہوں میں اس کے، تو بھی اس صیاد کافر کو
مری ہی فکر ہے ہر دم، مری ہی پاسبانی ہے

اگر میں مر گیا، تیری بلا سے، تو نہ ہو غمگیں
بلا سر سے ٹلی تیرے، پھر اب کیا سر گرانی ہے

خدا کے واسطے اے شب نہ جا اتنی شتابی سے
کہ اس نے بعد مدت کے مری اک بات مانی ہے

کناری گرد دامن برق سی چمکے ہے، اے ظالم
یہ جوڑا آسمانی بھی بلائے آسمانی ہے

قدم آگے اٹھا سکتے نہیں ہم اس کے کوچے سے
کہ پانو پر ہمارے سر جھکاتی ناتوانی ہے

لیا ہے چلتے چلتے جو اٹھا ہاتھوں میں دامن کو
خدا جانے اُسے منظور کیا آفت اٹھانی ہے

جو نقش اوّل غزل کا تھا، سو تو نے مصحفی دیکھا
غزل اب دوسری لکھتا ہوں، سو یہ نقشِ ثانی ہے

۳۷۳

نہ وہ راتیں نہ وہ باتیں نہ وہ قصہ کہانی ہے
فقط اک ہم ہیں بستر پر پڑے اور ناتوانی ہے

بھلا میں ہاتھ دھو بیٹھوں نہ اپنی جان سے کیوں کر
خرام اس کے میں اک آب رواں کی سی روانی ہے

تو یوں بے پردہ ہو جایا نہ کر ہر ایک کے آگے
نیا عالم ہے تیرا اور نئی کافر جوانی ہے

نہ تنہا میں ہی اپنے دل کو اس کوچے میں ڈھونڈھوں ہوں
کہ یاں حضرت مسیحا نے بھی آ کر[1] خاک چھانی ہے

بسان صورت شب تار، ہم جیتے تو ہیں لیکن
جو سچ پوچھو بہ دست غیر اپنی زندگانی ہے

کسی نے کچھ کہا[2] ہرگز نہیں، تم ناز تو دیکھو
نزاکت کے سبب سے اس کو آپ ہی سرگرانی ہے

نہ تنہا گل گریباں پھاڑتے ہیں دیکھ اس سج کو
چمن میں آب جو بھی چال پر اس کی دوانی ہے

طبیعت ناگہاں آوے نہ رووے خوش پہ دشمن کی
کہ اس کا ناگہاں آنا، بلائے ناگہانی ہے

مجھے وحشت سی اک ہوتی ہے پیارا آہ کیا کیجے
کہ اُس بن کیا اندھیری رات ساون کی ڈرانی ہے

---

[1] الف: اکثر   [2] الف: کیا

تری باتوں نے تو اے مصحفی جی کو جلا ڈالا
خدا کے واسطے چُپ رہ، یہ کیا آتش زبانی ہے

۳۷۴

نصیبِ اپنے ہیں غم، اور دل کو عیش و شادمانی ہے — ہم اس جینے سے درگذرے، یہی گر زندگانی ہے
اگر ہے دشمنِ جاں تو بھی اپنا یار جانی ہے — تغافل ہیں بھی اس کے، اک طرح کی مہربانی ہے
اُٹھیں کیوں کر نہ مُردے گور سے، وقتِ خرام اُس کے — کہ یہ بُوٹا سا قد اس کا، قیامت کی نشانی ہے
سنجافِ سبز یوں لگتی ہے اُس کے سرخ جامے پر — کہ گویا برق دامن گیرِ سروِ بوستانی ہے
کوئی کس وقت دردِ دل کہے، جب جائیے واں تو — تغافل ہے، تجاہل ہے، ادا ہے، سرگرانی ہے

سر اپنا کاٹ کر رکھ دیں گے اک دن روبرو اس کے
کریں کیا آہ ہم نے بھی یہی اب جی میں ٹھانی ہے

۳۷۵

کس جا و دلکا مرے ارمان نکل جائے — سر قدموں پہ رکھتے ہی اگر جان نکل جائے
ہے جائے تعجب کہ خبر دل کو نہ ہو اور — پہلو سے مرے تیر کا پیکان نکل جائے
اس کوچے سے آوارہ ہوا یوں میں سفر کو — جس طرح کوئی بے سر و سامان نکل جائے
ہوئے نہ خبر قیس کو اس دشت میں ہے ہے — اور ناقۂ لیلی کی میدان نکل جائے
خمیازہ نہ اس طرح سے لے مجھ کو یہ ڈر ہے — کہنی نہ تری اے بتِ نادان نکل جائے
جب تجھ سے پری جلوہ سے ہو چشم مقابل — صحرا کو نہ کس طرح سے انسان نکل جائے

اُس کو سے نکلنے کا نہیں مصحفی جیتا
خاک اُس کی مگر ہو کے پریشان نکل جائے

۳۷۶

منھ سے ترے "مر بھی" جو مری جان نکل جائے — مرتے ہوئے، جی کا مرے ارمان نکل جائے
دیکھے جو ترے جامۂ چسپاں کو چمن میں — گل کر کے ابھی چاک گریبان نکل جائے
تیر اس کا مرے دل سے نہ نکلے تو نہ نکلے — لیکن یہ کسو طرح سے پیکان نکل جائے

اے آئینہ، کر اس کی ٹک اک چشم نمائی — شاید کجی زلف پریشان نکل جائے
ہر چند کہ ہے ہوش رُبا صورت شیریں — دیکھے تری صورت کو اگر جان نکل جائے
مجنوں کو مفر عشق سے لیلیٰ کے کہاں ہے — دیوانہ مگر سوئے بیابان نکل جائے

کیا مصحفیؔ خستہ کے طالع ہیں، صد افسوس
یوں ہاتھ سے اس کے نزا دامان نکل جائے

۳۷۷

کل اُٹھ گیا جو ہاتھ چھڑا میرے ہاتھ سے — آیا ہوا شکار گیا میرے ہاتھ سے
مہندی کو اپنی دیکھ کے کہنے لگا وہ شوخ — ہے ہے کسی کا خون ہوا میرے ہاتھ سے
دیتا تھا نامہ اس کو میں، نامے کے سہو میں — دل لے گئی اڑا کے صبا میرے ہاتھ سے
ظالم خدا کے واسطے بیٹھا تو رہ ذرا — ہاتھ اپنے کو نہ کر تو جدا میرے ہاتھ سے
دیں اس نے گالیاں مجھے جس وقت، اس گھڑی — کچھ ہو سکا نہ غیر دعا میرے ہاتھ سے
تلواریں ترے ہاتھ سے کھائی ہیں بھلا میں، — ظالم کبھی تو پان تو کھا میرے ہاتھ سے
یارب کبھی وہ دن ہو کہ خلوت میں وہ صنم — کھلوائے اپنے بند قبا میرے ہاتھ سے

اس سنگ دل کو جا کے دکھاوے گا مصحفیؔ
ٹوٹا ہوا جو شیشہ گیا میرے ہاتھ سے

۳۷۸

نت اس بُت کافر کی ملاقات نئی ہے — ہر وقت میں ہر آن ہیں یاں بات نئی ہے
پانی کی جگہ برسے ہے خوں آنکھوں سے میری — سچ پوچھو جو مجھ سے تو یہ برسات نئی ہے
سو ٹکڑے تڑق کر کے ہوا صبح کا سینہ — میں تم سے نہ کہتا تھا کہ یہ گات نئی ہے
ہے شوق زبس اس کے تئیں معنیٔ نو سے — جب دیکھو طبیعت مری دن رات نئی ہے

اے مصحفیؔ رک مت تو الگ لپٹنے سے اس کے
کیوں، تجھ سے ابھی اس کی ملاقات نئی ہے

۳۷۹

کوچے میں اس کے جو کوئی جی کھو کے جا سکے / دل کی مرے خبر وہی جاں باز لا سکے
ہر چند گل ہو دستِ زلیخا سے شوخ تر / دامن کو اس کے ہاتھ تو اپنا لگا سکے
قدرت یہ کس مصوّرِ جادو رقم میں ہے / یہ خال و خط یہ چہرہ یہ نقشہ بنا سکے
ہے اس کی آبِ تیغ میں اعجازِ عیسوی / لاکھوں کو ایک دم میں جو چاہے جِلا سکے
گر رنگ و بُو سے اپنے ہو ٹک اس کو آگہی / گل اپنے پیرہن میں نہ پھُولا سما سکے
مجھ سے تو شورِ آہ کا اخفا نہ ہو سکا / اے دل تو داغِ غم کو چھپا گر چھپا سکے
بُلبل اُڑے تو مجھ سے جب اس گلستاں کے بیچ / نالے کی میرے طرز تو پہلے اُڑا سکے

آتا ہے سامنے سے وہ بنیے کا مصحفی
سودا ہے مفت ایسے میں گر جی چلا سکے

۳۸۰

جس سے امیدِ وفا تھی بے وفائی اس نے کی / آشنائی کر کے، پھر نا آشنائی اس نے کی
ذوقِ فندق رنگنے کا جب تجاوز کر چکا / رفتہ رفتہ پور پور اپنی حنائی اس نے کی
ہاتھ گر آوے تو میں شانے کے سو ٹکڑے کروں / پھر تری زلفوں میں، سنتا ہوں، رسائی اس نے کی
بُت بنایا تھا خدا نے اس کو، پر اس پر بھی ہائے / کبریائی پر جو وہ آیا، خدائی اس نے کی
جب کہا تھا ہم نے اس کو: بیٹھ غیروں سے جدا / ہم سے اتنی بات پر یار و جدائی اس نے کی
جب ہوا فرقت کے مارے حال مجنوں کا تباہ / کاسہ لے کر کوے لیلیٰ میں گدائی اس نے کی

نالہ و فریاد سے امشب جو چُپ ہے مصحفی
دردِ دل کی کچھ نہ کچھ شاید دوائی اس نے کی

۳۸۱

کچھ حیا آنکھوں میں ہے اس کی، تو کچھ پیار بھی ہے / کچھ تغافل ہے تو کچھ لطف کا آثار بھی ہے
وعدۂ قتل سے رکھتا ہوں دل اپنے کو میں شاد / کہ اسی وعدے میں اک وعدۂ دیدار بھی ہے

یوں جو پھرتا ہے تو گلیوں میں پڑا، ہوتا خوار — دل بدبخت کوئی تیرا خریدار بھی ہے
ہے غضب، ایک تو کھائے ہیں تری تیغ کے زخم — تس پہ اس سر کو ہوائے گل و گلزار بھی ہے
شمع کی طرح سے حُسن اس بتِ ہرجائی کا — رونقِ خانہ ہے اور رونقِ بازار بھی ہے
کفر اور دیں میں تغایر نہیں، گر دیکھیے خوب — ساتھ تسبیح کے دانوں کے تو زُنّار بھی ہے
داغ اپنے ہیں میں دونوں کو دکھانے اے دل — لالۂ زرد بھی اور نرگس بیمار بھی ہے ۲۱۱۰
باغ کی سیر کو جاتے تو ہو ہم راہِ رقیب — ساتھ خدمت کے تمھاری یہ گنہ گار بھی ہے
مصحفی کوے بتاں ہی میں تو چل رہ کہ میاں — واں ہوا ٹھنڈی ہے اور سایۂ دیوار بھی ہے

۳۸۲

جب شبِ غم اشکِ سرخ اپنے کا یَم چڑھ جائے ہے — تا خمِ نیل فلک رنگ بقَم چڑھ جائے ہے
جوش پر آتی ہے جس دم اس کی سیلِ آبِ تیغ — قلزمِ بیداد و دریائے ستم چڑھ جائے ہے
یا وہ طاقت تھی کہ ہم جاتے تھے اس تک دوڑ دوڑ — یا یہ حالت ہے کہ دم لینے میں دم چڑھ جائے ہے ۲۱۱۵
مُنھ سے کف آنے لگیں ہیں یوں ترے بیمار کے — سانپ کے کاٹے ہوئے کو جیسے سَم چڑھ جائے ہے
قلعۂ گردوں کو جس دم جا لگے ہے فوجِ اشک — نالہ میرا دوش پر لے کے عَلَم چڑھ جائے ہے
یارو یا بلیاں کہوں کیا اپنے طفلِ اشک کی — یہ تو جنتر پر فلک کے ایک دم چڑھ جائے ہے
آگ دیتا ہوں میں نالے کی قلم کو جس گھڑی — تڑپ کر اوجِ فلک پر یہ قلم چڑھ جائے ہے
کیسی گھبراتی ہے لیلیٰ، راہِ صحرا بھول کر — نجد پر گر ناقہ اُس کا دو قدم چڑھ جائے ہے ۲۰

مصحفی قائل ہوں میں معشوق کا تیرے، میاں
خوب رُو ایسا، کسی کی نظروں کم چڑھ جائے ہے

۳۸۳

جب کبھی صید افگنی کو وہ صنم چڑھ جائے ہے — کوہ پر ایک ایک آہو کر کے رَم چڑھ جائے ہے
ضعف، اس تک جاتے، ہم کو سو جگہ مانع ہوا — ہر قدم پر جوں دیے والے کا دم چڑھ جائے ہے
رات کالی ہجر کی، کالے سے کم ہرگز نہیں — دیکھتے ہی جس کی صورت ہم کو سَم چڑھ جائے ہے
کر دیے گریہ نے نرم اجزائے تن اپنے تمام — موسمِ باراں میں جوں کاغذ پہ نم چڑھ جائے ہے ۲۱۲۵

دل کے آئینے کی ہم لیتے ہیں تب ہے ہٹے[1] خیر
اس پہ جب دو دو فرق یہ زنگِ غم چڑھ جائے ہے

جب ہم آغوشی کو ہاتھ اپنے اٹھاتا ہوں وہ شوخ
دوڑ کر کوٹھے پہ اپنے، ہے ستم چڑھ جائے ہے

مار رکھتا ہے وہ اُس کو مصحفیؔ اک تیر میں
شستَ پر اس کی جب آ ہوے حرم چڑھ جائے ہے

۳۸۴

جب ترا ماتھا غضب سے اے صنم چڑھ جائے ہے
کہیئے کچھ تو اور بھی بھَوں پہ ستم چڑھ جائے ہے

پا نہیں سکتا وہ میرے رتبۂ پرواز کو
اڑتے اڑتے طائرِ سدرہ کا دم چڑھ جائے ہے

آہ پر لختِ جگر کی کیا کہوں دم بازیاں
ہر مُشَعبد بانس پر اس طرح کم چڑھ جائے ہے

وہ سپہ سالار ہے نالہ مرا، جو دم بہ دم
آسماں پر، لے کے فوجِ درد و غم چڑھ جائے ہے

سانپ کی سی لہر، جب گذرے ہے جی میں زُلفِ یار
اک پھُریری آ کے مجھ کو اس کا سَم چڑھ جائے ہے

۳۸۵

دیکھ تو ہم میں غمِ عشق نے کیا رکھا ہے
بے وفائی نے تری جی کو جلا رکھا ہے

تیرہ بختی کا اثر دیکھیو، اس نے ہے ہے
بالوں میں، چاند سے مکھڑے کو چھپا رکھا ہے

عید کے دن بھی تو ہم سے نہ ملا تو ہم نے
زہر بازار سے آ گو ہی منگا رکھا ہے

میں تو ان لوگوں سے بھاگے تھا، ولے کیا کیجیے
اس کی باتوں نے مرے دل کو لُبھا رکھا ہے

جس شب آیا نہیں تو دل کی تسلّی کے لیے
لے کے خنجر کو میں پہلو میں سُلا رکھا ہے

پھاڑ کر اپنے گریباں کو ہم نے تجھ بن
آ کے تو دیکھیے، تو اک سانگ بنا رکھا ہے

جب فسوں سازی پہ آئے ہیں وہ لعلِ شیریں
راہ جاتوں کو بھی باتوں میں لگا رکھا ہے

قفس اور دام تو کچھ مانعِ پرواز نہ تھا
ہم کو صیاد کی اُلفت نے بٹھا رکھا ہے

کس کا وعدہ ہے میاں مصحفیؔ تم سے، یہ کہو
آج دروازے کو کیوں تم نے کھُلا رکھا ہے

---

[1] رام پور: ہے ہے تب

۳۸۶

پیری میں بھی ہم الفت طفلاں سے نہ چھوٹے / لکھ پڑھ چکے تس پر بھی دبستاں سے نہ چھوٹے
پہلی مسی تو نے تو لگائی ہے، مزا ہو / گر رنگ مسی کا ترے دنداں سے نہ چھوٹے
ہر ایک نے کھینچا ہمیں اپنی ہی طرف کو / ہم کشمکش گبر و مسلماں سے نہ چھوٹے
ہر چند کہ دھویا بہت اس دیدۂ تر نے / پُر خون کے داغ اپنے گریباں سے نہ چھوٹے
ناداں نہ گرہ زلف کی وا کر کہ غضب ہے / یہ سانپ لپٹ کر جو زنخداں سے نہ چھوٹے
کیا ہم سے اسیروں کو خوشی عید کے دن کی / زندانیٔ الفت کبھی زنداں سے نہ چھوٹے
دل چھوٹے تو چھوٹے ترے پیکاں سے ہمارا / پر خون کی سرخی ترے پیکاں[1] سے نہ چھوٹے
کیا جانے کس الجھیڑے میں وہ پڑ گئے ہوں گے / جو پھنس کے تری زلف پریشاں سے نہ چھوٹے
کب سیر چمن کو نہ گیا یار تو، کس روز / فوّارۂ خوں، دیدۂ گریاں سے نہ چھوٹے
کیا جانیے کیا گذری گرفتاری میں اُن پر / جو دامِ بلائے شبِ ہجراں سے نہ چھوٹے
داماں کو تو اپنے نہ جھٹک ہاتھ سے میرے / یہ ہاتھ وہ ہے جو کبھی داماں سے نہ چھوٹے
کیا دل کے کبوتر کا کروں ذکر میں ظالم / شہباز ترے چنگل مژگاں سے نہ چھوٹے

اے مصحفی ہوتا ہے بُرا عشق کا لپکا
مشکل ہے یہ عادت اگر انساں سے نہ چھوٹے

۳۸۷

نہ دوستی نہ محبت نہ دلبری دیکھی / جو کچھ کہ دیکھی میں اس سے، ستم گری دیکھی
کٹاریاں سی لگیں میرے اس گھڑی جس وقت / میں اس کے پاؤں میں شلوار خنجری دیکھی
اسی سبب تو پریشاں رہا میں دنیا میں / کہ سالہا تری زلفوں کی ابتری دیکھی
کیا ہے دعوئ ہم چشمی اس سے نرگس نے / کنیزِ شوخ کی تم نے برابری دیکھی
اٹھا میں سوتے سے یوں صبح دم سراسیمہ / کسو نے جیسے کہ شب خواب میں پری دیکھی
رہے جہان میں جب تک کہ ہم خراب رہے / مدد فلک کی نہ طالع کی یاوری دیکھی
ہوا جو مصحفی گھر بار تج کے گوشہ نشیں / اسی میں اس نے مگر اپنی بہتری دیکھی

[1] نیز: سرپیکاں

نالے مرے ہر چند اثر کچھ نہیں رکھتے — لیکن جو سنو تم تو ضرر کچھ نہیں رکھتے

ہوتا ہے جو ہم پاس، اٹھا دیتے ہیں وہ ہیں — ہم خانہ برانداز تو دھر کچھ نہیں رکھتے

ملتا ہے جو شام اس کو سمجھتے ہیں غنیمت — آزادہ دلاں فکرِ سحر کچھ نہیں رکھتے

ڈھونڈھو نہ کوئی ہم سے غرض غیر تواضع — ہم بید ہیں، گل اور ثمر کچھ نہیں رکھتے

ہو جاتے ہیں اس کی صفِ مژگاں سے مقابل — ہر چند کہ ہم جان و جگر کچھ نہیں رکھتے

کیا دوڑیں ہیں منھ پر مرے، کافر ترے دیدے — ہے ہے صفِ مژگاں سے خطر کچھ نہیں رکھتے

ایسے ہیں زخود رفتہ کہ اب یاد ہیں اس کی — ہم اچھے بُرے کی بھی[1] خبر کچھ نہیں رکھتے

کہہ دیتے ہو تم غیر سے گر باتیں ہماری — جاؤ جی ہم ان باتوں کا ڈر کچھ نہیں رکھتے

کس طرح سے منزل کے تئیں پہنچیں گے یارب — پاس اپنے تو ہم زادِ سفر کچھ نہیں رکھتے

عشق ان کو ہے جو مدِّ نظر حسنِ بتاں سے — جز دید کے، منظورِ نظر کچھ نہیں رکھتے

نرگس کی طرح اس چمنِ دہر میں ساقی — ہم اور بجز ساغرِ زر کچھ نہیں رکھتے

اتنا تو حقارت سے میاں ہم کو نہ دیکھو — اک دل تو ہے ہم پاس، اگر کچھ نہیں رکھتے

اے مصحفی ہم اب بھی ہیں دشمن پہ تو بھاری
ہر چند کہ شمشیر و سپر کچھ نہیں رکھتے

۳۸۹

جس گھڑی یاد وہ زلف و کمر آجاتی ہے — جی میں سودے کی سی اک لہر سما جاتی ہے

رتبۂ آہ نہیں داغِ جگر کو لیکن — گاہ گاہ اس سے بھی بوے اثر آجاتی ہے

گرچہ بیزار ہے وہ مجھ سے پہ بیٹھے بیٹھے — کچھ ہنسی اس کو مرے نام پر آ جاتی ہے

یاد کر اُن دُرِ دنداں کو جو روتا ہوں کبھو — روبرو آنکھوں کے سلک گہر آ جاتی ہے

اس کا منھ دیکھے ہے صیاد قفس کے نزدیک — گر کوئی بلبل بے بال و پر آ جاتی ہے

کس طرف جاؤں کہ افعی کی طرح زلفِ سیاہ — خواب میں آکے مجھے شب کو ڈرا جاتی ہے

---

[1] اصل: اپنی بدی

گرچہ وہ جست نہیں اشک میں میرے تو بھی
بوند اک آدھ برنگ شرر آ جاتی ہے

اس قدر محو خور و خواب نہ رہ اے غافل
با خبر رہ کہ اجل کی سحر آ جاتی ہے

مصحفی ایک غزل اور بھی لکھ جاتا ہوں
طبع اس وقت مدد پر اگر آ جاتی ہے

٣٩٠

تازہ ترکیب کوئی جب نظر آ جاتی ہے
آفت اک تازہ مری جان پر آ جاتی ہے

گرہ زلف کو جس وقت کہ دیتا ہے وہ کھول
سانپ کی طرح وہیں تا کمر آ جاتی ہے

کیا اسیران قفس میں بھی خوشی ہوتی ہے
جب کبھی باغ سے باد سحر آ جاتی ہے

جنبش زلف کا مکھڑے پہ کہوں کیا عالم
کہ ادھر جاتی ہے گاہے ادھر آ جاتی ہے

گھر سے نکلوں ہوں میں جب کر کے تصور اس کا
اس کی تصویر وہیں پیش در آ جاتی ہے

کس کی تصویر ہے یہ کوئی اسے سمجھاؤ
سامنے بال کھلے بے خطر آ جاتی ہے

کر دکھاتے ہیں ابھی خاک کو اکسیر کے رنگ
اس طرف اپنی طبیعت اگر آ جاتی ہے

مصحفی واسطے قاصد کے نہ اتنا گھبرا
آج کل اس کی گلی سے خبر آ جاتی ہے

٣٩١

خط کھینچے تو نے مجھ پر تحریر کیا نکالی
زخموں سے خوں میں رنگا تصویر کیا نکالی

عاشق تو کیوں ہوا تھا، تقصیر کیا نکالی
خنجر سے سر کو کاٹا، تعزیر کیا نکالی

وہ قتل کو جو میرے آیا تو خلق بولی
اس ناتواں پہ تم نے شمشیر کیا نکالی

دے چھوڑ کام اپنے تقدیر پر تو سارے
کم طالعی نے میری تدبیر کیا نکالی

اول جگر کو میرے یہ تو لگا جلانے
نالے نے ان دنوں میں تاثیر کیا نکالی

بل دے کے زلف اپنی مجنوں کے پاؤں باندھی
سستی نے طالعوں کی تاثیر کیا نکالی

گلیوں میں مصحفی کو دیوانہ کر پھرایا
اس عشق فتنہ گر نے تشہیر کیا نکالی

۳۹۲

رونق، بہار، حسن تمہارا، ہمیں سے ہے
جو کچھ کہ ہے بناؤ یہ سارا ہمیں سے ہے

آتی ہے دوڑی خلق ہمارے ہی رشک پر
عالم کا اس گلی میں گذارا ہمیں سے ہے

گر ہم نہ ہوں تو کون کرے سیر کائنات
دو دم کی زندگی سے نظارا ہمیں سے ہے

آغوش مدعی میں تو رہتا ہے ساری رات
اے بحرِ حسن تجھ کو کنارا ہمیں سے ہے

دیتا نہیں وہ اٹھنے کی تکلیف غیر کو
نظروں میں ہر گھڑی یہ اشارا ہمیں سے ہے

ہم کیوں نہ اس کی گردش رو کا کریں گلا
برگشتہ اِن دنوں یہ ستارا ہمیں سے ہے

شب مصحفیؔ کی شان میں کہتا تھا یوں وہ شوخ
بر سر کی بازی آج وہ ہارا ہمیں سے ہے

۳۹۳

ملنا ترا اغیار سے منظور کسے ہے
پر تجھ سے کہے اتنا یہ مقدور کسے ہے

وہ جی میں یہ نازاں کہ مرا رعب تو دیکھو
میں خوش کہ خیال نگہ دور کسے ہے

پُوچھا جو مرا قصہ کسی نے تو وہ ہنس کر
یوں کہنے لگا یاد یہ مذکور کسے ہے

کیا حور کا مذکور تو کرتا ہے ہمیشہ
چل دور ہو زاہد ہوس حور کسے ہے

گو نالہ کرے شب کو پڑا گو تو کراہے
پرواہ تری اے دل رنجور کسے ہے

تو مائل عشاق کشی ہے تو یہاں بھی
جینے کی طمع اے بت مغرور کسے ہے

موسی سے ہزاروں ہیں یہاں مصحفیؔ لیکن
سودائے تجلی کدۂ طور کسے ہے

۳۹۴

صورت عرق میں ہے یہ رخ بے حجاب کی
بھیگی ہو جیسے اوس میں پتی گلاب کی

مہ کس شمار میں ہے کہ ایسے جلال پر
جلتی ہے تیرے حسن سے آنکھ آفتاب کی

ایسی جھپک ہے حسن میں تیرے کہ دور سے
آنکھوں میں آسماوے ہے سرخی نقاب کی

یہ کیا غضب ہے ہائے کہ بجلی کی کوند میں   نکلے ہے ایک شکل تمھارے عتاب کی
اے آہ گرم دل کو تو پہنچا نہ ہووے داغ   سینے سے آج بو مجھے آئی کباب کی

آئی پسند مجھ کو بہت، میں نے مصحفی
دیوان سے ترے یہ غزل انتخاب کی

۳۹۵

یہ نہ سمجھو کہ سحر چاک گریباں ہووے   سو قباحت ہے جو وہ زلف پریشاں ہووے
کاش آزاد کرے مجھ کو قفس سے صیاد   خاص جب موسم گل گشت گلستاں ہووے
بے طرح برق اکڑتی ہے دموں پر اپنے   کہیں ایسے میں تری تیغ نہ عریاں ہووے
حسن ایسا ہی دیا ہے تجھے سبحان اللہ   آئینہ کیوں نہ تری شکل کا حیراں ہووے
اس دم تیغ پہ ہیں یوں مرے خوں کے قطرے   جیسے دریا میں لب آب چراغاں ہووے
کاش وہ دن تو دکھاوے مجھے اے جوش جنوں   کہ میں آوارہ ہوں اور کوہ و بیاباں ہووے
رنگ فندق نے ترے خون کیا ہے میرا   چاہیئے تو بھی اب انگشت بدنداں ہووے
اے کماں دار میں ہوں صید زبوں میرے پر   تیر وہ پھینکیو جو بے پر و پیکاں ہووے
ایسے جینے سے تو جی اپنا بہ تنگ آیا ہے   کہیں یہ محنت دشوار بھی آساں ہووے
ہے صنم رخ سے ترے نور تجلی پیدا   دیکھے کافر جو تری شکل مسلماں ہووے
جان کھایا ہے مرا عشق کی بے تابی نے   یاالٰہی نہ کوئی دشمن انساں ہووے
خوں کی کیا قدر ہے میری جو میں قربان کروں   رنگ گل رنگ کفک پر ترے قرباں ہووے
جرس قافلہ کہتا ہے کہ اب میرے سوا   کوئی اس قافلے میں اور نہ نالاں ہووے
موج مارے ہے مرا خوں ترے کوچے میں ہنوز   تا کسی طرح سے تیرا زہ داماں ہووے
ہمت اپنی ہے کہیں ہمت حاتم سے بڑی   بخش دیجیے ابھی گر ملک سلیماں ہووے

مصحفی اس کی گلی میں تو بہت جاتا ہے
میں یہ ڈرتا ہوں کہ کچھ تجھ پہ نہ بہتاں ہووے

۳۹۶

لباس سرخ میں کافر بھبھوکا بن کے آیا ہے   کسو کا گھر جلاوے گا جو لوکا بن کے آیا ہے

شبیہ مہر و مہ کو تہ کیا ہے پیر گردوں نے
ورق جب اس کی تصویر دو رو کا بن کے آیا ہے

مقابل آج ہونے دو ہمیں کو اس کے اے یارو
کہ تنہا اس گھڑی اس جنگجو کا بن کے آیا ہے

ورق زانو پہ رکھے اب تلک حیراں ہے مانی
زبس نقشا درست اس ماہ رو کا بن کے آیا ہے

خدا کے واسطے مت مصحفی کو اب تو کچھ کہنا
ترے آگے وہ پتلا آرزو کا بن کے آیا ہے

۳۹۷

یار کا سیب زنخداں تو مرے ہاتھ میں ہے
ضعف دل اپنے کا درماں تو مرے ہاتھ میں ہے

کون کہتا ہے کہ ہیں اس کو کیا سو ٹکڑے
اب تلک میرا گریباں تو مرے ہاتھ میں ہے

جوں میں چاہا کہ چھٹوں جلدی سے بولا شانہ
دامن زلف پریشاں تو مرے ہاتھ میں ہے

باندھ کر مہندی کی پٹی وہ کہے ہے سب سے
ہاں دل خستہ دروناں تو مرے ہاتھ میں ہے

دسترس اس کے گریباں پہ نہیں ہے تو نہ ہو
یار کا گوشۂ داماں تو مرے ہاتھ میں ہے

اس کا کیا ڈر ہے جو میں چاہ زنخداں میں گرا
رسن گیسوے جاناں تو مرے ہاتھ میں ہے

دوستو طعنہ نہ دو مجھ کو تہی دستی کا
کچھ نہیں اور گریباں تو مرے ہاتھ میں ہے

طرف ابر دکے میں دیکھوں ہوں تو کہتی ہے مژہ
ناز کا خنجر برّاں تو مرے ہاتھ میں ہے

آستیں تو نے چھڑا لی تو ہوا کیا قاتل
یہ ترا دامن افشاں تو مرے ہاتھ میں ہے

ہاتھ اپنا دل ناداں پہ دھرے رہتا ہوں
شکر ہے یہ دل نالاں تو مرے ہاتھ میں ہے

مصحفی کیوں کہ عدو دعوی تسخیر کرے
خاتم دست سلیماں تو مرے ہاتھ میں ہے

۳۹۸

سو مفر ہیں اس کے گر کوئی بلا پیچھے پڑے
کس طرف جاوے جو بندے کے خدا پیچھے پڑے

ہم نشیں بہر خدا کل ہی کا کر اس کی ذکر
تیری باتوں سے مرا دل تو ذرا پیچھے پڑے

بال ان زلفوں کے عارض کے ہوئے جی کے وبال
آشنا کے جیسے کوئی آشنا پیچھے پڑے

بسکہ وہ کاندھے پہ ڈالے ان کو پھرتا ہے مدام
ان دنوں رہتے ہیں وہ بند قبا پیچھے پڑے

میں کفِ افسوس ملتا ہوں اسی غم سے کہ ہائے
نازنیں تجھ سے کیے یوں جلد دو تا پیچھے پڑے

تم سے میں پوچھوں ہوں وہ پھر بھاگ کے جاوے کہاں
دوستو جس کے فلک کا اژدہا پیچھے پڑے

جعد سے اپنی ہو جس کو بے کلی شام و سحر
کیا عجب لاوے اگر آہ رسا پیچھے پڑے

جو سبک رو عشق کی راہوں میں ہیں ان کا سراغ
خاک بھی پاوے نہ گو بادِ صبا پیچھے پڑے

اس نے پھر کر بھی نہ دیکھا سایہ ساں اے مصحفی
اس بتِ کافر کے ہم تو بارہا پیچھے پڑے

۳۹۹

ہاتھ میں لے کے وہ جب تیغ دو سر نکلے ہے
زخمی اک آدھ ہر اک کوچے میں کر نکلے ہے

زلف سرکی تو ہوا جلوہ نمایوں عارض
جس طرح ابر کے لکّے سے قمر نکلے ہے

نہیں معلوم بلا کیا ہے ترے کوچے میں
جو کہ اس کوچے سے نکلے ہے سو مر نکلے ہے

چاکِ پیراہنِ ساقی پہ پڑھوں کیوں نہ درود
اس کے سینے سے تو اک لطفِ سحر نکلے ہے

کوچۂ عشق میں جاتے ہیں چلے پر ہم کو
نہیں معلوم کہ یہ کوچہ کدھر نکلے ہے

کون سے گل کا تو عاشق ہے بتا اے بلبل
تیرے نالے سے جو اک بوے اثر نکلے ہے

سینہ مجروح ہے کس خنجرِ مژگاں کا مرا
ہر دم آنکھوں سے جو کٹ کٹ کے جگر نکلے ہے

جام بھر بھر کے پیالے تو مجھے دے ساقی
اک پیالے سے کوئی دل کا کدر نکلے ہے

دیکھ ہوتا ہے اسے خطِ شعاعی بھی خجل
سر پہ جب طرۂ زرتار وہ دھر نکلے ہے

ابرِ تر نے تو کیا کوہ و بیاباں سیراب
کام کچھ تم سے بھی اے دیدۂ تر نکلے ہے

سوزشِ سینہ کی تاثیر نہ پوچھ اے ہمدم
سنگِ تربت سے مرے اب بھی شرر نکلے ہے

ہمسری اشک سے میرے وہ کرے کہہ تو صدف
تجھ سے کوئی کبھی ایسا بھی گہر نکلے ہے

مصحفی اب کی اٹھا لیویں گے ہم سر پہ پہاڑ
ہاتھ پتھر تلے سیں اپنا اگر نکلے ہے

۴۰۰

صبح کی شام ہوئی، شام کی پھر رات ہوئی
یہی وعدے ہیں تو کہہ اس کی ملاقات ہوئی

صبح نے حسن سے سینے کے گریباں پھاڑا / چاندنی دیکھ کے اس رخ کی صفامات ہوئی
یار آیا تو کیا پیشکش اس کے دل و دیں / غیر اس کے تو نہ کچھ ہم سے مدارت ہوئی
پھر لگے جھڑکی سے تم گالیاں دینے صاحب / بارے پھر آپ کی بندے پہ عنایات ہوئی
متصل دیدۂ گریاں کے وہ ساون برسے / غرض اس سال تو کیا خوب ہی برسات ہوئی
مصحفی کے تئیں اب کچھ نہ کہو جانے دو / ق / جب ملا اس سے یہی حرف و حکایات ہوئی
دوستو فائدہ کرتی ہے نصیحت کب اُسے / گالیاں کھانا ہی جس شخص کی اوقات ہوئی

۴۰۱

گر چشم تر سے ہم نے ٹک آستیں اٹھائی[۱] / تو دل نے نالہ کر کے سر پر زمیں اٹھائی
محفل کے بیچ ناگہ آیا جو ذکر میرا / اس جنگجو نے وو ہیں شمشیر کیں اٹھائی
اے دیو بے حمیت ہوتا ہے کیوں تو منکر / انگشتر سلیماں تو نے نہیں اٹھائی
پہنچے ہیں موج اس کے کہتے ہیں آگئی ہے / کم بخت نے صراحی مے کی کہیں اٹھائی
کل چیخیں مار رویا اتنا یہ دل کہ اس نے / مجلس تمام سر پر اے ہم نشیں اٹھائی
نقش جبیں ہمارا اس در پہ رہ گیا گو / جوں مہر سجدہ کر کے ہم نے جبیں اٹھائی

اے مصحفی نہ ہم نے رونے سے پائی فرصت
آنکھوں پہ ہاتھ رکھے گر آستیں اٹھائی

۴۰۲

شرم آتی ہے اب اُٹھ کر یاں سے کیا گھر جائیے / آستاں پر اس کے بیٹھے بیٹھے ہی مر جائیے
ہم تو کب اس بات سے راضی ہیں پر تم نے میاں / دل میں جانے کی ہی ٹھہرائی تو بہتر جائیے
اشتیاق اس کی گلی کا دل کو کرتا ہے کباب / گر بہم ہوں بال و پر اپنے تو اڑ کر جائیے
وہ تو آتا ہی نہیں اب کب تلک گذری کے بیچ / بیچنے کو ہاتھ میں لے کر کبوتر جائیے
آئیے گر کر کے دل سخت اپنا اس کوچے سے ہائے / کیا قیامت ہے کہ پھر ہو وہیں مضطر جائیے
تاکہ بعد از مرگ ہووے وہ مرا لوح مزار / اک ذرا چھاتی پہ میری پانو تو دھر جائیے
مصحفی یہ بحر معنی خیز آتی ہے نظر / اک غزل تو اور بھی اس میں رقم کر جائیے

۱۔ آصفیہ: ردیف "اٹھائی"

۴۰۳

جی میں آتا ہے مرے گر اس کے در پر جائیے
سر پٹکیے یاں تلک اپنا کہ بس مر جائیے

ڈر سے جاسوسوں کے مجھ کو سوچ رہتا ہے یہی
کس طرح جا ملیے اس سے آہ کیوں کر جائیے

بے قراری کا برا ہو کب تلک راتوں کو ہائے
کھولیے دروازہ ہر دم اٹھ کے باہر جائیے

اس کے ملنے کو گر آتا ہے معزز سا کوئی
مجھ سے کہتا ہے کہ اس وقت آپ تو گھر جائیے

کاش یہ خجلت نہ ہوتی، اس گلی میں کب تلک
سر جھکائے آئیے با دیدۂ تر جائیے

گوشہ گیری ہی بھلی ہے کیا مناسب ہے ولا
بزم شاہاں میں بہ ایں احوال ابتر جائیے

آپ کا بس بس بہت میں نے کیا اب تک ادب
ق
کھینچیے ہر دم میاں صاحب نہ خنجر جائیے

اس قدر اچھا نہیں کچھ خانہ جنگی کا گھمنڈ
بس بہت شیخی نہ کیجیے بندہ پرور جائیے

اضطراب دل سے میں تو مصحفی گھبرا گیا
یار ملتا ہی نہیں کیا کیجیے کیدھر جائیے

۴۰۴

نہ اس رونے سے آفت دیدۂ گریاں پہ آئی ہے
یہی رونا ہے تو دیکھو گے اک دن جان پہ آئی ہے

نہیں زلف سیہ رخسار سے اس کے جدا ہوتی
عجب کم بخت بدلی اس مہ تاباں پہ چھائی ہے

صدف میں یہ صفا موتی نے کب پائی تعالی اللہ
صفا کچھ اور ہی اس کے در دنداں پہ آئی ہے

کوئی اتنا تو کہہ دے جا کے زنداں بان یوسف سے
زلیخا پیٹتی سر کو در زنداں پہ آئی ہے

ہوا ہے گر کے دل مجروح چاہ عشق خوباں میں
شکست اس طرح سے اس رستم دستاں پہ آئی ہے

جب اس کی انگلیاں خندق بنا ہی کر یاد روتا ہوں
لہو کی بوند میرے ہر سر مژگاں پہ آئی ہے

یہ تیر غمزہ کس کے خون میں بوندی ہوا سچ کہہ
کہ سرخی زور ہی اس کے پیر و پیکاں پہ آئی ہے

سنی ہے جھوٹ سچ بھی میرے مرنے کی تو اس ساعت
بشاشت اور ہی کچھ اس گل خنداں پہ آئی ہے

در شہ سے کیا ہے منع گر صاحب کمالوں کو
الٹ کر چوب درباں بھی سر درباں پہ آئی ہے

غزل اک اور بھی اے مصحفی میں کہہ سناتا ہوں
طبیعت ان دنوں پھر کچھ ذرا جولاں پہ آئی ہے

۴۰۵

بہار موسم گل اب کے پھر طنیاں پہ آئی ہے
پھر ان ہاتھوں سے آفت جیب اور داماں پہ آئی ہے

میں کرکے یاد وہ دست حنائی اتنا روتا ہوں
کہ روتے روتے لالی دیدۂ گریاں پہ آئی ہے

قرین زلف یوں آویزۂ لعل اس کے ہیں گویا
کلی لالے کی جھک کر شاخ نافرماں پہ آئی ہے

پڑا پہلو میں تیرے رات دن فریاد کرتا ہے
نہیں معلوم کیا چوٹ اس دل نالاں پہ آئی ہے

ذرا تو بھی تو عالم دیکھ اپنے پان کھانے کا
عجب سرخی میاں تیرے لب و دنداں پہ آئی ہے

جو تیرا دور دامن دیکھتا ہے وہ یہ کہتا ہے
اسی دامن سے گردش گردش دوراں پہ آئی ہے

شب ہجراں سیاہ اتنی نہ تھی شاید کہ ان روزوں
سیاہی بخت کی میرے شب ہجراں پہ آئی ہے

لبوں پر اس کے مستی کی دھڑی کا رنگ تو دیکھو
عجب کالی گھٹا اس چشمۂ حیواں پہ آئی ہے

بہت بے طرح چمکے ہے تمامی کی سنجاف اس کی
یہ بجلی دیکھیں کس کس کے سر و ساماں پہ آئی ہے

جدھر دیکھو ادھر خوش قامتوں کا فتنہ برپا ہے
قیامت ایسی ہی اس شہر ہندوستاں پہ آئی ہے

گرفتار مصیبت جس قدر اے مصحفی میں ہوں
مصیبت اس قدر دنیا میں کس انساں پہ آئی ہے

۴۰۶

یاد اس کو دیدہ بازی کے ہیں فن نئے نئے
نت ہر طرف کو نکلے ہیں روزن نئے نئے

گذرا میں اس گلی سے تو آئے مجھے نظر
کہتے اسیر طوق بگردن نئے نئے

تجھ سے رفو نہ ہووے گا زخم دل اے مسیح
لاتا ہے کیوں تو رشتہ و سوزن نئے نئے

مستی کی ان لبوں کی دھڑی یاد آئی ہے
پتے نکالتی ہے جو سوسن نئے نئے

آنکھوں کو موند لے تو کہ آویں تجھے نظر
آئینہ خیال میں دشمن نئے نئے

یاروں سے پیش لوٹ دنیا نہ لے گئے
ازبسکہ ہم کو یاد تھے آسن نئے نئے

آتا ہے اب یہ جی میں کہ ایجاد کیجیے
ماتم میں دل کے نالہ و شیون نئے نئے

شب صرف چاک جیب ہوئے تھے جو مصحفی
بخیے میں طفل غنچہ کے دامن نئے نئے

۴۰۷

خط نیا خال نیا زلف کی تحریر نئی
ان دنوں مجھ کو نظر آتی ہے تصویر نئی

کر دیا اور خفا ملنے سے میرے اس کو
دیکھی اے آہ سحر تجھ میں یہ تاثیر نئی

پہلے مجھ پر ہی لگایا اسے ہنستے ہنستے
گر کبھی اس نے خریدی کوئی شمشیر نئی

بات کو کس کی میں باور کروں اس محفل سے
جو کوئی آوے ہے کرتا ہے وہ تقریر نئی

کس سے یہ ٹھوکریں سیکھا ہے خدارا سچ کہو
ہے تری چال تو کچھ اے بت بے پیر نئی

خانۂ دل کے تو نقشے پہ ذرا غور تو کر
دست صانع نے بنائی ہے یہ تعمیر نئی

مصحفیؔ شب میں لیا اس کے کفک کا بوسہ
جائے خوں ہے کہ ہوئی مجھ سے یہ تقصیر نئی

۴۰۸

کاجل آنکھوں میں نہ اتنا بھی لگایا کیجیے
تیرہ روزی مجھے ان کی نہ دکھایا کیجیے

منھ چھپاؤ نہ چھپاؤ نہیں اس کا کچھ ڈر
لیک سینے کو دوپٹے سے چھپایا کیجیے

جی میں آتا ہے کہ اس (دریہ) تماشے کے لیے
پرزے کر کر کے گریبان اڑایا کیجیے

دیکھنے والوں پہ آ جاتی ہے بے ہوشی سی
منھ سے یکبارگی پردا نہ اٹھایا کیجیے

قابل اس لطف کے کیا ہم نہیں غیروں کے تئیں
عطر مل مل کے نہ ہاتھوں کو سونگھایا کیجیے

وے جو مارے ہوئے ہیں طرز تغافل کے انھیں
کبھی چتون کی ادا بھی تو دکھایا کیجیے

کوئی کہتا تھا کہ ان روزوں وہ بیمار ہے سخت ق
دمبدم اس کی خبر لینے کو جایا کیجیے

ہو چکا مصحفیؔ خستہ کا سو کام تمام
آپ اب بیٹھے ہوئے باتیں بنایا کیجیے

۴۰۹

بہ حال نزع ہوں میں دے مجھے شمشیر سے پانی
نہیں رکھتے دریغ اس وقت میں نخچیر سے پانی

گرفتاری پہ میری بسکہ آہن گریہ کرتا ہے
رواں ہوتا ہے چشم حلقۂ زنجیر سے پانی

اگر بیت الصنم میں پردہ تو رخ سے اٹھا دیوے
بہے جوں چشم مردم دیدۂ تصویر سے پانی

مزاج پیر سے سردی کا کھونا سخت مشکل ہے — ملے پر پھر جدا ہوتا ہے کوئی شیر سے پانی
جوں ہی لکھنے لگا کاغذ پہ میں مضمون گریہ کا — ٹپکنے ہی لگا ماہیٔ کاغذ گیر سے پانی
تجھے پانی پلاتے غیر کو شب خواب میں دیکھا — دل اپنا تو ہوا اس خواب کی تعبیر سے پانی
یوں آنسو چاکِ دل سے آتے ہیں بھر بھر کے آنکھوں میں — خیابانوں میں آوے جیسے اک تدبیر سے پانی
وہ اپنا تیر خوں آلودہ جب پانی سے دھوتا ہے — ٹپکتا ہے شہابی ہو کے اس کے تیر سے پانی
دل بگداختہ یوں چھن گیا غربال سینہ سے — بآسانی نکل جاتا ہے جوں کفگیر سے پانی
گلستان شہادت تازہ و ترکیوں نہ ہو جس میں — رواں ہو آبشار چشمہ شمشیر سے پانی

پڑا ہے مصحفی یاں مہرۂ تدبیر ششدر میں
بہت دشوار ہے بازی ہمیں تقدیر سے پانی

۴۱۰

جوں جوں الفت زیادہ ہوتی ہے — دل کی حسرت زیادہ ہوتی ہے
دیکھتا ہوں جو تیری صورت کو — مجھ کو حسرت زیادہ ہوتی ہے
دن بدن بے مروّتی تیری — بے مروّت زیادہ ہوتی ہے
دیکھتا میں نہیں جو تجھ کو ذرا — غم کی شدّت زیادہ ہوتی ہے
دل کو روکے ہوئے ہوں میں تو بھی — ہائے چاہت زیادہ ہوتی ہے
میرے اور تیرے یہ نہیں معلوم — کیوں محبّت زیادہ ہوتی ہے
بڑھ چلا پھر تو، دیکھ کہتا ہوں — غم فرقت، زیادہ ہوتی ہے!
مصحفی وقت شب مری اس کی ق — گرچہ صحبت زیادہ ہوتی ہے

لیک جب اٹھ چلوں ہوں میں واں سے
پھر مصیبت زیادہ ہوتی ہے

۴۱۱

جز نجد کے دیکھی نہ کوئی منزل لیلی — سو بار گیا جی سے ادھر محمل لیلی
ہے ہے وہ ستم کرتی ہے آواز حدی کی — محمل میں ہلا جائے ہے جس سے دل لیلی

جاتا ہے بگولے میں اڑا قالب مجنوں　　تا قافلے میں جا کے وہ ہو شامل لیلی
لیلی ہے اگر حسن کا دریا تو نظر میں　　جز ناز و کرشمہ نہیں کچھ ساحل لیلی
یاں خوں میں تڑپتے ہیں کئی طفل دلبستاں　　مرغ دل مجنوں ہی نہیں بسمل لیلی[1]
سچ عشق[2] میں ہیں عاشق و معشوق برابر　　جو شکل ہے مجنوں کی سو ہے محمل لیلی[3]
اس خاک سے کہتے ہیں بنے پیکر مجنوں　　جو خاک مخمّر تھی بہ آب و گل لیلی
کاسے پہ پڑے اس کے اگر سنگ ہزاروں　　جا دے نہ کسی در پہ کبھو سائل لیلی
ہیں بال جو ٹکڑے پہ پڑے اس کے اٹھا دے　　کب تک یہ سیہ خانہ رہے حائل لیلی

اے مصحفیؔ لیلی ہے اگر قاتل مجنوں
معشوق مرا وہ ہے کہ ہے قاتل لیلیٰ

۴۱۲

نہ ڈر سے شیخ کے جام مل آستیں میں ہے　　برنگ شیشہ یہاں قُلقُل آستیں میں ہے
نہ کر غرور کہ گجرے ہیں میرے ہاتھوں میں　　کہ اشک سرخ سے یاں بھی گل آستیں میں ہے
میں آستیں جو نچوڑوں تو جائے عالم ڈوب　　ہنوز اشک کا دریا کل آستیں میں ہے
اتار سر سے میاں پیرہن کو اپنے شتاب　　کہ مثل مار سیہ کاکل آستیں میں ہے
شب اس کی زلف کو ٹک لگ گیا تھا میرا ہاتھ　　جو دیکھتا ہوں سحر سنبل آستیں میں ہے
چمن میں جا کے زبس دے ہے داد صیادی　　ہر ایک طفل کے اِک بُلبل آستیں میں ہے

نہ مصحفیؔ پہ کرو تہمت تہی دستی
کہ نقد داغ سے اس کے بل آستیں میں ہے

۴۱۳

نہ یہ وہ دل ہے کہ اب جس سے نالہ سر کھینچے　　نہ وہ زمیں ہے جگر جس سے لالہ سر کھینچے
کسی سے ہم نے یہاں سرکشی نہ کی پس قتل　　ہمارے خون کا شاید قبالہ سر کھینچے
لے اپنے ہاتھ میں ساقی اگر تو ساغر لعل　　تو شاخ گل سے نہ گل کا پیالہ سر کھینچے

۱؎ اصل: محمل　　۲؎ اصل: یشخ　　۳؎ اصل: جو شکل ہے مجنوں کی سو ہے محمل لیلی (تصحیح از نسخۂ رام پور)

مری بغل سے تو جاتا ہے اب کہاں نہ ستا — کہ ماہ ہو کے ہم آغوش ہالہ سر کھینچے
اسیرِ زلف میں ہوں اوس غزالِ رعنا کا — نہ جس کے دام سے ہرگز غزالہ سر کھینچے
شہیدِ رنگِ حنا کا ترے جہاں ہو مزار — عجب نہیں ہے اگر واں سے لالہ سر کھینچے
نہ آرسی اسے دکھلاؤ کوئی ڈرتا ہوں — مباد پھر کے وہ مشکیں کلالہ سر کھینچے

کسی کا حق جو کوئی غضب کر کے کھا جاوے
تو مصحفی نہ پچے وہ نوالہ سر کھینچے

۴۱۴

دور رہنا ہی بھلا ہے ہمیں محبوبوں سے — رفتگی خوب نہیں اتنی خوش اسلوبوں سے
بسکہ طومار کے طومار میں لکھ لکھ بھیجے — ہو گیا یار بھی عاجز مرے مکتوبوں سے
تلخ، دشنام تری ہم کو گوارا ہے ولے — جانِ من خوب نہیں بے مزگی خوبوں سے
سیر کو چل تو کہ جھاڑا ہے صبا نے اے گل — صحنِ گلشن پرِ طاؤس کے جاروبوں سے
مددِ بخت نہ ہو اہلِ دُوَل کو جب تک — بازی پاتے ہیں کوئی عقل کے منصوبوں سے
دل دھڑکتا ہے کبھو آنکھ پھڑکتی ہے کبھو — کیونکہ جانبر ہو کوئی عشق کے آشوبوں سے

مصحفی مانگے ہے یارب یہ دعا بعدِ نماز
حشر کے دن نہ اوٹھانا اسے مغضوبوں سے

۴۱۵

گو تم نے مجھے زیست سے بیزار رکھا ہے — پر میں نے تو تم سے ہی سروکار رکھا ہے
میں مارتہِ سنگ ہوں سر کیونکہ اٹھاؤں — کافر کی اداؤں نے مجھے مار رکھا ہے
صیاد کا احساں ہے کہ دیوارِ چمن پر — لا کر قفسِ مرغِ گرفتار رکھا ہے
روتے ہوئے کروٹ میں کبھی لی ہے تو گویا — تکیہ پہ مرے موتیوں کا ہار رکھا ہے
ہو قافلہ راہی تو چلیں گھر میں ہمارے — اسبابِ سفر کرنے کو تیار رکھا ہے
کاوش تو ذرا دیکھیو اس شوخ نے آ کر — تربت پہ مری گل کی جگہ خار رکھا ہے
تو گھر سے جو نکلے تو نماز اس کی پڑھی جائے — عاشق کا جنازہ پسِ دیوار رکھا ہے

مرہم بھی رکھا ہے جو مرے زخم پر اس نے
تو وائے ستم مرہم زنگار رکھا ہے

میں سینہ زنی کی ہے شب ہجر تو برسوں
بیماری دل تو نے مجھے مار رکھا ہے[1]

چاہو سو کرو خواہ جفا خواہ وفا تم
میں آپ کو اس کام میں مختار رکھا ہے

تربت پہ کبھی مصحفی کی چلیے نہ صاحب
نزدیک تمھارا یہ گنہ گار رکھا ہے

۴۱۶

مروت بھی اگر آنکھوں میں اس کی اک ذرا ہوتی
تو نظروں سے مری اس کی نظر خود آشنا ہوتی

گریباں کے تو کر ڈالے ہیں پرزے مثل گل ہے ہے
ذرا ہاتھ اور اٹھ جاتا تو خونیں ہی ہوا ہوتی

نظر مژگاں سے اب آتی نہیں یا ایک دن وہ تھا
کہ اس کے روئے زیبا سے نہ اک ساعت جدا ہوتی

چمن کو دیکھتے ہم کس طرح سرسبز ہوتا پھر
اگر اس گل کے بر میں گل کے بوٹے کی قبا ہوتی

نہ دیتا میں اگر اس شوخ ہرجائی کو دل اپنا
تو کیوں اس بات کی عالم میں شہرت جابجا ہوتی

گلی میں اس کی گر ہم خاک ہو جاتے تو بہتر تھا
موئے پرواں ہماری خاک کی وارث صبا ہوتی

جو لگ چلتی ہمارے خوں کی سرخی اس کے بالوں سے
تو یہ بھی رفتہ رفتہ خوشترا از رنگ حنا ہوتی

نظر آتا نہ اس کو گر یہ تیرا پھول سا مکھڑا
صبا اس طرح کیوں گلشن میں آتش زیر پا ہوتی

خفا ہے ہم سے وہ اے مصحفی اتنا ہی بہتر ہے
غضب تھا اس سے گر اپنی طبیعت بھی خفا ہوتی

۴۱۷

غرض کہ جو حرکت ہے سو دل لبھانے کی
ادائیں کیا کہوں کافر کے منہ پھرانے کی

کہیں ہیں آگ لگی ہے چمن کو بے دردو
خبر تو کوئی لے بلبل کے آشیانے کی

گلہ نہ کیجیے یاروں کی بے وفائی کا
کہ ان دنوں یہی تاثیر ہے زمانے کی

وہ رعشہ مہ میں کہاں ہے جو میں نے جمنا میں
ادائیں دیکھی ہیں کافر کے تھرتھرانے کی

کہاں ہے قافلۂ رفتگان ملک عدم
کوئی تو بات کہو اک ذرا ٹھکانے کی

---

[1] اصل: بیماری دل نے تو مجھے بیمار رکھا ہے

کبھی خوشی نہ کیا مجھ کو آکے قاصد نے کہی جو بات بھی کوئی تو جی کڑھانے کی
کہوں میں کیا مری آنکھوں سے خوں ٹپکتا ہے ادا جب آتی ہے یاد اس کے پان کھانے کی
لگائے اس نے مری قبر پر کل اتنے تیر
کہ مٹّی بھی نہ رہی مصحفی نشانے کی

۴۱۸

تم ہم کو اپنا منھ نہ دکھاؤ تو خوب ہے پردے میں اور چاہ بڑھاؤ تو خوب ہے
مرتے ہیں جو تمھاری اس آواز پر انھیں آواز بھی اگر نہ سناؤ تو خوب ہے
چولی چھپی ہوئی ہے تمھاری تو کیا ہوا دو چار دن اسے نہ سلاؤ تو خوب ہے
اے ساکنانِ کنجِ قفس آئی ہے بہار ایسے میں تم بھی دھوم مچاؤ تو خوب ہے
جھپکی ہے مصحفی کی ابھی آنکھ اک ذرا
تم اس کو اس گھڑی نہ جگاؤ تو خوب ہے

۴۱۹

اس کی چاہت کے گرفتار ہیں ہم بھی سچ ہے دیکھنے کے تو گنہ گار ہیں ہم بھی سچ ہے
کون کہتا ہے نہیں روئے نکو کے خواہاں جنس اچھی کے خریدار ہیں ہم بھی سچ ہے
تہمت حسن پرستی نہیں ہم پر بے جا ہاں ترے طالب دیدار ہیں ہم بھی سچ ہے
غیر ہی تجھ کو نہیں دیکھتے سر کر کے بلند اس ہوس میں پسِ دیوار ہیں ہم بھی سچ ہے
کیا کریں دیکھنے بن رہتی نہیں یہ آنکھیں اپنی آنکھوں سے تو ناچار ہیں ہم بھی سچ ہے
حق تعالیٰ ترے جلووں کو سلامت رکھے ایسے جلووں کے خریدار ہیں ہم بھی سچ ہے
مصحفی گر کوئی مل جائے نصیبوں سے تو ہاں روز و شب طالبِ دیدار ہیں ہم بھی سچ ہے

۴۲۰

کوئی کیا جانے کہ اس عشق میں کیا بنتی ہے دیکھتے دیکھتے ہی جان پر آ بنتی ہے
اب کے سردی میں تو ہو دیں گے بہت لوگ نہال واسطے اس کے مشجّر کی قبا بنتی ہے

اس کی صورت کا وہ عالم ہے کہ سبحان اللہ — کوئی تصویر بایں حسن و صفا بنتی ہے
کس پہ ظالم کی چڑھائی ہے یہ معلوم نہیں — ان دنوں تیر جدی تیغ جدا بنتی ہے
زلف کو اس کی بناتی ہے جو مشاطہ کبھو
مصحفی کہتے ہیں دونی وہ بلا بنتی ہے

۴۲۱

بجلی کی کوند دیکھ اسے منھ چھپا گئی — دل کی تڑپ تو مجھ کو تماشا دکھا گئی
بھیجیں گے ہم بھی گل کو کوئی رقعہ اس کے ہاتھ — اب کی طرف چمن کے، جو بادِ صبا گئی
مت پوچھ اس کی کاٹ کا عالم میں کیا کہوں — نظروں میں کیا کھبی کہ وہ جی میں سما گئی
تصویر تیری دیکھی جو شیریں نے ایک دن — ہے بسکہ باشعور وہ نقشا اڑا گئی
سرو رواں کی اپنے میں تعریف کیا کروں — رفتار اس کی خاک میں مجھ کو ملا گئی
کب اس پری نے وصل کا وعدہ وفا کیا — بالا دکھا کے نت ہمیں بالا دکھا گئی
تو دیکھتے ہی اس کو جو دیوانہ ہو گیا
سچ کہیو مصحفی ترے کیا جی میں آ گئی

۴۲۲

رفتار اس کی دل پہ جو ٹھوکر لگا گئی — یک بار بخت خفتہ کو میرے جگا گئی
میں اس نگاہِ تیز کے صدقے گیا کہ وہ — دل پرزے پرزے کر کے ہوا میں اڑا گئی
دیکھا نہ ہوگا وہ کبھی مانی نے خواب میں — تصویر اس کی مجھ کو جو عالم دکھا گئی
کیا جانے اس کو مرغ سحر خواں نے کیا کہا — آزردہ دل چمن سے جو بادِ صبا گئی
مردہ سا کیا پڑا ہے تو بستر پہ مصحفی
کیوں بولتا نہیں تجھے کیا موت آ گئی

۴۲۳

کب ہاتھ مرا اس کے گریباں کے تلے جائے — سو بار نہ تا سیب زنخداں کے تلے جائے

کیا ایسی نگہ سے کوئی خوش ہووے جو کافر — مژگاں سے جدا ہوتے ہی مژگاں کے تلے جائے
مرغِ دل بسمل شدہ ہے رحم کے قابل — وقتیکہ تڑپھ کر ترے داماں کے تلے جائے
وحشت اسے ہو جائے گر اس فصل میں کوئی — ٹک سایۂ دیوار گلستاں کے تلے جائے
گو جی سے گذر جائے کوئی پر یہ نہ ہوگا — انگشتِ تاسّف تری دنداں کے تلے جائے
ہے عید کا دن دیکھیے آج اس کی گلی میں — کس کس کا گلا خنجرِ براں کے تلے جائے
اس سینۂ مجروح سے ہو کیا کوئی واقف — خوں بہتا ہوا جس کے گریباں کے تلے جائے

اے مصحفی دیکھے نہ وہ شوخ آنکھ اٹھا کر
گر دجلۂ خوں دیدۂ گریاں کے تلے جائے

۴۲۴

جوں جوں دل زخم کھائے جاتا ہے — وہ بھی تیغا لگائے جاتا ہے
مجھ کو پامال کر گیا ہے ابھی — یہ جو دامن اٹھائے جاتا ہے
الم عشق کا برا ہووے — دل مرا بلبلائے جاتا ہے
فتنہ گر تیری چشم کا بیمار — کہتے ہیں دم چرائے جاتا ہے
دن ہوا آخر آفتاب نشاط — ہم سے اب منہ چھپائے جاتا ہے
گرچہ ہم چھک رہے ہیں پھر بھی ہمیں — شوق دارو پلائے جاتا ہے
دیکھیو اس کو دیکھ کر کیسا — مصحفی سٹ پٹائے جاتا ہے

۴۲۵

گاہ مد سرمہ کی کاجل کی کبھی تحریر ہے — عالم ان آنکھوں کا رشکِ عالمِ تصویر ہے
دل جو چاہے ہے تجھے میرا تو پھر میں کیا کروں — تو ہی کر انصاف ایسی کیا مری تقصیر ہے
توڑ جاتا ہے توئی اک پل میں نہ افلاک کی — تو کہے نالہ مرا روئیں کماں کا تیر ہے
گرد ٹوپی کے جو ہے کافر کی یہ گوٹا ٹکا — آہ مت پوچھو مرے حق میں دمِ شمشیر ہے
کیا بلا نازل ہوئی اس دل کو یہ کیا ہو گیا — میں وہی دل بھی وہی پر نالہ بے تاثیر ہے
دیکھیے اس معرکہ میں کس کی ہو فتح و شکست — یاں ہیں اُس کی فکر میں ہوں واں مری تدبیر ہے

کیا ترے زندانیوں کو اس شب آئی خوابِ مرگ
نے صدا شیون کی وہ نے نالۂ زنجیر ہے

اُس کی زلفوں کو میں شب دیکھا ہے سمتِ غیر میں
یارو اس خوابِ پریشاں کی بھی کچھ تعبیر ہے

اس کی باتوں پر لگاؤں کیوں نہ اب جی دوستو
مصحفی ہے اک تو شاعر تس پہ خوش تقریر ہے

۴۲۶

آیا تھا میں سجدے کو ترے شہرِ عدم سے
جوں سایہ اٹھایا نہ کبھی سر کو قدم سے

گو میں نے یہ جانا کہ تو آنے کا نہیں لیک
کر میری تسلی تو ذرا جھوٹی قسم سے

تا سمجھے حقیقت دلِ خوں گشتہ کی میرے
میں نامہ لکھا ہے اسے مرجاں قلم سے

گر چشم تری دیوے ذرا زلف کو پرچک
رو کش ہوا بھی سنبلِ گلزارِ ارم سے

کعبہ کو تو ہم جاتے ہیں پھر کیونکہ پھریں گے
گر لڑ گئی واں آنکھ کسی تازہ صنم سے

سچ پوچھو تو کچھ جسم میں اپنے نہیں باقی
اک بیٹھی ہوئی کھال سی ہم دھونکیں ہیں دم سے

اب مصحفی تو جانے ترا کام مری جان
کی ہم نے تو اپنی سی جو کچھ ہو سکی ہم سے

۴۲۷

ملو ہو غیروں سے اور ہم سے بیوفائی ہے
یہ کون شیوہ ہے کیا رسمِ آشنائی ہے

رہی ہے آرسی آنکھوں سے اس کی آنکھ ملا
ذرا تو دیکھ تو کیا دیدے کی صفائی ہے

اسیر مر گئے لاکھوں قفس کدہ کے قریب
کہا تھا آکے کسی نے بہار آئی ہے

ہزاروں مومن و کافر سجود میں ہیں یہاں
بتوں کے گھر میں جو دیکھا تو اک خدائی ہے

زخویش رفتہ ہوں اتنا کہ کچھ نہیں معلوم
شبِ وصال ہے یہ یا شبِ جدائی ہے

مجال کیا دلِ عاشق میں ہو تصوّرِ غیر
کہ اس نگر میں شہِ حسن کی دہائی ہے

فقط نہ رنگِ کفک نے کیا ہے دل کو خون
بلائے جاں یہ ترا پنجۂ حنائی ہے

بغور دیکھے کوئی مصحفی تو سمجھے سچ
غرورِ حسن میں اک شانِ کبریائی ہے

۴۲۸

یوں ہے نازاں جی سے مجھ کو وہ ستمگر مار کے — جوں کوئی غازی مسلماں خوش ہو کافر مار کے
اک ادا دکھلا کے بھاگے دل پہ نشتر مار کے — اس ادا پر تو میں مر جاؤں گا خنجر مار کے
دوش کیوں لیوے کسی کو وہ ستمگر مار کے — لوگ جب مرتے ہوں اس پر آپ خنجر مار کے
روز کی خارا تراشی تھی بلائے جانستاں — چھٹ گیا فرہاد بس اک تیشہ سر پر مار کے
میری تربت پر گر آنا بھی تو از بہر ثواب — جائیو اے ابر دو چھینٹے معطّر مار کے
چل سکا اس سے نہ جب ہرگز مرے نامے کا بوجھ — رہ گیا آخر کو مرغ نامہ بر پر مار کے
خوش قدوں کی شوخیٔ رفتار میں ہے یہ اثر — بخت خفتہ کو جگا دیتے ہیں ٹھوکر مار کے
آپڑی ہے اب دلوں میں صید دیکھیں ہووے کیا — جان پر کھیلے ہیں ہم اس کا کبوتر مار کے
قصۂ خسرو سے ظاہر ہے کہ وقت زورِ عشق — باپ کو بیٹا سلا رکھے ہے خنجر مار کے
وا نہیں ہوتا کسی کے منھ پہ ہرگز در ترا — یاں جو آتے ہیں چلے جاتے ہیں وے سر مار کے
جب نہ نکلا خوں رگ جاں سے مری فصادِ عشق — منفعل کتنا ہوا نشتر پہ نشتر مار کے
اس کے کوچہ سے منانے آئے تب ہم کو حریف — اُٹھ چلے ہم جب بغل کے بیچ بستر مار کے
چوٹ ہے اس بات کی دل پر کہ تم جاتے رہے — تازیانہ کی طرح زلف معنبر مار کے
عشق کے واسطے سے ٹک نکلی اگر کشتی مری — بیٹھ جاتی ہے وہیں پھر اس میں چکر مار کے

مصحفی کو رات ساقی نے جو دی لاکر شراب
اُٹھ گیا جھنجھلا کے وہ شیشہ پہ ساغر مار کے

۴۲۹

مار ڈالا ہے ادا نے تیری — جی جلایا ہے حنا نے تیری
وقت فرصت کے بھی اے گل مجھ سے — نہ کہی بات صبا نے تیری
کیوں نہ گھوروں کہ بنائی ہے صنم — صورت ایسی ہی خدا نے تیری
گور کے سوتوں کو بیدار کیا — آخر اس جنبش پا نے تیری
ظلم ہے یہ کہ حیا پر میری — نہ کیا خشم حیا نے تیری

نام پایا ہے زمانے میں میاں   بے وفائی میں وفا نے تیری
مصحفی عشق کا اب نام نہ لے
جان رکھی ہے خدا نے تیری

۴۳۰

دیکھ کر صورت تمھاری ہم بہت پر غم ہوئے   برہمی زلفوں کی کیا کم تھی کہ تم برہم ہوئے
حسن نے اس کے بوقت گریہ دی دونی بہار   اشک کے قطرے گل عارض پہ آ شبنم ہوئے
اب لگاتے ہاتھ اس سینے کے تئیں آتی ہے شرم   ہاتھ کس کس کے خدا جانے کہ اب محرم ہوئے
اُٹھ گئے جب بزم سے تم آخر شب مست خواب   عاشقوں نے پھوڑ ڈالے سر بڑے ماتم ہوئے
داغ اس ملنے کا ہے دلبر کہ ہم تم روز وصل   ایک ساعت پاس بیٹھے ایک دم ہمدم ہوئے
ایک عالم پر نہ دیکھا ہم نے اس گلشن کا رنگ   جب تلک گل آنکھ کھولے یاں کئی عالم ہوئے
مصحفی دلی سے نکلے پر گیا سب دل کا چین
تھے جو اوراق اپنی جمعیت کے سب برہم ہوئے

۴۳۱

راہ میں کشتے پڑے ہیں کئی ارمان بھرے   بچ کے چلیو نہ ترا خون سے دامان بھرے
دیدۂ تر کا بتاؤں میں سبب کیا تم کو   بیٹھے بیٹھے یونہیں کچھ آتے ہیں ہر آن بھرے
دیکھ کر کیوں وہ مجھے آنکھ چرا جاتا ہے   مدعی نے نہیں اس گل کے اگر کان بھرے
وہ پر آشوب ہے ہر اشک مری آنکھوں کا   جس کے ہر قطرہ میں ہیں سیکڑوں طوفان بھرے
کشتۂ ناوک مژگاں کی جہاں تربت تھی   اس جگہ نکلے ہیں خوں سے ترے پیکان بھرے
آدمیت جسے کہتے ہیں سو ہے چیز جدی   یوں تو ہر شہر میں ہیں گبر و مسلمان بھرے
مصحفی جس کو سخن کہیے سو وہ بات کہاں
رطب و یابس سے ہیں یوں یاروں کے دیوان بھرے

۴۳۲

مثل آئینہ فقط وہ ہے اور اک حیرت ہے   عاشق بے سر و پا کی بھی عجب صورت ہے

نہیں آتا ہے زیارت کو کبھی واں کوئی
کشتۂ تیغ تغافل کی جہاں تربت ہے

سیکڑوں صحبتیں غائب ہوئیں اس خال کے بیچ
کوئی کیا جانے کہ اس پردے میں کیا صحبت ہے

اک کلی پھول میں سو رنگ دکھاتی ہے بہار
قلم قدرت صانع کی عجب صنعت ہے

اور دو زخم لگا نعش پہ میری قاتل
ہے یہی وقت کرم تجھ میں اگر فرصت ہے

جب تلک تو ہی بلاوے نہ اسے بے ایما
آئینہ سامنے آوے ترے کیا قدرت ہے

کر کے قربان مجھے وہ بت بے دیں بولا
اب تلک آنکھوں میں اس کی نگہ حسرت ہے

مجھ کو اے دوست جو چاہے تو ملادے تجھ سے
میں تو عاجز ہوں پر اللہ میں سب قدرت ہے

عید کا دن ہے کہ آئی ہے قیامت یارب
اس کے کوچے میں جو دیکھا تو عجب کثرت ہے

دیکھیے گلشن ہستی کا تماشا کیوں کر
دیدنی خار تنک اور چشم زدن فرصت ہے

ابر تر خوب ہی رویا تو مری تربت پر
چاہیے یونہیں تجھے تیری یہی رحمت ہے

بے کلی گل کی کلی پر نہ ہو کیوں بلبل کو
کہ نیا عشق ہے یہ اور نئی چاہت ہے

خوبرو دیکھ کے دوڑے ہے یہ اس کے پیچھے
مصحفی دل میں مرے باز کی خاصیت ہے

۳۳۴

چمن ہے، سبزہ ہے، ساقی ہے اور ہوا بھی ہے
جو یار ایسے میں ہووے تو اک مزہ بھی ہے

گئی نہیں عطشِ دل ابھی تو اے ساقی
خبر تو لیجیو گلابی میں کچھ رہا بھی ہے

کیا ہے قتل ہزاروں کو اس نے دزدیدہ
کسی کے خون کا چرچا کہیں ہوا بھی ہے

میں کیونکہ جان نہ دوں اپنی اس کے ہاتھوں پر
ہیں پور پور میں چھلّے تو پھر حنا بھی ہے

تو اس سے آنکھ ملاتی ہے آرسی کیسے
خبر تو لے تری آنکھوں میں کچھ حیا بھی ہے

میں اعتماد کروں کس کی آشنائی پر
کوئی کسی کا زمانے میں آشنا بھی ہے

جواب خط کے لیے کیوں پڑا ہے اے قاصد
کسی کو اس بت کافر نے خط لکھا بھی ہے

ہمیشہ لٹتے ہی دیکھی ہے راہ ملک عدم
کوئی یہاں سے کچھ اسباب لے گیا بھی ہے

نسیم ہی نہیں مرتی ہے تیری زلفوں پر
جو دیکھتا ہوں تو وارفتہ کچھ صبا بھی ہے

دعا لکھی ہے میں نامے میں اس کو لیک بغور
کوئی پڑھے تو دعا بھی ہے مدعا بھی ہے

جواب نامہ تو یک سو رہا یہ پوچھو کوئی
کہ اس کے ہاتھ میں قاصد نے خط دیا بھی ہے

بغور دیکھے جو دیوان مصحفی کو کوئی
تو خود کتاب ہے یہ لیک مرثیا بھی ہے

۴۳۴

ہر ایک قدم پر جو وہاں غش کی جگہ ہے
کوچہ کی ترے خاک بھی غش غش کی جگہ ہے

باندھا ہے جو ترکش کے تئیں تو نے کمر سے
انصاف کرو آپ ہی یہ ترکش کی جگہ ہے

ڈھونڈھو نہ مری آہ کو آتش کی جگہ میں
افلاک پہ اس شعلۂ سرکش کی جگہ ہے

رکھتا ہوں ترے غم کو سدا اوس میں ہیں جانی
ہر چند کہ سینہ مرا آتش کی جگہ ہے

اے دل مرے پہلو سے شب وصل جدا رہ
کس واسطے، یہ اس بت مہ وش کی جگہ ہے

ہرگز دلِ عارف نہ سما جائے کدورت
یہ شیشہ ہمیشہ مئے بے غش کی جگہ ہے

خالی نہیں اے مصحفی یاں رنج سے کوئی
یہ بزم بھی اک طرفہ کشاکش کی جگہ ہے

۴۳۵

دلِ خارا میں مرا نالہ اثر کرتا ہے
لیک سختی سے ترے دل کی حذر کرتا ہے

چشم بد دور ہے واں بے خبری کا عالم
میرے احوال سے کون اس کو خبر کرتا ہے

میں بھی گذرا جو کبھی یاں سے تو کیا قہر ہوا
ایک عالم ترے کوچے سے گذر کرتا ہے

گھر خدا کا تھا یہ دل جس میں وہ بت آکے رہا
یہ نہ سمجھا کہ کوئی گھر میں بھی گھر کرتا ہے

اس کی بالیں پہ ذرا تو بھی تو آ وقت وداع
کہ تری چشم کا بیمار سفر کرتا ہے

دیکھیو دم کشی بلبل بستانی کو
کیا بری طرح شب اپنی یہ سحر کرتا ہے

کیونکہ حیراں نہ رہوں میں کہ تری مجلس میں
جو کوئی آئے ہے مجھ پر ہی نظر کرتا ہے

مصحفی کے تئیں از بسکہ نہیں عقل معاش
گھر میں بیٹھا ہوا اوقات بسر کرتا ہے

۴۳۶

جھپٹے میں آگیا ہے دل اپنا اس پری کے
لاکھوں ہیں یاد جس کو انداز دلبری کے

چاہت نے تیری ہم کو سب کچھ بھلا دیا ہے
کیا لطف میں کٹے ہیں اوقات بے زری کے

اس دل کی ابتری کا میں حال کیا بتاؤں
ہیں ڈھنگ سارے اس میں زلفوں کی ابتری کے

اس رخ سے جو صبا نے پردہ اٹھا دیا تھا
گرتے تھے اشک ٹپ ٹپ شب ماہ و مشتری کے

لطفِ مجسّم اس کا ہے سرو قد و لیکن
اسلوب ہیں سب اس میں پیدا ستمگری کے

اے مصحفی گلی میں کون اس کی پوچھتا ہے
پھرتے ہیں خوار و رسوا واں لاکھوں ہم سری کے

۴۳۷

ہر قدم انداز ہے ہر گام پر اک ناز ہے
ہم عناں اس کے جلو میں ناز اور انداز ہے

جس نے چہرے کی ترے تصویر دیکھی یہ کہا
ہائے اس تصویر کا کیا ہی غضب پرواز ہے

کیا کروں اب باغ میں رہ کر کہ اے گل تجھ بغیر
آشیاں اپنی نظر میں چنگل شہباز ہے

نقش دنیا کی طرح ہم بستر غم پر مدام
ہیں پڑے تنہا نہ کوئی ہمدم ہے نے ہمراز ہے

یار کی آواز خوش نے مار رکھا ہے ہمیں
سچ تو یہ ہے کیا گلا ہے اور کیا آواز ہے

بال و پر ہم وا نہیں کرتے وگرنہ دوستو
فرش سے تا عرش اپنی ایک ہی پرواز ہے

آخر اس طفل کبوتر باز کو دے گا فریب
مصحفی بھی عشق کے فن میں کبوتر باز ہے

۴۳۸

منہ پھرا لینے میں تو بالے بھلا اک ناز ہے
دائیں بائیں دیکھتے جانا یہ کیا انداز ہے

گو کوئی ہووے فدا ان خوبرویوں کے تئیں
کب خیال جان و مال عاشق جانباز ہے

دل تڑپنے جو لگا خنجر تلے بولا وہ شوخ
دیکھیو اس مرغ کو کیا حسرت پرواز ہے

مان کہنے کو مرے امرد پرستوں سے نہ مل
جان چہرے پر ترے خط کا ابھی آغاز ہے

درد یہ کس سے کہوں جا کر کے یارو ان دنوں　　دشمن جاں ہے جو اپنا محرم و ہمراز ہے

مصحفی کی قدر اس مجلس میں اتنی تو نہیں
لیکن اتنا ہے کہ اوروں سے ذرا ممتاز ہے

۴۳۹

یوں قتل غریبوں کا اے شوخ روا کب ہے　　شایاں تری خوبی کے یہ جور و جفا کب ہے
کھل جاویں اگر آنکھیں تو آوے نظر تجھ کو　　وہ شاہد بے پردہ پردے میں چھپا کب ہے
غنچہ ہے سو افسردہ اور گل ہے سو پژمردہ　　گلزار زمانے کی خوش آب و ہوا کب ہے
میں دعوی خوں اس سے کس طرح کروں یارب　　اس کے دم خنجر میں خوں میرا جما کب ہے
کاہے کو کروں شکوہ میں اس کی جدائی کا　　معشوق مرا مجھ سے اے یار جدا کب ہے
خط اس کو ہی دیتے ہم سو یوں بھی نہیں بنتی　　جاوے ترے کوچے میں مقدور صبا کب ہے
اس کی شب ہجراں کا دل مار گزیدہ ہے　　تہمت ہے عبث ان پر زلفوں نے ڈسا کب ہے
خوباں کی جفا پر دل ناچار رکھا ہم نے　　گر ان سے وفا ڈھونڈھیں تو ان میں وفا کب ہے
لوہو کسی بسمل کا ہاتھوں سے لگایا ہے　　قاتل میں نہ مانوں گا یہ رنگ حنا کب ہے
آگو ہی دل اپنے کو کرتا ہوں تسلی میں　　قاصد ابھی اس کو سے خط لے کے پھرا کب ہے
اک عمر ہوئی اس کی مرتا ہے نہ جیتا ہے　　بیمار محبت کی کیا جانئے قضا کب ہے
آئینہ کو تجھ پر سے سو بار کروں صدقے　　آئینے کے چہرہ پر یہ حسن و صفا کب ہے

اے مصحفی ناحق تو کھینچے ہے تعب ناداں
اس درد محبت کی دنیا میں دوا کب ہے

۴۴۰

اے فلک آپ کو اتنا جو پھرایا تو نے　　کوئی معشوق بھی عاشق کو ملایا تو نے
خاک میں مجھ کو مری جان ملایا تو نے　　فائدہ اس میں تو کچھ خاک نہ پایا تو نے
فاتحہ کا بھی تو ممنوں نہیں میں تجھ سے بھلا　　میری تربت پہ کبھی ہاتھ اٹھایا تو نے
میں جو دیوانہ سا جاتا ہوں تو اس کوچے کے　　مجھ کو کہتے ہیں یہ کیا رنگ بنایا تو نے

عید کا چاند تجھے کیونکہ کہوں میں کہ میاں — عید کے دن بھی مجھے منھ نہ دکھایا تو نے
دیکھیے گذرے گا کیا کتنے گریبانوں پر — اب کی جامہ تو بہت تنگ سلایا تو نے
مصحفی حال ترا کچھ نظر آتا ہے تغیر ق — سچ تو کہہ کس سے دل اپنے کو لگایا تو نے
رنگ چہرے کا ترے ہم سے کہے دیتا ہے — عشق چھپتا ہے کوئی گو کہ چھپایا تو نے

۴۴۱

شب وہ ان آنکھوں کو شغل اشکباری دے گئے — لے گئے خواب ان کا اور اختر شماری دے گئے
چلتے چلتے اس ادا سے وعدہ آنے کا کیا — دھر کے ہاتھ اس دل پہ اور اک زخم کاری دے گئے
خواب و خور صبر و سکوں یک بار سب جاتا رہا — بے قرار اپنے کو کیسی بے قراری دے گئے
یہ خبر تو نے سنی ہو گی کہ اس کوچے میں رات — داد رونے کی ہم اے ابر بہاری دے گئے
آپ جا بیٹھے کسی منزل پہ ہو ساقی امیر[1] (کذا) — اور ویار دل کی غم کو فوجداری دے گئے
گر کہیں آیا نظر ان کو کوئی ماٹی کا ڈھیر — گالیاں اس کو سمجھ تربت ہماری دے گئے
آپ تو جاتے رہے باتیں بنا اور مجھ کو آہ — بے قراری بیخودی بے اختیاری دے گئے

گر ہوا عزم سفر ان کا سحر پر مصحفی
وقت شام آکر مجھے اپنی کٹاری دے گئے

۴۴۲

خطرہ ہے مجھے اس دل کم بخت کی خو سے — ڈرتا ہوں کہ ہو جائے محبت نہ کسو سے
دم تیرے مریضوں کا ٹھہرتا نہیں کافر — جانوں پہ بنی ہے ترے تعویذ گلو سے
یہ خوں نہیں آتش ہے مبادا بھڑک اٹھے — دامن کو بچانا تو ذرا میرے لہو سے
کیا باغ میں آیا تھا صبا وہ اگری پوش — جو اب تئیں مہکے ہے چمن عطر کی بو سے
ٹک غمزۂ خوں ریز کو سمجھا کہ ہمیشہ — اک کشتہ نیا نکلے ہے قاتل ترے کو سے
چل سوزن تدبیر کو لے جا تو مسیحا — یہ زخم سمٹنے کے نہیں تیرے رفو سے
سر کعبہ نشیں مارے ہیں دیوار سے اب تک — اک روز کہیں پردہ اٹھا تھا ترے رو سے
جب سر کھلے وہ سامنے آجائے ہے میرے — جی الجھے ہے کافر کی پریشانی مو سے

[1] کذا فی الاصل۔ نیز رام پور نسخہ ۲: آپ جا سی کے منزل میں پہ ہوتا تھا بی امیر

ساقی کا مرے حال پہ گریہ ہے تغافل
سر اپنا میں دے ماروں گا اک روز سبو سے

اے آئینے ہوتا ہے تو اس رو سے مقابل
چل دور خبر لے کہیں اپنی اسی رو سے

اے مصحفی کرتا ہے تو کیوں زخم کا شکوہ
تجھ کو بھی تو اک لاگ ہے اس عربدہ جو سے

۴۴۳

چہرے سے مرے ہمدم زلف اس کی اکڑتی ہے
جوں جوں میں بناؤں ہوں وہ زور بگڑتی ہے

طول شب ہجراں کو ہر چند بیاں کیجے
نے رات نبڑتی ہے نے بات نبڑتی ہے

گو حسن پرستی کا انکار تو کرتا ہے
آئینے سے پر تیری کچھ آنکھ تو لڑتی ہے

رخ یار کی مژگاں نے شاید کہ کیا ادھر
کچھ کل سے کلیجے میں اک بھال سی گڑتی ہے

گو شیخ جی نت اپنی داڑھی کو کریں شانہ
ناحق کی یہ شیخی ہے کیا ان سے اکھڑتی ہے

حجت مری بلبل کی گلشن میں کوئی دیکھے
میں اس سے جھگڑتا ہوں وہ مجھ سے جھگڑتی ہے

احوال ہے جو تیرا اس سے نہیں گھبرانا
انساں پہ مصیبت بھی اے مصحفی پڑتی ہے

۴۴۴

طاق پر خوشۂ انگور دھرا رہتا ہے
یاں علاج دل رنجور دھرا رہتا ہے

تو جو ہوتا نہیں ساقی تو مری مجلس میں
سامنے شیشۂ مئے دور دھرا رہتا ہے

بخت اسے کہتے ہیں تکیہ پہ مرے یاروں کے
نت سر ساقیٔ مخمور دھرا رہتا ہے

مدعی کر نہ تو مقدور کا اپنے دعویٰ
جب حریف آئے ہے مقدور دھرا رہتا ہے

مقتل عشق میں فہمیدہ قدم رکھ ناداں
دار پر یاں سر منصور دھرا رہتا ہے

ذکر آجائے ہے جس جا کہ مری وحشت کا
قیس کا واں سر پر شور دھرا رہتا ہے

مصحفی آئینہ اس ناوک مژگاں کے حضور
صورت خانہ زنبور دھرا رہتا ہے

۴۴۵

ہر ایک بال وہ جس کے تئیں کمر نہ لگے   خدا کرے کہ ترے بالوں کو نظر نہ لگے
شب فراق کی ایسی ہی ہے ڈراونی رات   اکیلے گھر میں بھلا مجھ کو کیونکہ ڈر نہ لگے
قفس سے تازہ میں آیا ہوں کیا عجب اس کا   چمن میں موسم گل جی مرا اگر نہ لگے
جو لے چلا ہے مرے خط کو تو تو ہے مختار   پر اتنا کیجو تجھے دیر نامہ بر نہ لگے
خیال دل میں سمایا ہے مانگ کا اس کی   عجب نہیں جو مری آنکھ تا سحر نہ لگے
اگرچہ تشنۂ خوں ہے، وہ پُر نزاکت دست   یہ چاہے ہے کہ مرے زخم کارگر نہ لگے

لگائے تیغ تو بہر ثواب عید کے دن
جو مصحفی کے گلے سے وہ سیم بر نہ لگے

۴۴۶

جو تھے سننے والے اس آہ حزیں کے   میاں پہلے دشمن ہوئے تم انھیں کے
خدا کی قسم ہے کیا گر میں نالہ   گزر جائے گا پار عرش بریں کے
ذرا آنکھ اٹھا کر اِدھر دیکھ تو بھی   میں صدقے تری نرگس شرمگیں کے
معلم نے چھڑیاں لگائیں کہ چھڑیاں   الف دیکھیو اس تن نازنیں کے
انھیں دسترس اتنی کب ہے کہ ہوتے   مرے اشک تکمے تری آستیں کے
ہنسو ہو مری بات پر کھل کھلا کر   بڑے ہنسنے والے تم آئے کہیں کے

تری طبع کو مصحفی آفریں ہے
کہ دل چسپ ہیں شعر سب اس زمیں کے

۴۴۷

کوئی ایسا نہیں ملتا کہ ہم کو ہم سے لے جاوے   دکھا دے اور عالم اور اس عالم سے لے جاوے
کوئی اس وقت میں جراح ایسا بھیج دے یارب   کہ میرے گھاؤ زخموں کے الم مرہم سے لے جاوے
تمھارے دست نازک کا بھروسا یہ نہ تھا مجھ کو   کہ میرا کاٹ کر سر خنجر بے دم سے لے جاوے

مرے آگے سے جانے کا نہیں غم میں یہ چاہوں ہوں — کہ محرم تجھ کو پنہاں کر کے نامحرم سے لے جاوے
جو وہ خورشید رو آوے سحر سیر گلستاں کو — لطافت حسن و رنگینیٔ گل و شبنم سے لے جاوے
نئے قلیاں تلک کھانے کو اپنے منہ پسارے ہے — بسر کیا اس زمانے میں کوئی ہمدم سے لے جاوے

غم دوری کے ہم بندہ ہیں کہیئے آفریں اس کو
سلامت جان و دل گر مصحفیؔ اس غم سے لے جاوے

۴۴۸

ہم تجھ سے جدا ہوتے ہی آنکھوں کو سئیں گے — جب تو ہی نہ ہوگا تو کسے دیکھ جئیں گے
غیروں کے گلے پر تری تلوار چلے گی — ہم سامنے بیٹھے لہو کے گھونٹ پئیں گے

ترکیب بند مسدّس

اے کہ صورت میں بنایا تجھے حق نے جوں ماہ — کیوں نہ دیکھے سے ترے ہووے فزوں نور نگاہ
اس کا مذکور ہے کیا قصہ یوسف در چاہ — وصف کیجیے تو ترے حسن کے سبحان اللہ

گر بروے تو زلیخا مژۂ وا می کرد
انچہ در خواب ندیدہ است تماشا می کرد

پر عجب یہ ہے کہ کچھ تجھ کو نہیں اپنی خبر — میری آنکھوں سے نہیں تجھ پہ پڑی تیری نظر
اس صفائی و صباحت پہ ہے اے رشک قمر — حسن تیرا نہیں کرتا ہے ترے دل میں اثر

ہر نفس آئنہ می بینی و رو می تابی
بندہ دارم عجب از تو کہ عجب در خوابی

ہے زبس جان مری تیرا تو بر تو — دل کو زلفوں میں تری رکھتے ہیں زہاد گرو
تجھ تلک آ کے میں پہنچا تو ہوں باصد تگ و دو — بے وفائی کو تری میں بھی ذرا دیکھوں تو

چارۂ کار من و دل بتوانی تا چند
حال من بشنوی و باز ندانی تا چند

جب سے پھینکی ہے تری کاکلِ مشکیں نے کمند   رہ گیا ہے یہ مرا آہوے دل کر کے زقند
اسی باعث ہے مرے عزم کا گھوڑا جا بند   مجھ سے یہ فعل عمل میں نہیں آتا ہر چند

ہر شب اندیشہ دیگر کنم و راے دگر
کہ من از دست تو فردا بروم جاے دگر

حال اپنا مجھے ہر دم بتر آتا ہے نظر   اب یہ ڈر ہے کہ نہ ہو جائے کہیں اس سے بتر
بستر غم پہ پڑا رہتا ہوں با دیدۂ تر   غم فرقت میں غرض روز و شب و شام و سحر

سوز دم سینہ و دل تا کہ مرا جانی ہست
عشق بیدرد عجب آتش سوزانی ہست

ابھرا پھرتا ہے تو واں کوچہ و بازار کے بیچ   یاں رمق بھی نہیں باقی ترے بیمار کے بیچ
جان کھپی جاتی ہے یہاں اپنی اس آزار کے بیچ   بیقرارانہ تری حسرت دیدار کے بیچ

شب کہ دل در گرو یک نفس دیگر بود
ہر نگاہم نفس باز پس دیگر بود

حسرت آلودہ بھری ہے مری آنکھوں میں نگاہ   نہ تو ہے نالے کی قوت نہ رہی طاقت آہ
حالت نزع تو ہو چکا ہوں میں اے غیرت ماہ   میرے احوال سے اب تک بھی نہیں تو آگاہ

چند گوی کہ ترا در دل حاصل چیست
در دل من ہوس تست ترا در دل چیست

پوچھ مت حال مرا اے صنم بے پروا   حال ہو جائے گا تیرا متغیر بخدا
دل جفاؤں سے تری بسکہ بھرا ہے میرا   غیر اس کے نہیں کچھ میرے تئیں بن آیا

باز خواہم گلہ از جور تو بنیاد کنم
زیر دیوار تو بنشینم و فریاد کنم

بھیجتا ہے تو ہر اک شخص کو پیغام و سلام   میری قسمت میں نہیں لب سے ترے یک دشنام
آخرش عشق میں تیرے میں ہوا ہوں بدنام   قحط قاصد کا نہیں اس سے تو مت رکھنا کام

از تو دشنام و عتابے چہ شود گر برسد
یا سلامے بجوابے چہ شود گر برسد

ہیں جفاؤں کے تری شہر میں آثار عیاں   ایسی خوں ریزی سے مانگیں ہیں ملائک بھی اماں

نہ فقط میں ہی پڑا خون میں تڑپوں ہوں میاں — جس طرف دیکھے کوئی نیک و بد پیر و جواں

تا ز مژگانِ تو شوری بجہاں افتادہ است
ستے بر سر ہر کوچہ طپاں افتادہ است

ڈر مری جان بتا دے مجھے کس کا ہے تجھے — دیر کرنی غرض اس امر میں بے جا ہے تجھے
تیغ خوش آب کی بیہودہ تمنّا ہے تجھے — قتل کرنے کا مجھے کچھ جو ارادہ ہے تجھے

سر من قابل شمشیر ستم ہست بیا
آب در خنجر مژگان تو کم ہست بیا

ہے نظر بند مری دیدۂ قربانی میں — تو نے جوں آئینہ رکھا مجھے حیرانی میں
ڈھونڈھوں جمعیتِ دل کیونکہ پریشانی میں — اب تلک چین پڑی ہے تری پیشانی میں

از من خستہ تو بیزاری و من می دانم
سر آزار دلم داری و من می دانم

گئی برباد ترے عشق میں سب دانائی — دے کے دل تجھ کو ہیں مشہور ہوا سودائی
تس پہ ہوں وصل سے محروم رہی رسوائی — تو پھر اس پر بھی میاں از رہ بے پروائی

شاد کے گردم اگر درد دلم گوش کنی
نشنوی بہ کہ کنی گوش و فراموش کنی

بسکہ صانع نے بنایا ہے تجھے رشکِ چمن — گل سے عارض ترے بہتر ہیں تو غنچے سے دہن
نازکی ختم ہوئی تجھ پہ بس اے سیم بدن — نرم اندام تو آیا ہے کہ جوں شاخ سمن

ہمہ اعضائے تو نازک بود الّا دل تو
ماندہ سنگے دم ایجاد مگر در گلِ تو

چشم بد دور ہے کچھ اور ہی عالم تیرا — سچ ہے اے جان مری تجھ کو مری کیا پروا
حال درماندگی اپنی کا کہوں ملے میں کیا — کھو کے دل اپنا سر راہ ہیں تیری بیٹھا

زار می گریم و از دل خبرے پیدا نیست
وہ کہ از گم شدۂ من اثری پیدا نیست

ہم تو پھرتے ہیں تجھے ڈھونڈھتے اے زہرہ جبیں — دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں
لیک ہم لوگوں کی پرواہ ہے کب تیرے تئیں — درمندوں میں تو اپنے ہمیں گنتا ہی نہیں

چند شرح طلب و حرف تمنا گویم
باکہ باشم کہ بر روے تو آنہا گویم

کیا ہوا ہم سے کہ وہ راتوں کا ملنا چھوٹا — کر دیا گردش گیتی نے ہمیں تجھ سے جدا
گو ترے پاس نہ اب بیٹھنے پاویں تنہا — تو سلامت رہے کچھ اس کا نہیں اندیشا

گر نہ بنیم بخلوت رخ چوں ماہ ترا
کسی از ما نہ گرفتہ است سر راہ ترا

غیر کے ساتھ جلانے تو مجھے آیا ہے — میں بھی جانوں ہوں کڑھانے تو مجھے آیا ہے
ایلچی بن کے ستانے تو مجھے آیا ہے — واہ کیا خوب منانے تو مجھے آیا ہے

خیز و دیگر منشیں فتنہ میگیز و برو
خویش رامی کشم از دست تو برخیز و برو

میں یہ جانا کہ بہت پختہ ہوے جور و ستم — تنگ آیا ہے تو اب تجھ میں نہیں تاب الم
زندگانی میں تری اور ہے باقی کوئی دم — کوچہ یار میں تنہا ہوا با صورت غم

چند بر سر زانو نہی اے دل برخیز
انیک انیک بسرت آمدہ قاتل برخیز

تھا تصور کا میں اس شوخ کے جو دامن گیر — دل سے آتی ہے بصد رنگ زباں پر تقریر
روبرو ہے مری آنکھوں کے اسی کی تصویر — دیکھتا کیا ہوں میں ایسے میں کہ وہ ماہ منیر

زلف آشفتہ و مے کردہ و خنداں لب مست
نیم شب بر سر بالین من آمد و نشست

شب کی صحبت کا کہوں یارو میں اب کیا احوال — اب تلک ہے اسی صحبت کا مرے دل پہ ملال
وصل کو اس کے سمجھتا تھا میں ہر چند محال — پر میسر جو ہوا خواب تھا وہ یا کہ خیال

دست شوقے نکشیدیم کہ یار از در رفت
گل مقصود نچیدیم و بہار از در رفت

پس دیوار میں اب اس کے جو جا کرتا ہوں — طرف غرفہ و روزن ہی تکا کرتا ہوں
اپنی خواری پہ نظر پھر جو ذرا کرتا ہوں — بھر کے اک آہ یہی شعر پڑھا کرتا ہوں

یاد روزیکہ دلم طالب دیدار نبود
منتّے برسرشں از سایہ دیوار نبود

میں تو خواہندہ نہ تھا حشمتِ کاؤسی کا　　تھا مجھے فکر سدا اس سے ہی محبوسی کا
رہ گیا شوق سو وہ دل میں قدم بوسی کا　　ہم نشیں پوچھ نہ قصّہ مری مایوسی کا

از در دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

ہوں ازیں پیش تو میں عاشق رسوا مشہور　　یار کرتے ہیں ہر ایک بزم میں میرا مذکور
ہو چکا کب سے سو یہ شیشۂ دل چکنا چور　　مجھ کو ان باتوں کے سننے کا نہیں اب مقدور

دوستاں از سخن عشق کبابم مکنید
مکنید ایں سخن و خانہ خرابم مکنید

ہم دل آرزوؤں کو کیا سیر چمن سے سروکار　　گو بہ صد رنگ وہ گھر پھولے پھلے یہ گلزار
فائدہ کیا ہے جو تم کرتے ہو اس سے اصرار　　مگر اس بات سے واقف نہیں ایّام بہار

عہد کردیم کہ بے دوست بہ صحرا نہ رویم
بے تماشہ گہہ رویش بہ تماشا نہ رویم

دل دیوانہ نہ سمجھا مرے سمجھانے سے　　فیض پایا نہ کچھ اپنے سے نہ بیگانے سے
آیا میں شہر میں نومید ہو ویرانے سے　　مصحفی کچھ نہ ہوا کعبہ و بت خانے سے

حالیا مصلحت خویش در آں می بینم
کہ کشم رخت بہ میخانہ و خوش بنشینم

ترجیع بند مسدّس

بخت نے اس کی مدد تو کی تھی اے رشک بہار　　پر کرے کیا تو جو ہو جاوے وہی بے اختیار
دیکھ تو لے اس کی دست اندازی بوس و کنار　　گھر کے جانے کی اسے تکلیف کی جب بار بار

رات تجھ کو مصحفی جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پاؤں تلک تیری بلائیں دے گیا

شوق نے آ کر کیا تھا سر پہ اس کے جو ہجوم　　دست و ساعد رو و مو لیتا تھا تیرے چوم چوم

بوسہ بازی کی مچادی تھی جو دیوانے نے دھوم   اتنے میں تو درمیاں لایا جو رنجش کا رسوم

رات تجھ کو مصحفیؔ جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پانْو تلک تیری بلائیں لے گیا

حال پر اس کے ہوئی تھی لطف کی تیری نظر   ورنہ بخت ایسے کہاں رکھتا تھا یہ خستہ جگر
لیک گستاخی لگا کرنے وہ جب ہو کر نڈر   اور لگا رخ پر ترے آنے خجالت کا اثر

رات تجھ کو مصحفیؔ جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پانْو تلک تیری بلائیں لے گیا

ہاتھ اس کا جب گیا تھا تیرے بیروں آستیں   شرم کے مارے رکھی تھی تو نے زانو پر جبیں
تھی مقدر لیک نومیدی ہی جو اس کے تئیں   آخرش بے خوابی سے اپنی ہی ہو کر شرمگیں

رات تجھ کو مصحفیؔ جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پانْو تلک تیری بلائیں لے گیا

جب کہ پھرتا تھا بدن پر تیرے پیار سے اس کا ہاتھ   تھرتھراتی تھی پڑی جوں موج دریا تیری گات
بے یقینی کی دے تجھ سے کہوں کیا اس کی بات   یک دگر کی کشمکش ہی میں جو آئی آدھی رات

رات تجھ کو مصحفیؔ جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پانْو تلک تیری بلائیں لے گیا

گرچہ وہ مہماں ترا تھا اور تو مہماں دار تھا   کام دل اپنے نہ اس کے آپ تو نیارہ تھا
لیک جوشِ شوق سے وہ بھی جو حد ناچار تھا   اور بہت رہنے میں اس کے تیرے تئیں آزار تھا

رات تجھ کو مصحفیؔ جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پانْو تلک تیری بلائیں لے گیا

تو جو اس کے سامنے بیٹھا تھا اے رشکِ بہار   دل میں اسکے ہجر کے سالے کھُبے تھے خار خار
لیک جب رنجش پہ ٹھہرا صحبت شب کا مدار   چارپائی سے اُترا اور بھر کے آہ شعلہ بار

رات تجھ کو مصحفیؔ جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پانْو تلک تیری بلائیں لے گیا

دوش پر اس کے پڑا تھا پرتو خورشید وصل   کر کے آیا تھا وہ اپنے دل میں ہی امید وصل
کر گئی پہلو تہی شب اس سے جب ناہید وصل   ہو گئی تجھ سے جبین عاقبت نومید وصل

رات تجھ کو مصحفی جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پاؤں تلک تیری بلائیں لے گیا

یک بہ یک اس نے اٹھا کر پردۂ شرم و حیا   جو نہ کہنا تھا ترے کانوں میں وہ جھک جھک کہا
باوجود ایسی مروّت کے تو اے نازک ادا   یاس سے اس کی خفا ہو کر کے جس دم اٹھ گیا
رات تجھ کو مصحفی جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پاؤں تلک تیری بلائیں لے گیا

اس نے چاہا تھا رہوں گا رات ساری تیرے پاس   کر دیا تھا شوق مشتاقی نے اس کو بے حواس
ڈر سے بدنامی کے پر تو نے جو رکھا اس کا پاس   دیکھ کر مرضی تیری اور وصل سے ہو کر نراس
رات تجھ کو مصحفی جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پاؤں تلک تیری بلائیں لے گیا

ترجیع بند

تقصیر ہوئی مجھ سے جو میں نے تجھے چاہا   یا اپنی زباں سے تری خوبی کو سراہا
نکلے کسی صورت تو ترے دل کی اُپاہا   مقدور زیادہ تو نہیں جلوہ پناہا
لگ جا تو گلے ہی سے میرے اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں تیرے اور نہیں تو

آ شوق میں ہاتھ اپنا چلایا جو میں تجھ پر   جوں پنجۂ شاہیں وہ گرا سینہ کے اوپر
لیکن نہ ہوا وصل ترا اس کو میسّر   آ جانے دے اس بات کو اب پیار سے آ کر
لگ جا تو گلے ہی سے میرے اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں تیرے اور نہیں تو

کیا لطف رہے دل کی ہوس دل ہی میں میرے   حیرت زدہ بیٹھا رہوں میں سامنے تیرے
آخر تو میں آتا ہوں دو وقتی ترے ڈیرے   جس وقت کہ جانا ہو تیرا سانجھ سویرے
لگ جا تو گلے ہی سے میرے اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں تیرے اور نہیں تو

کب تک میں دل اپنے ہی میں کھا کھا کے رہوں جوش   جوں غنچہ رہیں ڈر سے ترے لب میرے خاموش

آخر تو کیا ہے مجھے مدھ نے تیرے مدہوش   اے راحت جاں جوں مہ نو کھول کے آغوش
لگ جا تو گلے ہی سے مرے اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

میں غم زدہ ڈر سے ترے پاتا نہیں قابو   اے مست مے عشق تری نرگس جادو
ہو گو کہ خجالت سے عرق جلوہ فزا رو   صدقے میں تری شرم کے ہاں اے بت خوشخو
لگ جا تو گلے ہی سے مرے اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

حیرت زدہ ہوں دیکھ کے صورت کو میں تیری   ہوتی نہیں دیدار سے تیرے مجھے سیری
میں ہاتھ لگاؤں تجھے طاقت نہیں میری   از بہر خدا تو بھی ٹک اک کر کے دلیری
لگ جا تو گلے ہی سے مرے اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

چھاتی پہ نہ رکھ دست رد ارباب وفا کے   یک بار نکل تو کہیں پردہ سے حیا کے
کیا دیر میں ہے فائدہ سو کام خدا کے   انگڑائیاں لیتا ہوا مجھ پاس ٹک آ کے
لگ جا تو گلے ہی سے مرے اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

وہ دل کہ کیا تیری طرف سے میں اسے صاف   سینے میں دبا جائے ہے جوں پنبۂ نداف
جس وقت کھلا دیکھوں ہوں تیرا شکم صاف   گذرے ہے غضب مجھ پہ صنم از رہ الطاف
لگ جا تو گلے ہی سے مرے اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

تا چند رہوں منتظر لطف نمایاں   کر حرف نوازش سے ذرا وا لب خنداں
تا خانہ ترا مجھ پہ نہ ہو صورت زنداں   ہے یہ بھی کوئی جائے حیا اے بت ناداں
لگ جا تو گلے ہی سے مرے اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

تو ہی مجھے کھولے تو کھلوں ورنہ میں غمناک   ہوں زخم جدائی سے ترے با دل صد چاک
کیا جانیے پھر کیا کرے یہ گردش افلاک   فرصت یہ غنیمت ہے کوئی دم بت چالاک

لگ جا تو گلے ہی سے مرے اور نہیں تو

لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

جس دن سے ہوا ہے وہ ترے حسن پہ مائل   سمجھے ہے صنم اپنے تئیں عاشق بیدل
دیکھا تو سوا شرم کے کوئی نہیں حائل   اس واسطے ہے مصحفی اس شعر کا قائل

لگ جا تو گلے ہی سے مرے اور نہیں تو

لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

مثمن ترکیب بند

اگرچہ تجھ سا زمانے میں کیا نہیں کوئی   پہ غور کیجے تو صبر آزما نہیں کوئی
بایں کرشمہ و ناز و ادا نہیں کوئی   ہزار نقشے میں ایسا بنا نہیں کوئی
تو ہی ہے بہتریں صنع خدا نہیں کوئی   تری شبیہہ میاں دوسرا نہیں کوئی

بصورت تو بتے کمتر آفریدہ خدا

ترا کشیدہ و دست از قلم کشیدہ خدا

ترے جمال میں ہے چشم عقل کل حیراں   مقرباں جناب خدا ہیں سب نگراں
یہ حسن اور یہ لطافت ہر اک بشر میں کہاں   میں تجھ پہ ہوں نہ بھلا کس طرح بلا گرداں
دیا ہے دل تجھے بس یک نگہ میں میں نے میاں   بیاں میں کیا کروں خوبی تری ہے سب پہ عیاں

چو حید بر سر تو کہکشاں نمی بینم

بصورت تو مہ آسماں نمی بینم

تری ہر ایک ادا گرچہ تیغ قاتل ہے   دل طپیدہ بھی پہلو میں رشک بسمل ہے
یہی تو مجھ کو تری دوستی سے حاصل ہے   میں سر کو پیٹکوں ہوں حسرت سے غیر واصل ہے
مرے کہے میں نہیں یہ میں کیا کروں دل ہے   غرض کہ مجھ کو تو اب ہر طرح سے مشکل ہے

نہ با تو دست ہوس در کمر تواں کردن

نہ آرزوے تو از سر بدر تواں کردن

خبر ہے تجھ کو بھی کچھ اے ستمگر خوں خوار   کہ کھینچتا ہوں میں کس کس طرح کا اب آزار
نہ صبر دل میں ہے میرے نہ جان میں ہے قرار   بنی ہے شکل مری جیسے صورت دیوار

میں حال اپنا بھلا تجھ سے کیا کروں اظہار   ملا نہ اب کے بھی تو یاں تلک کہ آخر کار

جدائی تو بلا کم در اشتیاق تو کرد
تو با من آنچہ نہ کردی غم فراق تو کرد

پھرا کرے ہے تو گلیوں میں پی کے مے دن رات   کٹے ہے اہل خرابات میں تری اوقات
کسی کی خاک نہیں تجھ کو فکر موت و حیات   تری بلا سے کوئی گو ہو مورد آفات
زباں سے نکلی مری آمد سخن ایک بات   وگرنہ میں ترے حق میں کہوں گا کچھ ہیہات

خدا بہ شکوہ زبان من آشنا نہ کند
من و شکایت و انگہ ز تو جدا نہ کند

کوئی ادھر طرف کی انگلی کے جاتا ہے   جو دیکھتا ہوئی کوئی اس طرف سے آتا ہے
کوئی دکھائے ہے جی کوئی دل لگاتا ہے   کوئی اشارہ کرے ہے کوئی بلاتا ہے
غرض کہ ہر کوئی اب داد تجھ سے پاتا ہے   بھلا تو ایک مجھی کو سدا ستاتا ہے

ز ہر طرف نگرم می رسد خریدارے
بود بہ کوے تو ہر روز روز بازارے

اگرچہ اتنا تو زیں پیش تو نہ تھا ظالم   کچھ ان دنوں ہی میں بے طرح ہو گیا ظالم
جو ظلم ہو سکے کر مجھ پہ تو بھلا ظالم   رکھا ہے نام ترا میں نے آشنا ظالم
نکال تیغ جفا اور مرے لگا ظالم   جفا و جور سے تو ہاتھ مت اٹھا ظالم

ہنوز صبر ازیں بے قراری آید
ہنوز از دل افسردہ کار می آید

کہاں تلک میں کروں اپنے بخت کا شکوا   میں اس کے ہاتھ سے ہے ہے ستم سہے کیا کیا
کبھی تو زہر میں کھایا کبھی کوئیں میں گرا   یہ باتیں ہو چکیں سب اب نہ پوچھ حال مرا
تو اس کے کوچے میں با حال خستہ ہوں بیٹھا   پہ یہ بھی اس سے تو جا کر کوئی نہیں کہتا

فتادہ بر سر کوے تو ناتوانے ہست
رسیدہ بر لبش از ضعف نیم جانے ہست

مثنوی گرما

کیا کہوں سوزش ہوائے تموز — ان دنوں ہے ہوا بھی طاقت سوز
سردی عالم سے کر گئی ہے کنار — موسم گل ہے اور شروع بہار
حوت میں آفتاب آیا ہے — مرغ و ماہی کے تئیں جلایا ہے
مارے گرمی کے سائے جلتے ہیں — اس ہوا میں درخت پھلتے ہیں
پھول سارے گئے ہیں یوں مرجھائے — بھو کے پیاسے کا جیسے منہ ست جائے
ان دنوں باغ بھوت خانہ ہے — سرت و باروت کا خزانا ہے
آتش گل زبس کہ ہے سرکش — اوس پہ لالہ ہوا ہے میر آتش
ہیں صنوبر کے تار شمع کے تار — سرو آتش فشاں ہے مثل چنار
وہ جو دست چنار بالا ہے — سو وہ آتش کا پنج شاخا ہے
دانۂ نار سب ہیں چنگاری — آگ کے پھولوں کی ہے گلکاری
گل سے جو تمتما رہے ہیں گال — دال ہے تب پہ اس کا چہرہ لال
شاخ نرگس نے قد کیا ہے علم — بن دیئے آگ چھوٹے ہے یہ قلم
کیا عجب شملہ بن گئے ہیں قبول — ہووے گلدستہ ہاتھ میں جو پھول
ٹٹیاں ہیں جو خشک اور کڑیاں — آگ دیجے تو چھوٹیں جوں بڑیاں
بس کہ طبع ہوا ہے آتش بیز — شاخ گل تک چمن میں ہے گلریز
جا پڑے ہیں ادھر ادھر یک بار — پتے پھولوں کے اڑ کے مثل شرار
کوئی طاؤس ہے جو یاں دلکش — ہے وہ طاؤس بازی آتش
سیخ کی شکل سرو دلجو ہے — اوس پہ قمری کباب کو کو ہے
کوئی تنکا جو اوڑ کے گل پہ پڑا — جل اوٹھا وہ دیا سلائی سا
شعلہ جاروب صحن گلشن ہے — جس سے خالی چمن کا آنگن ہے
خشک و تر سب نہال جلتے ہیں — کف افسوس جیسے ملتے ہیں
جیسے گلخن کی ہووے گرم رماد — سائے جلتے ہیں دھوپ سے بھی زیاد
پھول کے سائے میں جو جا بیٹھے — کود کر دھوپ میں پھر آ بیٹھے

پانْو سائے پہ جو رکھے ناگاہ　　کاٹ کھاوے وہ مثل مار سیاہ
ہیں سلیں پتھروں کی گرم تمام　　جن پہ پا سے نگہ کرے نہ قیام
پھول کھاوے جو مرغ آتش خوار　　شکل گل گیر اوس کی ہو منقار
آگ پانْو سے جو بجھاتے ہیں　　دیکھ پھولوں کو جی چھپاتے ہیں
جعفری نے دیا ہے جلوہ روز　　گل سوری بنا ہے شب افروز
شب کو ماہ فلک میں ہے وہ تاب　　جیسے روشن کرے کوئی مہتاب
لگتے ہیں آسماں پہ یوں تارے　　دگہہ ڈگاتے ہیں جیسے انگارے
سبز طائر ہو جل کے کیوں نہ کباب　　بان سا چھوٹتا ہے تیر شہاب
شفق شام کی جو ہے تحریر　　برق ہے آسماں کی دامن گیر
وے جو صحرا میں ہیں وحوش و طیور　　گرمی نے ان سے بھی لیا ہے قصور
گینڈے ڈھابوں سے کود ہانپتے ہیں　　شیر گرمی کے مارے بھاگتے ہیں
مرغ آتے ہیں گھونسلوں سے نکل　　کہ بسیرے میں آ گیا ہے خلل
باغ بے آب و خشک ہیں تالاب　　دیکھتے ہیں زمین سبزہ بخواب
نت کوئیں پر چرس پڑے ہیں چھوٹ　　کہ کنوؤں کے گئے ہیں پانی ٹوٹ
قد آدم جنھوں میں تھا پانی　　ان سے مشکل ہے بوند بھی پانی
ہے توے پر کنوؤں کے یہ تف و تاب　　ہو گیا ہے توے کی بوند سب آب
پوچھ مت کچھ مسافروں کا حال　　اون پہ لایا ہے آفتاب زوال
وے لوئیں گرم گرم آتی ہیں　　چھاتیاں جن سے جھلسی جاتی ہیں
کوئی جاتا ہے گر کسی کے گھر　　مثل مستسقی آب پر ہے نظر
سبزہ ہے کوہ و دشت میں نایاب　　ہاں مگر خضر پھر کرے سیراب
نہیں گرتا ہے اس سے ایک قطرا　　آسماں بن گیا ہے لو ہے کا
ہم کو کب فکر تشنگی کی ہے　　موت ہے سو ٹیٹھری کی ہے
سادہ سبزے سے دشت و صحرا ہے　　سبزہ ہے سو وہ اک جواں سا ہے
آ کے خشکی نے جو کیا ہے اثر　　پپڑیاں بندھ گئی ہیں ہونٹوں پر
بعضے پیاسوں کے کنٹھ خشک ہوئے　　بیچ صحرا کے تشنہ لب وہ موئے

بعضے گرمی کی تونس نے مارے　　بعضے بے آسرے ہو بیٹھ رہے
بعضوں کو بے کلی سے لگ گئی ڈاک　　بعضے ہونے لگے چنک سے ہلاک
خلق بے آبی سے پر از غم ہے　　جیٹھ گویا یہ مہ محرم ہے
ہیں جو اندارا چاہ یاں ان کے　　مارے گرمی کے کھل گئے ہیں چھے
کون کرتا ہے چہ بچوں کا حساب　　حوض و تالاب ہیں سبھی بے آب

مصحفی کیا کروں میں آگے رقم
خشکی دوڑی ہے تا زبان قلم

مثنوی در افراطِ آتش

سوز آتش ہے کس قدر اس سال　　جس سے ہے دل پہ مرد و زن کے ملال
بانس سے بانس جو کھڑکتا ہے　　آگ کا شعلہ اک بھڑکتا ہے
گھر غریبوں کے جلتے آتے ہیں　　ہر طرف لوگ بھاگے جاتے ہیں
یوں پتنگے اڑیں ہیں یکباری　　تو کہے ہے ہوا میں پھلواری
جب کہ چھپر کسی جلتا ہے　　کف افسوس شعلہ ملتا ہے
کوئی اس پر گھڑا بہاتا ہے　　کوئی ہاتھوں ہی سے بجھاتا ہے
گھر غریبوں کے ہو رہے تھے جو پھونس　　دن دیے آگ نے لیے ہیں موس
ہائے کیا حال میں کہوں ان کا　　خانہ باشی شعار ہے جن کا
دم خفا ہو کے پردہ پوش ہوئیں　　چکیاں جل کے سرمہ سنگ ہوئیں
تھی جو گھر میں کسی کے کوئی تلوار　　سو وہ بجلی کی ہو گئی یک بار
جس جگہ ہے پراچے کی دوکاں　　آگ ناگاہ لگ گئی ہے وہاں
گھر کو کرتے ہے اس کے جوں گلزار　　اس کو آتش دکھائے ہے یہ بہار
ہیں جو بیوپاری کرتے پھرتے ہیں آہ　　منڈیاں ہو گئیں ہیں خاک سیاہ
آ گئے آیا ہے ان کے گردہ خویش　　گھاس بھس والے ہیں سبھی دل ریش
تا بہ ہیزم فروش و پنبہ فروش　　سر کو زانو پہ رکھ گئے ہیں خموش
اب اگر جا کے اس پہ کیجے نگاہ　　کوئلے والے کی دوکاں ہے سیاہ

ہے غرض جس فریق کا انساں — اس کی بیداد سے ہے شکوہ کناں
سبھی تیلی تنبولی اور بزاز — کانسہ گر، مے فروش، آتش باز
اس کے ہاتھوں جلے ہوئے ہیں سبھی — نہیں بیداغ اک غریب کا جی
پاکے ان کو بھی سوختہ مغموم — دھوبیوں سے بھی سنیے اس کی دھوم
سہما جاتا ہے ہول سے دریا — ماہی تڑپے ہے آب میں تلپیا
آگ نے لبکہ سر اٹھایا ہے — ایک عالم کا جی جلایا ہے
ایک کے گھر سے جوں ہی شعلہ اٹھا — جا کے گھر دوسرے کے پھول پڑا
گر لیا اس کے تئیں بجھا تو خیر — نہیں تو اور بھی ہوئی ٹک سیر
ایک کے گھر جو لگتی ہے آتش — اور اٹھتا ہے شعلہ سرکش
دوسرا چڑھ کے اپنے چھپر پر — اس کو پانی چھڑک کرے ہے تر
جس طرف دیکھو آگ کی ہے پکار — گھر کے گھر ہو گئے ہیں یاں فی النار
لگی کیا آگ فتنہ اک جاگا — شہدا گھر میں سے گٹھری لے بھاگا
لوگ آ کر کے جو پڑے سب ٹوٹ — مچ گئی گھر میں اک مزے کی لوٹ
کوئی کہتی ہے ہائے لرے میں موئی — کوئی پھرتی ہے بلبلائی ہوئی
کوئی نکلتی ہے منھ کو شوہر کے — کوئی ساتھ اٹھ چلی برادر کے
کوئی ہمسایہ میں چھپی جا کر — گر پڑی ٹھوکر اک کوئی کھا کر
سر سے برقع کسی نے پھینک دیا — اٹھ نقابا کسی نے ہاتھ لیا
رہ گئی کوئی در کے بیچ اڑی — کوئی اٹھی جو گرم گر ہی پڑی
سن کے جوں ہی یہ شور ہمسائے — مل کے آتش بجھانے کو آئے
بعضے رستے کے جانے والے بھی — دیکھ کر رک گئے یہ شعلہ وری
اس بہانے سے واں تلک آئے — حسن و آتش نے جلوے دکھلائے
حسن و آتش کی طرفہ سیر ہوئی — نہ جلا جی کسی کا خیر ہوئی
روئے زیبا پہ مت نظر کر تو — آتش حسن سے حذر کر تو

آگ کہتی ہے جلوہ میرا دیکھ
مصحفی گھر جلا تماشا دیکھ

مثنوی ہجو مکان

اپنے رہنے کو جو ملا ہے مکاں　　ہے بعینہ وہ صورت زنداں
نہ تو روزن نہ اس میں جالی ہے　　دن دیے جیسے رات کالی ہے
اس میں مطلق نہیں ہوا کا گزر　　سیر یلدا کی واں کرے ہے نظر
جائے بول اس کے در کے آگے ہے　　دوزخ اک میرے گھر کے آگے ہے
بوئے ناخوش جو اس سے آتی ہے　　جو ہر مغز کو جلاتی ہے
تس پہ جالوں کی کیا کہوں میں بات　　تو کہے چھت میں جھاڑی ہے دن رات
مکڑیوں نے جو گھر بنائے ہیں　　تو بنیئے کاٹ کر دکھائے ہیں
خاکباری ہے اس کی چھت کا کام　　خاک اس سے جھڑا کرے مدام
چارپائی جو میں اٹھاتا ہوں　　ادھر اودھر اسے بچھاتا ہوں
بے گزر جا ذرا نہیں ملتی　　خاک چھانے صفا نہیں ملتی
دل کو کاوش ہی رات اور دن ہے　　بسکہ پسوؤں کی اس میں بھن بھن ہے
الغرض اس میں مجھ کو ہر صورت　　رہتی ہے موذیات سے صحبت
کبھی چینٹی بدن کو کاٹے ہے　　کبھی دیمک ہی پائے چاٹے ہے
چارپائی جو ہے ہمارے پاس　　کھٹملوں کی رہے ہے اس میں نواس
گھونس نے کر لیے زمیں میں سوراخ　　موشک کور پر ہے عرصہ فراخ
گر نظر جائے جانب دیوار　　نظر آتی ہے چیونٹی کی قطار
گھن نے پایوں کے تئیں جو ہے چاٹا　　خوردہ اس کا چنے کا ہے آٹا
رات دن جی صفا کو ترسے ہے　　اپنی قسمت کی خاک برسے ہے
اس میں جتنے کہ ہیں لکھے اشعار　　سب وہ لکھے گئے بخط غبار
خاک ان پر زبس پڑی پیہم　　سر خاکی ہوئے تمام قلم
گرد جز دانوں پر ہے دو دو تو　　ہے قلمداں اٹا پڑا یک سو
گھر میں میرے جو کوئی آتا ہے　　اپنی صورت کو بھول جاتا ہے
مصحفی جائے سینہ چاکی ہے　　گھر نہیں یہ تو برج خاکی ہے

مثنوی کھٹمل

کھٹملوں کی ز بس کہ ہے افراط　　تلخ ہے ان سے اپنا خواب و نشاط
کافروں نے یہ سر اٹھایا ہے　　سارے پنڈے کو توڑ کھایا ہے
کیا کہوں ان گزندوں کی زشتی　　کہ مجھے کر دیا ہے خارشتی
ہے پھنکی آگ سی بدن میں تمام　　پڑ گئے ہیں دودڑے تن میں تمام
بسکہ بے چین ہوں ہیں ان کے ہات　　نیند آتی نہیں ہے ساری رات
دمبدم کروٹیں بدلتا ہوں　　ایدھر اودھر پڑا اچھلتا ہوں
پائنچے میں کبھی گھس آتے ہیں　　کبھی نیفے میں سرسراتے ہیں
اک خلش ساری رات ازار میں ہے　　آنکھیں بند اور ہاتھ ازار میں ہے
گاہ رو گہ جبیں کھجاتا ہوں　　گاہ سر گہ سریں کھجاتا ہوں
مارتا جاتا ہوں انھیں جوں جوں　　کان پر ان کے رینگتی نہیں جوں
ان کے ملنے سے وقت بدخوابی　　چٹکیاں ہو گئی ہیں عنابی
بلکہ غصہ سے جو دیا ہے فشار　　سرخ ناخن ہیں جوں لب سوفار
ان کی گردن پہ خون میرا ہے　　خوں مری انگلیوں پہ ان کا ہے
اس سے رنگیں کوئی نہ تھا مضموں　　باندھا میں انگلیوں پہ ان کا خوں
گو کہ اب پہنچے سب بدن کو گزند　　ہو گئیں انگلیاں تو فندق بند
لوہو پی پی ز بس ہوئے موٹے　　ریزۂ لعل ہیں بڑے چھوٹے
لیکن اس بت پہ یہ سبھی خناس　　منھ پہ رکھتے ہیں سوزن الماس
ان کے نیشوں سے ہے مری فریاد　　میں ہوں اور کتنے نشتر فصّاد
ہر سر مو پہ میرے ایذا ہے　　یعنی ان موذیوں کا بلوا ہے
گرچہ اک قطرہ مجھ میں خون نہیں　　لیک یہ خالی از جنون نہیں
تلے کروٹ کے آ جو جاتے ہیں　　وو ہیں جھلا کے کاٹ کھاتے ہیں
کچھ مرا ان سے بس نہیں چلتا　　میں تو رہتا ہوں ہاتھ ہی ملتا
کاٹتا ہے جو کوئی آ کے کہیں　　بیٹھے بیٹھے اچھل پڑوں ہوں وہیں

بسکہ ہے ان دنوں اکھٹوں کا وفور   لیٹنے کا تو کیجیے کیا مذکور
ان کے ہاتھوں سے ہے مجھے اے یار   بیٹھنا چارپائی پر دشوار
پایوں میں جو نواس ان کا ہے   اس کا ہر پایہ بھڑ کا چھتا ہے
الغرض شام سے ہو شب بیدار   کھیلتا ہوں میں کھٹملوں کے شکار
مارے جو موٹے موٹے چن چن کر   چھینٹ کی تھان بن گئی چادر
گھسے دیوار پر جو کرکے تلاش   کر دیا گھر کو خانۂ نقاش
نہ زمیں ہی میں خاک مال ہوئے   گھر کے کونے تمام لال ہوئے
نہیں مرتے ہیں تو بھی یہ بدذات   کیا اکھٹوں نے پیا ہے آب حیات
کوئی کیونکر کرے اکھٹوں کا شمار   پیدا ہوتے ہیں ایک سے یہ ہزار
ہے بجا بسکہ ہیں زمیں میں پرباد   کہیئے راون کی ان کو گر اولاد
فائدہ ان سے کچھ نہیں زنہار   غیر اس کے کہ ہوں میں شب بیدار
یہ سمجھ کر کہ لوگ جاگے ہیں   چور بھی ان کے ڈر سے بھاگے ہیں
اس طرح بسترے پہ ہوویں رواں   جس کو پاوے نہ اسپ کا جولاں
دوڑتے ہیں زبسکہ ہیں چالاک   میری آنکھوں میں ڈال جاتے ہیں خاک
آ چڑھیں ہیں جو میرے ہاتھ کہیں   راہ لیتے ہیں آستیں کی وہ ہیں
کوئی آسان ہاتھ آتے ہیں   گھاٹیوں میں سے نکلے جاتے ہیں
ہے زباں ان کی جوں سناں سر تیز   یاد ہے تب تو ان کو جنگ گریز
ان کی بو سے دماغ عاجز ہے   بلکہ دودِ چراغ عاجز ہے
بوریے پر جو بیٹھے کوئی دم   واں بھی ان کا لگا رہے ہے غم
بے خبر وہیں کاٹ کھاتے ہیں   کب یہ بدبخت ہاتھ اٹھاتے ہیں
میں بھی ازبسکہ ان کا ہوں استاد   قتل کا ان کے گُر ہے مجھ کو یاد[1]
چارپائی کو جب بچھاتا ہوں   چادر اک اس پہ کھینچ جاتا ہوں
بعد ازاں رکھ سرہانے اک تکیہ   سر کو رکھ اس پہ سو رہوں ہوں ذرا
اتنے میں سونگھ کر یہ بوے بدن   جوں ہی با صد ہزار حیلہ و فن
فرش چادر پہ ہو کے پُر بے غم   چلنے لگتے ہیں ایک در پئے ہم

[1] تصحیح قیاسی

میں بھی جلدی دیا منگا کے وو ہیں
بھُس بناتا ہوں خوب ان کے تئیں

گرچہ پاتے رہے ہیں نت مالش
پر مری ان سے ہے وہی نالش

وہی راتوں کو جاگنا ہے ہنوز
اور وہی خواب صبحدم ہر روز

ان کی ایذا سے میں ہی کچھ نہیں دنگ
عرصہ کرم کتاب پر بھی ہے تنگ

یعنی مجھ پاس ہیں جو کچھ اجزا
دخل ان میں بھی کافروں نے کیا

ان میں جا کر ہوئے تو ہیں یہ بند
لفظ و معنی کے تئیں نہ پہنچے گزند

اور قلمداں میں جو گھسے جا کر
کیا یہ دیں گے مرے قلم کو ضرر

سو تو اس کی زباں ہے ایسی تیز
جس سے کرنے لگیں بریز بریز

خاصہ ہنگام ہجو کہنے کے
الاماں مانگتے ہیں سب جس سے

دشمن جاں یہ مصحفی کے ہیں
تشنۂ خوں یہ ہر کسی کے ہیں

بیش و کم چلتی ہو زباں جن کی
چاہیئے ہجو ہی کریں ان کی

مثنوی سرما

اب کے سردی کا جو ہوا ہے وفور
ڈھانپ کر منہ کو رہ گئے ہیں تنور

دیگداں گھر میں سب کے ہیں بیکار
یعنی آتش کا سرد ہے بازار

آٹے ہے ہو کے زمہریر ہوا
ہے جہنم زمانہ سردی کا

بن رہے ہیں جو یخ ظروف تمام
برف خانہ ہے خانۂ حمام

عوض آتش کے ان دنوں اے یار
خاک کھاتا ہے مرغ آتش خوار

ہے دو شالوں کی یہ خریداری
نہیں آتی غریب کی باری

پشم پوشی پہ بس کہ مرتے ہیں
بعضے کمبل خرید کرتے ہیں

ہے گراں بس کہ شال کا رومال
اس کو لگتی نہیں ہے قیمت شال

پشم پوشی سے اپنی کر کے زیب
سگ پشمی بنا پھرے ہے رقیب

دی ہے سرمانے کیا مجھی کو شکست
تا بہ حربا ہے آفتاب پرست

جن کے تن پر نہیں ہے اک لتّا
کیا کہوں ہائے حال میں ان کا

آتش افروزی سے ہے سب سروکار　　قرص خورشید پر ہے دن کو مدار
تھے جو بعضے خورندہ پانی کے　　اب وہ پانی ذرا نہیں پیتے
آگ کے بس کہ کھل گئے ہیں چھتے　　ہنستے ہیں اس کو دیکھ دیکھ توے
حال کیا ہووے گا غریبوں کا　　ہے روئی پر تو زور ہی لرزا
آپ کو لبکہ سرد پاتی ہے　　خود وہ پردے میں منھ چھپاتی ہے
طرفہ سردی ہے ان دنوں یارب　　جس کے ڈر سے گلیم پوش ہیں سب
سنگ و آہن جواب بہم ہوں دوچار　　برف ان سے جھڑے بجائے شرار
ہاتھ میں لیجیے گر انگارا　　ہووے محسوس جیسے یخ پارا
دیکھیو شدّت شب سرما　　بن بجھائے چراغ ہے ٹھنڈا
جس طرف دیکھو آگ کی ہے پکار　　آگ کیا اک خدا کا ہے دیدار
مفلسوں کے بغل میں رہتے ہیں ہاتھ　　ہیں نمد پوش آئینے دن رات
سرد دیکھی دوکاں کبابی کی　　اب کی جاڑے نے کیا خرابی کی
ہے نمکداں میں برف جائے نمک　　خاک کھاوینگے بادہ نوش گزک
مہر سے پھر گئے بتان جہاں　　ڈھونڈیے کوئی گرم تو ہے وہ کہاں
کر گئی ہے سفر حرارت تن　　واں برودت کا اب ہوا ہے وطن
گرمی ہوتی نہیں ذرا اظہار　　جیسے پانی میں نبض کی رفتار

مصحفی اس ہوا میں کیا امکان
ہووے گرم سخن کسی کی زباں

آگے اب کیا لکھوں میں سردی سے　　کیونکہ میرا بھی ہاتھ کانپے ہے

رُباعیات

(۱)

سودا کا تو سرد ہو چکا ہے بازار　　اب بزم سخن ہے میرے دم سے گلزار
ہے شان تری جلوہ گری میں ہر وقت　　سچ ہے کہ تجلی کو نہیں ہے تکرار

۲

باہم جو فلک کا ہے بندھا زنجیرا   معلوم نہیں کہ اس میں ہے حکمت کیا
ہر چند کیے ہم نے بہت عقدے وا   لیکن نہ کھلا ہم سے یہ گورکھ دھندا

۳

کچھ دیں کی طرف ہوں کچھ ہوں دنیا کی طرف   دل جائے ہے اپنا سو تمنا کی طرف
یہ پست تو خاکدان ہستی میں رہا   آئے آہ تو جا عالم بالا کی طرف

۴

سب خاک میں مل گئی جوانی کی بہار   بیٹھا سر و رو پہ آکے پیری کا غبار
پچیس برس تو خواب غفلت میں گئے   اے مصحفی اب تو ٹک کہیں ہو بیدار

۵

اس کلبۂ احزاں میں وطن تو نے کیا   اس تودۂ خاک کو چمن تو نے کیا
القصہ کہ مصحفی کو اپنے یارب   دستاں زن گلزار سخن تو نے کیا

۶

جاتے ہوئے پاؤں سا پھسل جاتا ہے   دل سینے میں جیسے کوئی مل جاتا ہے
گر صورت خوش کہیں نظر آتی ہے   واللہ کہ میرا جی نکل جاتا ہے

۷

نادان گئے جہان سے دانا بھی   پیدا جو ہوئے ہوئے وہ ناپیدا بھی
ہے ہستی دنیا تو ہمارے دم سے   ہم جب نہ ہوئے تو گو نہ ہو دنیا بھی

۸

ہوتی ہے جو دل میں چاہ چھپتی کب ہے   میلان طبیعت آہ چھپتی کب ہے
گو خواہش دل نہ منہ پہ لاوے عاشق   خواہش کی ولے نگاہ چھپتی کب ہے

۹

ظالم مرے جی کا درد تو کیا جانے   سچ بے مزگی کا درد تو کیا جانے
ہے تجھ کو تو رات دن ستانے سے کام   بے درد کسی کا درد تو کیا جانے

۱۰

دل آتش عشق میں جو رہتا تھا سپند
ہوتا تھا دھوئیں سے آہ کے شعلہ بلند
سو سرد ہیں سب وے گرمیاں اب ہم کو
اک خوشی ہے دیکھنے کی سو بھی تا چند

۱۱

جوں آبلہ پھوٹ پھوٹ کب تک بہیے
ہے مصلحت آپ بھی کہ چپ ہی رہیے
نے یار و آشنا نہ مشفق نہ رفیق
کہیے تو یہ درد اپنا کس سے کہیے

۱۲

چاہت نے تری یاں سے نکالا مجھ کو
کس چاہ سے ہائے تونے پالا مجھ کو
اے آفت جان مصحفی تونے تو
اتنا چاہا کہ مار ڈالا مجھ کو

۱۳

کیا جلدی سے ہو گئی جدائی کم بخت
افسوس اجل بھی تو نہ آئی کم بخت
کیا تونے کیا فلک کہ بن وصل ہوئے
صورت مجھے ہجراں کی دکھائی کم بخت

۱۴

گا ہے بہ کدر گہ بصفا رہتے ہیں
گہ سب میں گہے سب سے جدا رہتے ہیں
ہم لوگ کچھ اختیار اپنے میں نہیں
جس طرح سے رکھتا ہے خدا رہتے ہیں

۱۵

ہر چند کہ اوروں میں ترا ساکا ہے
پر میں نے تو کچھ اور تجھے تاکا ہے
دریا سے لباسِ آبگوں میں یعنی
گھڑیال تری توند تو تو تاکا ہے

۱۶

ہے ہم کو تو کافر کا فقط اک سودا
ہو ہم سے نہ کار دیں نہ کار دنیا
ہوتی ہے جنھیں کہ مصحفی عقل معاش
پتھر سے بھی کرتے ہیں وہ روٹی پیدا

۱۷

ہم نے نہ جلیے بند سلاسل دیکھا
نے قافلہ کوئی راہی منزل دیکھا
صورت میں بگولے کی تو صدقے ہوتا
اک مشت غبار گرد محمل دیکھا

۱۸

چھپ جاتے ہو لحظہ منھ دکھلا کر
کیا مار ہی ڈالوگے ہمیں ترسا کر

آنا ہے تمھیں تو آ ملو جیتے جی　　مر جاویں گے ہم تو کیا کروگے آکر

۱۹

یارب نہ گرفتار بلا رکھ مجھ کو　　دن رات نہ اتنا بھی خفا رکھ مجھ کو

آمیزش نیک و بد مرے حق میں ہے سم　　رکھ سب میں ولے سب سے جدا رکھ مجھ کو

۲۰

زاہد تو ہے طاعت سے خریدار بہشت　　پائے جاتے ہیں اس میں آثار بہشت

لیکن یہ گنہگار جو ہے اے یارو　　نہ قابل دوزخ نہ سزاوار بہشت

۲۱

بس جزوی و کلی سے وہی ماہر ہے　　نیک و بد بندہ اس پہ سب ظاہر ہے

شان اس کی گہے رحیم و گہ قاہر ہے　　اللہ جو چاہے سو کرے قادر ہے

۲۲

ہے حور و قصور در نظر اک کہیں　　اور ایک ہے داغ غم سے جلنے کے قریں

عرصہ ہے قیامت کا یہ میدان زمیں　　سچ پوچھو اگر بہشت و دوزخ ہی نہیں

۲۳

کیا ہم سے ہوا نشاء سابق میں عمل　　ہے جس کے سبب سے اب حواسوں میں خلل

یارب کہ نہ پھر روی تناسخ دیکھے　　اس مرتبہ جان تن سے گر جاوے نکل

۲۴

ہے خیر بدیہہ روزگار اس کے ہیں　　کیا دخل کسی کو کاروبار اس کے ہیں

جوں صورت شب یار جو تو غور کرے　　سررشتہ کل ہے اختیار اس کے ہیں

۲۵

ہیں وے جو نظرباز حقیقت آئیں　　رکھ پیش نظر آئینہ چرخ و زمیں

دیکھیں ہیں اسے جس کی کہ یہ صنعت ہے　　ہر چند بصیرت کو وہاں دخل نہیں

۲۶

ہرگز نہ کھلا ہم پہ معمائے فلک　　چھٹ اس کے کہ ہے تو کارفرمائے فلک

پیسے ہے ہمیں وہ آسیا کے مانند　　ہم پستے نہیں ہنوز اے وائے فلک

۲۷

بعضوں نے کہا ہستی عالم ہے قدیم
بعضوں نے کیا ہے اس کو حادث تفہیم
اک بات ٹھہرتی ہی نہیں خاطر خواہ
کیا کیجیے کہ عاجز ہے یہاں فکر حکیم

۲۸

ہستی جسے کہتے ہیں سو ہے وہ اک دم
اور سمجھے جو تو اول و آخر ہے عدم
اس دم کو تو رائگاں نہ کھو دیوانے
گر یہ بھی نہ ہوگا تو کہاں کا عالم

۲۹

ہستی تری گر غور کرے دو دم ہے
ہے جس پہ بنائے زندگی سو دم ہے
آ فکر نہ کر ماضی و مستقبل کا
بس اس کو غنیمت ہی سمجھ جو دم ہے

۳۰

بعضوں نے تو لی مذہب و ملّت کی راہ
اور بعضے گئے سفر میں ذلّت کی راہ
ان سب سے یہ مصحفی نے ہو کر کے جدا
کی اپنے لئے پسند قلت کی راہ

۳۱

تو ہستیٔ واجب کے تئیں یوں پہچان
یعنی کہ وجود اپنا وجود اس کا جان
جب تجھ پہ یہ اثبات ہوا سب حق ہے
پھر آوے نظر میں غیر حق کیا امکان

۳۲

کیا تیرے سوا یہاں بنا ہے کوئی اور
پیدا ہے جو تو تو کیا خدا ہے کوئی اور
یا رب تجھے اپنی ہی قسم سچ کہہ دے
اس پردے میں تو ہے یا چھپا ہے کوئی اور

۳۳

کیا تجھ سے کہوں حال شہود عالم
کچھ ایک سی ہے بود و نبود عالم
بس تو بھی جو پھر یے تو ہوا اے ناداں
خود عین وجود حق وجود عالم

۳۴

عینیتِ ذات جس کو حاصل ہووے
عین دریا ہے گو کہ ساحل ہووے
کیا دخل ہے عکس رونما ہووے اگر
آئینے کے آئینہ مقابل ہووے

۳۵

ہم دونوں جہاں میں آشنا تجھ سے ہیں
جس جا پہ ہیں جان لیک جا تجھ سے ہیں
ہے بحر و حیات کی سی نسبت باہم
تو ہم سے جدا نہ ہم جدا تجھ سے ہیں

۳۶

تھا پیشتر آدم سے تو عالم کا ظہور
بعد اس کے ہوا جہاں میں آدم کا ظہور
گر دیدۂ تحقیق سے دیکھے کوئی
سارا یہ بن گیا ہے ایک دم کا ظہور

۳۷

کیا ہم سے گریزاں ہیں بتاں گلفام
گویا کہ بچھا رکھا ہے یاں ہم نے دام
گر ان کو یہ وحشت ہے تو پھر ہم کو بھی
رعنائی و دلبری سے ان کی کیا کام

۳۸

شب ماہ کے داغوں پہ گئی میری نظر
مجھ کو نظر آیا وہیں اک لطف دگر
اعجاز سے حسن کے ہوا عیب ہنر
یعنی کہ یہ تازہ ہے تو وہ پٹڑا ہے قمر

۳۹

ہر چند کہ ہم فاقوں سے جاں دیتے ہیں
تنخواہ تو کب نعیم خاں دیتے ہیں
ہے لب پہ خوشامد اور غضب کے مارے
بیٹھے ہوئے جی میں گالیاں دیتے ہیں

۴۰

ظاہر میں تو ہاں نعیم کے نوکر ہیں
باطن میں وے کریم کے نوکر ہیں
نہ عید نہ بکرید نہ روزی نہ دہاڑ
ہم بھی عجب اک لئیم کے نوکر ہیں

۴۱

دی بانٹ محل میں چپکے چپکے تنخواہ
اور ہم کو بہانوں ہی میں ٹالا کئی ماہ
انصاف سے کتنا دور ہے میر نعیم
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

۴۲

جیتا ہوں کبھی تو پھر کبھی مرتا ہوں
ہنستا ہوں کبھی کبھی فغاں کرتا ہوں
دن رات جدائی کا جو دکھ بھرتا ہوں
کچھ خلق سے کچھ خدا سے میں ڈرتا ہوں

۴۳

وہ دن جو کشیدہ وہ مجھے پاتا ہے
یوں پیار سے حق میں مرے فرماتا ہے

آجائے ہے مصحفی کے کیا جی میں بھلا — کم بخت جو آتے آتے رک جاتے ہیں

۴۴

یک دن نہ عیادت کو مری تو آیا — نے اپنی طرف سے ہی کوئی بھجوایا
کیا چاہیے ہے اے صنم جدائی نے تری — نزدیک بھر دن تو مجھے پہنچایا

۴۵

قمری سے نہ سرو کا ٹھکانا چھوٹے — بلبل سے نہ گل کا آشیانا چھوٹے
گو مجھ کو کرے کوئی نصیحت مجھ سے — ممکن نہیں اس گلی کا جانا چھوٹے

۴۶

یا تو کسی شخص کو جنوں ہووے گا — یا چاہ الم میں کوئی نگوں ہووے گا
ہوتا ہے تری وضع سے معلوم ہمیں — اک آدھ غریب کا بھی خوں ہووے گا

۴۷

ہر سفلہ نہ فن شعر کا ماہر ہے — ہر ذرہ نہ آفتاب سے باہر ہے
شاعر ہیں بہت سے یوں تو کہنے کو ولے — جو شعر کی روٹی کھائے وہ شاعر ہے

۴۸

صد شکر کیا آپ نے غسل صحت — دھوئی گئی دل سے سب کے گرد کلفت
ہو غسل مبارک تمھیں مرزا مینڈھو — جب تک ہے جہاں میں رسم رنج و راحت

۴۹

کی مجھ سے بقصد بے وفائی تو نے — مٹی میں ملا دی آشنائی تو نے
افسوس اس کا تجھے بھی ہوگا سچ ہے — کی تھی کوئی روز کیا خدائی تو نے

۵۰

ہے روز وداع آنسوؤں کا طوفاں — آیا ہوں بچشم تیرے اوپر گریاں
جاتا ہوں سفر کو میں تجھے یاد رہے — دل سے نہ بھلانا تو مجھے میری جاں

اشاریہ

دیوان دوم

(الف) غزلیات

دیگر اصناف

(ب) مسدسات

(ج) مثنویات

(د) رباعیات

زیرِ طبع

جلد اوّل — ذکرِ مصحفی (حالات و تنقیدِ کلام)، دیوانِ اوّل

جلد دوم — دیوانِ دوم

جلد سوم — دیوانِ سوم و چہارم

جلد چہارم — دیوانِ پنجم

جلد پنجم — دیوانِ ششم

جلد ششم — دیوانِ ہفتم، ہشتم

جلد ہفتم — دیوانِ قصائد

جلد ہشتم — فرہنگِ مصحفی (نیز حواشی، اختلافات، اشاریہ)

کلیاتِ میر

(۱)

مکمل

چھ دواوینِ غزلیات

اشاعت ۱۹۶۷ء

غزلیں ۱۸۱۸ اشعار ۱۳۵۸۵

نوٹ: ہر دیوان الگ بھی مل سکتا ہے

خصوصیات

۱۔ کلیات میر کا یہ ایڈیشن میر کے کلام کی اولین اشاعت مطبوعہ کلکتہ فورٹ ولیم کالج اور دیگر نسخوں کے مقابلہ کے بعد تیار کیا گیا ہے

۲۔ ہر غزل کا نمبر اور اشعار کے نمبر بھی حاشیہ پر درج ہیں۔

۳۔ ہر چھ دواوین کی غزلیات کی فہرست ردیف وار درج ہے۔

۴۔ میر کے مختصر مگر مستند حالات زندگی بھی اس میں موجود ہیں۔

۵۔ مختلف تذکرہ نگاروں نے میر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ یکجا کر دیا گیا ہے۔

۶۔ میر کے مطالعہ کی اہمیت واضح کی گئی ہے اور

۷۔ کتابت و طباعت صاف ستھری ہے۔

کلیات میر (۲) میں بقیہ مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام، اختلاف نسخ، فرہنگ، اشاریہ اور میر کے کلام پر تبصرہ و محاکمہ اور میر کے آرٹ پر ایک مفصل مضمون شائع ہوگا۔

کلیاتِ میر

مرتب

ظل عباس عباسی

قیمت بیس روپے

Kulliyat-i-Mus'hafi

Vol. II

Diwan II

GHULAM HAMDANI MUS'HAFI
[d. 1240 A.H./1825 A. D.]

Edited by :

NISAR AHMED FARUQI
Lecturer in Arabic, Delhi College, Delhi-6

1968

ILMI MAJLIS
1429, Chhatta Nawab Saheb,
Farrash Khana, DELHI-6.